سلسلۂ سلطانیہ

ھو الاوّل

تاریخ ابو البشر

یعنی

کیفیّتِ آغازِ نوعِ انسان حسب تحقیقاتِ جدید

ترجمۂ

تاریخِ عالم حصّہ اوّل

مصنّفہ پروفیسر رڈپاتھ آف امریکہ

از

مُفتی محمّد انوارُ الحق ایم۔ اے منشی فاضل

انڈر چیف سکرٹری و سکرٹری صیغۂ تعلیم

دارُ الاقبال بھوپال

سنہ ۱۹۱۰ء

اوّل تعداد جلد ... ۱۰۰۰ قیمت فی جلد مجلد عہ غیر مجلد ۸؍ عنصر

135841

Marfat.com

نذر

ذخیرہ محمد عابد مجددی

اس مختصر سی کتاب کو

اپنی ولیہ نعمت

عُلیا حضرت والا شوکت بلقیس مرتبت برجیس منزلت سلیمان جاہ
سکندر پایگاہ جناب نوّاب سُلطان جہان بیگم صاحبہ
جی سی ایس آئی جی سی آئی ای فرمانروائے دار الاقبال بھوپال
خلّد اللہ مُلکہا الے یوم المآل کے نامِ نامی و اسمِ سامی سے
معنون کرنے میں میرے لئے اس کے سوا کوئی عُذر نہیں ہے کہ اگرچہ

شایاں نہ بُود قطرہ بعمّاں بُردن
خار و خسِ صحرا بگُلستاں بُردن
امّا چہ تواں کرد کہ رسم است ز مور
پائے ملخے بپیشِ سلیماں بُردن

خاکسار مترجم

Marfat.com

Marfat.com

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوان باب	نمبر صفحہ
۱	دیباچہ کتاب	۱ لغایت ۱۹
۲	باب اول - بدو نوع انسان کی بابت چند سوالات ..	۱ لغایت ۱۸
۳	〃 دوم - نوع انسان کی عمر کی بابت علم ہیئت کی تحقیق	۱۸ لغایت ۴۳
۴	〃 سوم - نوع انسان کی عمر کی بابت علم طبقات الارض کی رائے	۴۴ لغایت ۵۹
۵	〃 چہارم - نوع انسان کی عمر کی بابت علم آثار قدیمہ کی رائے	۶۰ لغایت ۷۵
۶	〃 پنجم 〃 〃 علم انتھروپالوجی کی رائے	۷۵ لغایت ۸۹
۷	〃 ششم 〃 〃 تاریخ و قصص کی رائے	۹۰ لغایت ۱۰۰
۸	〃 ہفتم 〃 〃 علم السنین کی رائے	۱۰۱ لغایت ۱۰۹
۹	〃 ہشتم - جنت کی تلاش	۱۰۹ لغایت ۱۱۶
۱۰	〃 نہم - اصلی وطن	۱۱۶ لغایت ۱۴۲
۱۱	〃 یازدہم - نئے مسئلے کی ابتدا .. - - - .. -	۱۴۲ لغایت ۱۵۴
۱۲	〃 دوازدہم - مسئلۂ ارتقا .. - .. - ..	۱۵۴ لغایت ۱۶۹
۱۳	〃 سیزدہم - مسئلۂ ارتقا کی چند مثالیں	۱۶۹ لغایت ۱۸۳
۱۴	〃 چہاردہم 〃 〃 پر چند اعتراض اور اُس کے جواب	۱۸۴ لغایت ۱۹۳
۱۵	ضمیمہ کتاب ہذا	۱۹۴ لغایت ۲۰۱

Marfat.com

Marfat.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

اے نامِ دلکشائے تو عنوانِ کارہا — خاکِ درِ تو آبِ رخِ اعتبارہا
از بہرِ خواندنِ رقمِ قدرتت بہار — اوراقِ گل شمردہ بانگشتِ خارہا

حمد و نعت کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصر طور پر اس کتاب کی ہئیت۔ اور اس کے ترجمے کی کیفیت بیان کر دی جائے۔ تاکہ وہ مضمون کتاب کی بھول بھلیاں میں اصحاب نظر کی کسی قدر رہنمائی کر سکے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ مترجم کو کسی طرح کی زیادہ قابلیت یا بہتر واقفیت کا دعوے ہے نہیں ہرگز نہیں۔ غرض صرف یہ ہے کہ یہ ایک اچھوتا مضمون ہے۔ اور مترجم کے علم و یقین میں ابھی تک اردو زبان میں اس قسم کی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اور اہل وطن کا مذاق اس طرح کی تحقیق سے نا آشنا ہے۔ اس لئے موجودہ رسم و رواج کے لحاظ سے غالباً اس کو تھوڑے سے انٹروڈکشن کی ضرورت ہے۔ اور مترجم کو تھوڑی سی معذرت کی۔

گزشتہ سال انہی دنوں میں جب کہ میں مشن کالج راولپنڈی میں پروفیسر تھا۔ یہ کتاب یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ (Universal History of the World) مصنفہ پروفیسر رڈپاتھ (Professor Ridpath) میری نظر سے گذری۔ یہ کتاب امریکہ میں لکھی گئی ہے۔ اور [illegible] ضخیم جلدوں میں چھپی ہے۔ اور چونکہ صرف ایک شخص کی دماغی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس لئے یقینی قابل قدر ہے۔ یوں تو انگریزی

Marfat.com

میں متعدد تواریخ عالم موجود ہیں۔ جس میں ایک سے ایک بہتر و برتر ہے۔ مگر اس کتاب میں جو بات مجھے سب سے زیادہ عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ اس میں اہل مصر کا حال جو نوع انسان میں سب سے پہلے متمدن اور مہذب لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ نویں جلد میں شروع کیا گیا ہے۔ اور اس سے پہلے کی آٹھ جلدیں (گویا تقریباً نصف حصّۂ کتاب) اب سے کم و بیش ۵-۶ ہزار سال پہلے کی نا مہذّب۔ خانہ بدوش۔ وحشی اور نیم وحشی اقوام انسانی کے حالات سے پُر ہیں۔ یہ حالات اپنی جدّت اور ہماری موجودہ طرز معاشرت سے بالکل مختلف ہونے کی وجہ سے نہایت ہی دلچسپ ہیں۔ کیونکہ ایک طرف تو یہ اپنے تعجب خیز و حیرت انگیز ہونے کے سبب سے الف لیلہ کے افسانے معلوم ہوتے ہیں۔ اور دوسری طرف چونکہ وہ مشاہدات عینی اور واقعات یقینی پر مبنی ہیں۔ اس لئے ان کی صحت دیگر سوانح کی تاریخ سے کسی طرح کم نہیں سمجھی جاسکتی۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ایک زمانے میں ہمارے آبا و اجداد بھی انہی وحشیوں کے بھائی بند تھے۔ اور آج کل کی تمام قومیں انہیں جنگلیوں کی اولاد ہیں تو ان کے حالات معلوم کرنے کا شوق اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ پھر ان حالات کو عام علم تاریخ پر یہ ایک اور بھی فضیلت ہے۔ کہ مہذّب زمانے کی تاریخ کے اکثر حصے اقوام کی باہمی کشاکشی اور جنگ جوئی۔ یا افراد کی خود غرضی اور نفس پرستی کے افسانے ہیں۔ اور وہ بھی ایسے کہ ان کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جس پر بے گناہوں کے خون ناحق کے چھینٹے نہ پڑے ہوں۔ اور جو ظالموں کی سیاہ کاریوں کے بیان سے سیاہ نہ ہوئے ہوں۔ اس کے برخلاف پرانی نا مہذّب قوموں کے حالات اُن کوششوں اور جانفشانیوں کے قصّے ہیں جو انسان نے شروع شروع میں ترقّی کے اعلےٰ مدارج حاصل کرنے کے لئے کئے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اُس وقت باہمی لڑائی جھگڑے نہ تھے۔ مگر اتنا ضرور ہے کہ اس وقت نہ تو زر و جواہر اور مال و دولت کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ اس پر جانیں قربان ہوتیں اور سروں کی بھینٹیں چڑھائی جاتیں۔ اور نہ اپنے بھائی بندوں کے خون بہانے کے لئے وہ نئے

Marfat.com

اور خونریز آلات ایجاد ہوئے تھے جو ترقی کے زمانے میں روز نئے نئے رنگوں میں چمکتے ہیں۔ رہنے کے لئے خدا کی زمین وسیع تھی اور کھانے پہننے کے لئے درختوں کے پھل پتے اور جانوروں کے گوشت اور اُن کے چمڑے کافی تھے اس کے سوا ان لوگوں کی تحقیق بھی قابلِ قدر ہے۔ جنہوں نے اُس زمانے کے حالات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس زمانے میں لوگوں کو اپنے حالات قلمبند کرنے کا تو کیا اپنے جسم کو ڈھانکنے اور اپنے مردوں کو دفن کرنے کا بھی ہوش نہ تھا۔ اہل بصر خود دیکھ سکتے ہیں کہ ان حالات کو عالمانہ طور پر تحقیق کرنا کتنا مشکل ہے۔ اور پھر ان کو قیاس صحیح اور عقل سلیم کے بالکل مطابق ثابت کرنا کس قدر دشوار ہے۔ آج کل کی سائنس کی عملی ترقیاں اور نت نئی ایجادیں تو زمانے بھر کو دنگ کئے ہوئے ہیں ہی مگر میدان خیال میں بھی اس کی جولانیاں کچھ کم تعجب خیز نہیں۔

انہی وجوہ سے مجھے اس کتاب کے مطالعے کا شوق ہوا۔ اور اس کا کچھ حصہ دیکھنے کے بعد مجھے وہ کتاب اس قدر انوکھی اور ایسی دلچسپ معلوم ہوئی کہ بے اختیار میرا جی چاہا کہ اسے اپنے اُن دوستوں کو بھی سناؤں جو انگریزی زبان سے ناواقف اور موجودہ علمی تحقیقات سے ناآشنا ہیں۔ اگرچہ اس عزم کے پورا کرنے میں بہت سی مشکلیں تھیں مثلاً کتاب کی ضخامت میری عدیم الفرصتی اور اہل وطن کی بے توجہی۔ اس پر مضمون کی کہیں کہیں عقائد مذہبی سے مخالفت مستزاد۔ اور ان سب دقتوں پر طرہ یہ کہ خود زبان اردو ابھی تک ایسے مضمون کو ادا کرنے میں قاصر ہے۔ اور مختلف علوم کے اصطلاحی الفاظ کو عام فہم اردو میں لانا دشوار ہے۔ یہ سب عوائق بہت کچھ دل شکن تھے۔ مگر طبیعت نے کہا کہ "بیا بگذر کہ از بہر گزشتنہاست حائلہا" شوق نے ان رکاوٹوں ہی کو محرک بنالیا اور اردو میں نئی معلومات کی کتابوں کی کمیابی اور اہل ملک کی جدید تحقیقات کے نتائج سے ناآشنائی نے مجھ جیسے کم لیاقت اور بے بضاعت کو بھی اپنی زبان کی توسیع میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ اور میں نے ابنائے وطن کی ضیافت طبع کے لئے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں اس کتاب کے پہلے حصے کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ زبان دانی کا دعوے نہیں ہاں۔ زبان دانوں کو غیرت دلانا مدنظر ہے۔

کتاب کا پہلا حصہ جس کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ ان وحشیوں کے حالات پر بحث نہیں کرتا۔ جن کا میں نے اوپر ذکر کیا بلکہ اس میں صرف ایک امر کی تحقیق کی گئی

Marfat.com

ہے۔ اور وہ یہ کہ "نوع انسان کا آغاز کب ہوا؟ کہاں ہوا؟ اور کیونکر ہوا؟" اور یہ تحقیق صرف جدید مشاہدات عینی اور واقعات یقینی کی بنا پر کی گئی ہے۔ اور ان سے قیاس صحیح کے مطابق نتائج نکال کر ان سوالات کا جواب دینا چاہا ہے۔ اور اس کوشش میں متعدد علوم جدیدہ کی تحقیقات سے مدد لی گئی ہے۔ چنانچہ صرف آغاز انسان کے زمانے کی تعین میں ۹ متفرق علموں کے ذریعے سے نتیجے اخذ کئے ہیں اور یہ سب علم ایسے ہیں کہ ابھی تک یہاں کے انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب بھی خال خال ہی ان سے واقف ہونگے۔ مجھے ان جوابات کے صحیح یا غلط ہونے سے بحث نہیں۔ میرا مطلب ان کو اہل ملک کے سامنے پیش کرنے سے صرف یہ ہے کہ یہاں والے بھی ان مختلف علوم کے موضوع اور مبحوث فیہ مضامین سے کسی قدر آگاہ ہوجائیں۔ اور جس طرح عملی ترقیوں میں نئی نئی ایجادوں کا نام سنا کرتے ہیں اسی طرح علمی تحقیقات اور فلسفیانہ معلومات میں بھی ان کے کان ان انوکھی اور ان سنی باتوں سے نا آشنا نہ رہیں۔ اور ان کو کم سے کم اتنا تو معلوم ہوجائے کہ دوسری قومیں کیا کچھ کر رہی ہیں۔

یہاں ممکن ہے کہ بعض اصحاب یہ اعتراض کریں کہ وہ ترقی کس کام کی جو حق سے گمراہ کرنے والی ہو۔ اور اس علم سے کیا فائدہ جو ایمان کو مٹانے والا ہو۔ اس میں کلام نہیں کہ یہ اعتراض بالکل درست ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا کوئی علم واقعی گمراہ کن ہے بھی یا نہیں۔ میرے خیال میں صحیح علم خواہ وہ کسی قسم کا بھی کیوں نہ ہو۔ گمراہی اور ضلالت سے بچانے والا ہوتا ہے۔ نہ کہ خود راستہ سے بھٹکانے والا۔ کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی چیز کی اصلی حقیقت سے واقفیت کیونکر ہم کو راہ حق سے بہکا سکتی ہے۔ یا کسی امر کی ماہیت کا سچا علم کس طرح ہم کو اصول حقیقی سے برگشتہ کر سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غلطیوں اور برائیوں کو بھی جان لینا ضروری ہے۔ تاکہ ہم اُن کی کنہ کو سمجھ کر ان سے زیادہ اچھی طرح بچ سکیں۔ اس بات کا مجھے اطمینان ہے کہ اہل ملک کے مذاق اور مضمون کی دشواری اس کتاب کو عوام الناس میں مقبول نہ ہونے دیگی۔ بقول غالب ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے ✤ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

Marfat.com

اور اسی جماعت پر مسائل مذہبی کی چھان بین سے زیادہ اثر پڑتا ہے۔ انگریزی داں اصحاب پہلے ہی سے اس درجے پر پہنچ چکے ہیں۔ کہ ان پر ایسی ایسی خفیف باتیں کوئی نمایاں اثر نہیں رکھتیں۔ دوسرے وہ اپنی علمی قابلیت کے لحاظ سے بھی ترجموں کے محتاج نہیں۔ ان کے خیالات پر اثر ڈالنے کے لئے خود اصل کتابیں ہی کیا کم ہیں +

اس مضمون کے ترجمے سے میرا مطلب یہی ہے کہ جہاں کہیں اہل بصر اس کو مخالف حق پائیں تو خود کوشش فرما کر اور اس کی معقول تردید کر کے اپنے ان نوجوان احباب کو جو مروجہ علوم انگریزی کی تعلیم پا کر اس طرح کے خیالات سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس گرداب ضلالت سے بچا لیں۔ اور اس سے زیادہ یہ کہ دیگر اقوام کے مقابلے میں خود تحقیق حق کر کے اُن کے لئے بھی راہ راست کی ہدایت کی کوشش کریں۔ تاکہ تبلیغ مذہب کا حق ادا ہو جائے +

اس گزارش سے میرا مدعا یہ ہے کہ اہل نظر کو اس کتاب کی اشاعت کی بابت میرا واقعی منشا معلوم ہو جائے۔ اور میں بے وجہ ہدف ملامت نہ بنایا جاؤں اگر ناظرین باتمکین کے نزدیک میرے عذرات قابل پذیرائی ہوں تو چشم ما روشن۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ خدا علّام الغیوب اور ستّار العیوب ہے +

یہاں چلتے چلتے ایک نظریہ بھی دیکھ لینا چاہیئے کہ یہ مضمون حقیقت میں عقائد مذہبی کے مخالف یا ان سے مختلف ہے کہاں تک۔ عوام النّاس کے اعتقادات میں واقعی اصول مذہب کے ساتھ اور بہت سے حشو و زوائد بھی خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ جن کی بنا عموماً یا تو اپنے بزرگوں کی زبانی سنی سنائی باتوں پر ہوتی ہے۔ یا اُس زمانے کی علمی اور ذہنی ترقیوں کے نتائج پر جو رفتہ رفتہ عام ہو کر عوام کے دلوں میں جاگزین ہوتے رہتے ہیں۔ اور جو آہستہ آہستہ یا تو خود مذہبی عقائد کے ہمرنگ ہوتے جاتے ہیں۔ یا مذہبی خیالات کو اپنے ڈھنگ پر لاتے جاتے ہیں۔ اور اگرچہ شروع شروع میں علمائے مذہب ان کی تردید کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن شدہ شدہ ان کا اثر اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ تقاضائے فطرت سے مجبور

Marfat.com

ہوکر خود علما بھی اُن سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اور یہ ہے بھی ضروری کہ علما اور عوام کے معتقدات میں کوئی بیّن فرق اور نمایاں اختلاف نہ ہو۔ کیونکہ مقتدی اور مقتدے کا مختلف راستوں پر چلنا لفظی تعارض اور لغوی تناقض ہے۔

اس وقت تو خیران خیالات کا دل ودماغ میں جاگیر ہونا ضرور ہی بھی ہے اور مناسب بھی۔ مگر مشکل یہ ہے کہ انسان کا علم اور اس کا دماغ ایک جگہ ٹھہرنے والی چیز نہیں۔ اور مذہب روز بروز بدلنے والا نہیں۔ اور یوں ایک متحرک اور ایک ساکن چیز کی باہمی آمیزش سے نہ تو ساکن اپنی جگہ پہ برقرار رہ سکتا ہے اور نہ متحرک اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ جب زمانے کے انقلاب اور علم کی ترقّی سے خیالات کا رنگ بدل جاتا ہے اور نئی تحقیقات اور پرانی معلومات میں کشمکش ہوتی ہے۔ اور یہ کشمکش اکثر صحت علمی کے لحاظ سے نہیں ہوتی۔ کیونکہ زمانے کا رنگ ہی بدل جانے کے بعد نئے عہد میں پُرانے خیالات کے حامی بہت کم ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں کہیں وہ پُرانے خیالات مذہبی عقائد کا جزو بن گئے ہیں وہاں ان کی حمایت میں سر دیدینا بھی آسان سمجھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے انسان کی دماغی ترقّی میں کس قدر نقصان پہنچنا ممکن ہے۔ اور ساتھ ہی جب نئے خیالات کسی وجہ سے غلبہ پا لیتے ہیں۔ اُس وقت پُرانی باتوں کی تکذیب کے ساتھ ہی مذہبی اعتقادات میں کتنا بڑا تزلزل اور تذبذب پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کی مثالوں سے تاریخ کے ورق بھرے پڑے ہیں۔ اسلام اگرچہ ایک ایسا مذہب ہے جس کے اصول پر بہت کم چیزیں اپنا اثر ڈال سکتی ہیں۔ لیکن اس میں بھی سینکڑوں ہزاروں بزرگ ہیں جو اسی کشاکش خیالی پر قربان ہوئے ہیں۔ اور اَور مذہبوں میں تو نہیں معلوم کتنے ہزاروں لاکھوں ناکردہ گناہوں کا خون اس کی گردن پر ہے۔

میرا یہاں اس بیان سے یہ مطلب ہے کہ علمی نتائج کو مذہبی عقائد سے ملانا نہایت خطرناک اور مضر ہے۔ اس لئے حتے الامکان ان دونو کو ہمیشہ جدا جدا رکھنا چاہیئے۔ اور سچ یہ ہے کہ اکثر ان کو غیر ضروری طور پر باہم مختلط کیا

جاتا ہے۔ عام طور پر دنیاوی علم اصولِ مذہب اور الٰہیات پر بہت کم بحث کرتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کے موضوع ہی جدا جدا ہیں۔ مذہب کی بحث ان تعلقات سے ہے جو انسان اور اس کے پیدا کرنے والے میں ہیں۔ اور یہ بھی کسی فلسفیانہ پہلو سے نہیں۔ بلکہ اس صاف اور سادہ حیثیت سے کہ آدمی کیونکر اپنے خالق کی خوشنودی اور اپنے مالک کی رضامندی حاصل کر کے ابدی راحت اور سرمدی مسرت پا سکتا ہے۔ وہ اداے فرائض کے فوائد بتا کر نیکوکاری کی تعلیم کرتا ہے۔ ہر چیز اور ہر واقع میں صانع مطلق کی قدرت دکھا کر ایمان الی الحق کے راستے بتاتا ہے۔ اور پرانے زمانے کے حیرت خیز واقعات سنا کر ہر قسم کے فواحش سے روکتا ہے۔ نظام فیثا غورث اور اصول بطلیموس سے بحث نہیں کرتا۔ مدارات کواکب و گردش سیّارات کے اصول نہیں سمجھاتا۔ اور پرانی قوموں کے تاریخ وار افسانے نہیں سناتا۔ اور جو مذہب اس قسم کی کسی بحث کی بابت قولِ فیصل ہونے کا مدعی ہو۔ وہ گویا خود اپنے منہ سے اپنا ابطال کرتا ہے۔ اسلام نے تو شروع ہی میں جہاں اپنی کتاب مقدس کے لئے لا ریب فیہ کا دعوےٰ کیا ہے وہیں اس کا منشا بھی جتا دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ یہ کتاب هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ہے ✤

اس کتاب کے مبحوث فیہ تینوں مسئلوں میں سے کم از کم پہلے دو کی بابت اصول مذہب اسلام کوئی معیّن جواب نہیں دیتے۔ اس لئے آغاز انسان کے زمان و مکان کی بحث میں کہیں اس کا عقائد مذہبی سے تناقض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جہاں کہیں اختلاف ہوا ہے۔ وہاں اسی وجہ سے ہوا ہے۔ جس کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں۔ یعنی موجودہ قیاسات ان قدیم خیالات کے منافی ہو گئے جن کو عوام نے غلطی سے عقائد مذہبی کا جزو سمجھ کر محترم بنا لیا ہے۔ حالانکہ ان میں اگر کچھ وجہ احترام ہے تو صرف یہی کہ وہ قدما کی تحقیقات کا نتیجہ اور اس زمانے کے خیالات کا خاکہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض کتب تاریخ وغیرہ (مثلاً ناسخ التواریخ وغیرہ) میں واقعات کے لئے تعیین اوقات ہبوط آدمؑ سے کیا گیا ہے۔ اور یہ زمانہ اب سے تقریباً ۷-۸ ہزار سال پہلے کا قرار دیا گیا ہے۔ مگر

Marfat.com

اس زمانے کا اندازہ جیسا کہ مصنف کتاب ہذا نے بھی بیان کیا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے تخمینے سے کیا گیا ہے اور اس کی بنا ان عمروں پر رکھی گئی ہے۔ جو کتاب توریت و انجیل نے حضرت آدمؑ اور ان کے بعد کے اور انبیا علیہم و علی رسولنا الصلوۃ والتحیات کے لئے ٹھہرائی ہیں۔ مجھے یہاں اس معیار کی صحت پر بحث کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ کیونکہ شارع اسلام علیہ الصلوۃ والسلام نے کہیں ان پیغمبروں کی عمروں کو اپنی تعلیم و تلقین کا جزو بنانا مناسب خیال نہیں فرمایا۔ اور فی الحقیقت اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میرے خیال میں تو مذہب کی کتاب کو اپنی صداقت کے لئے بزرگوں کا شجرۂ نسب ہونے کی ضرورت نہیں اور دیگر مذاہب کی کتابوں میں تاویل و تحریف کی گنجائش بہت ہے۔ لیکن اگر ہم اسمائے انبیا کے اس اختلاف کو بھی چھوڑ دیں جو اسلام اور دیگر مذاہب کی کتابوں میں ہے۔ اور توریت کے اعداد کو بالکل صحیح بھی مان لیں۔ اور اس کے مختلف نسخوں کے اس اختلاف سنین کو بھی نظر انداز کر دیں جن کا ذکر اس کتاب کے مصنف نے اس بحث میں کیا ہے۔ تب بھی اس بات کا کیا ثبوت ہے۔ کہ یہی وہ تمام پیغمبر ہیں جن کی عمروں سے ہبوط آدمؑ کے وقت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اور ان کے سوا نہ کوئی اور پیغمبر ہوا اور نہ کوئی ان کے درمیان میں وقفہ گزرا۔ ان باتوں کو عقائد مذہبی کی شان تو کسی طرح دی ہی نہیں جا سکتی۔ اور جو لوگ اب بھی ان کی صداقت تسلیم کرانا چاہتے ہیں۔ ان کو چاہیئے کہ پہلے وہ ان تمام اعتراضوں کا تو شافی جواب دے لیں۔ جو نظر اول میں ان پر وارد ہوتے ہیں۔ اسلام نے جس طرح ابتدائے انسان کے زمانے کی تعیین نہیں کی ہے۔ اسی طرح وہ اس کے آغاز کی جگہ کے باب میں بھی ساکت ہے۔ اگرچہ ابوالبشر کو پہلے جنت میں مقیم بنایا گیا ہے وقلنا یا آدم اسکن انت وزوجک الجنۃ اور پھر معتوب بارگاہ یزدانی ہونے کے بعد ان کو زمین پر اتارا گیا ہے وقلنا اھبطوا بعضکم لبعض عدو ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین لیکن اس میں کہیں بھی ان کے مسکن کی اس جغرافی کیفیت کی تصریح نہیں کی گئی۔ جس نے عیسائیوں کو اس کی تلاش میں اس قدر سرگرداں کیا

Marfat.com

ہے۔ جیسا کہ مصنّف کتاب لکھتا ہے۔ مذہب کو یہ بتلانا منظور ہی نہ تھا کہ حضرت آدمؑ لنکا میں گرے تھے یا عدن میں۔ زمین پر پیدا کئے گئے تھے یا آسمان پر۔ اس کو تو صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب تھا کہ ایک ذات واجب الوجود نے اپنی قدرت صانعہ اور حکمت بالغہ سے ایک ایسے ذی حیات کو مخلوق کیا جو اپنی عقلی اور دماغی قوتوں کی وجہ سے تمام کائنات میں ممتاز تھا۔ اور جس کی عظمت و طاقت کے سامنے اُس وقت کے ہر کرہ و مہ نے سر تسلیم خم کیا تھا۔ اس لئے اس کو بھی لازم ہے کہ اپنے خالق کے احکام کی فرماں بری کرے اور اپنی اس بزرگی کو قائم رکھے جس نے اسے مسجود ملائکہ بنا دیا تھا۔ اس غیر ضروری صراحت کے نہ ہونے سے جائے ابتدائے انسان کے متعلق کوئی بحث معتقدین اسلام کے خیالات کے معارض نہیں ہو سکتی اور ہم بدو نوع کے لئے سطح زمین کی ہر ایک جگہ تسلیم کرنے کیلئے یکساں تیار ہیں ہمیں یہ ماننے میں عذر نہیں کہ اگر کسی زمانے میں اس مہبط آدمؑ کے لئے کوئی خاص جگہ مثلاً لنکا یا سنگلدیپ ٹھہرائی گئی تھی تو اس وقت اس کی صحت کو مان لینا بالکل بجا تھا۔ اور اگر آج کل کی نئی تحقیقات چند دن بعد غلط ثابت ہو جائے تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ اور جس طرح قدما اپنے اس قیاس میں معذور ہیں اسی طرح موجودہ زمانے کے علما اس کے متعلق اپنی رائے میں قابل معافی ہونگے۔ لیکن غلطی یہ ہے کہ اس میں سے کسی بات کو بھی خواہ وہ پُرانے زمانے کا قیاس ہو یا موجودہ عہد کا خیال عقائد مذہبی میں داخل کر کے یقینی اور حتمی سمجھ لیا جائے۔ کیونکہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ان قیاسات کا ہر روز ادل بدل ہونا ممکن ہے۔ اس لئے ان کو مذہب کی ازلی اور ابدی صداقتوں کے ساتھ جکڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ اور اگر بالفرض انقلاب ازمنہ کے ساتھ اختلاف اقوال نہ بھی ہو۔ اور کوئی بات قرنہا قرن تک مسلم رہے۔ تب بھی اس کا مذہب کے محترم حریم میں آنا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے مضامین کے متعلق پُرانے خیالات جو عقائد مذہبی کا جزو بن گئے اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں چونکہ لوگوں کے دل و دماغ میں یہی باتیں چکر مگا رہی تھیں اس لئے اقوال مذہبی کی تعبیر بھی ایسے پیرائے میں

Marfat.com

کی گئی - جس سے دونوں میں مطابقت پیدا ہو گئی - اور یوں دونو باتیں باہم مدغم ہو کر ہمصفیر ہو گئیں +

کم از کم میرا تو یہ خیال ہے کہ اگر اس وقت بھی کوئی چاہے تو اکثر مسائل جدیدہ مثلاً اسی مضمون کو آیات قرآنی سے تطبیق دے سکتا ہے - اور یہ بات کچھ زیادہ مشکل نہیں - اگر وہ پرانے عقائد سے خالی الذہن ہو کر ان خیالات کو اپنے دماغ میں لے کر کتب مذہبی کا مطالعہ شروع کرے تو وہ بے تکلف ان کی ایسی شرح کر سکیگا - جو خواہ نخواہ ان خیالات کے مطابق ہو گی - اس سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کتابوں کی صداقت میں کوئی فرق آتا ہے - نہیں - بلکہ بات یہ ہے کہ ہم اپنی کوتاہ نظری کی وجہ سے دنیا کی ہر ایک چیز کو اپنی معلومات کی روشنی میں دیکھتے ہیں - اور ہر ایک بات کو اپنے خیالات کے رنگ میں پاتے ہیں +

مثال کے طور پر اس مضمون کو لیجئے - عام طور پر یہ بات مانی جاتی ہے - کہ حضرت آدمؑ جزیرہ سنگلدیپ یا لنکا میں گرے تھے - چنانچہ کوہ آدم اور آدم کا پُل ابھی تک اس عام اعتقاد کے شاہد ہیں - اب یہ مضمون نسل انسانی کے آغاز کی جگہ ہندوستان کے جنوب میں بحر ہند کی غرقاب شدہ زمین کو ٹھہراتا ہے - اور یہ دونو باتیں تقریباً کیا بالکل باہم متفق اور مطابق ہیں - اور گویا ان کی تطبیق کی کوشش حصول حاصل ہے - اس نئی تحقیق کی روشنی میں مہبط آدمؑ کے لئے لنکا کو ٹھہرانا کتنا قرین قیاس اور مطابق عقل معلوم ہوتا ہے - ہمارے ان قدیم اور دور کے بزرگوں نے جب ہوش سنبھالا ہو گا - اور اُن کو اپنے قدیم آبا و اجداد کا مسکن یاد آیا ہو گا تو بے تحاشا ان کی نظریں اسی سمت اُٹھی ہونگی - جو ان کے بزرگوں نے نسلاً بعد نسلٍ اپنے آنے کی بتائی ہو گی - اور جب جنوبی سمت میں لنکا کے سوا حد نگاہ اور وسعت خیال تک برابر پانی ہی پانی موجیں مارتا پایا ہو گا تو خواہ نخواہ اسی جزیرے کی سب سے اونچی چوٹی پر نگاہیں پڑی ہونگی - اور اسی کو اپنا سرچشمہ خیال کیا ہو گا - اس خیال کے ساتھ ہی یہ بات از خود ذہن میں آتی ہے - کہ اس جائے ابتدا کی چاروں طرف بحر مواج کو لہریں مارتا ہوا دیکھ کر ان لوگوں کو طبعاً یہ خیال آیا ہو گا کہ غالباً

ہمارا جدامجد ابوالبشر آسمان پر پیدا ہوا ہوگا۔ اور پھر وہاں سے کسی طرح معتوب بارگاہ کبریائی ہو کر اس سرزمین پر پھینک دیا گیا ہوگا۔ اور یوں حضرت آدمؑ کی آسمانی پیدائش کا خیال پیدا ہوا ہوگا۔ اب اگر ہم حضرت آدمؑ کے جنت میں رہنے کی حالت کو ایک روحانی حالت سمجھ لیں۔ اور اس کے بعد ان کے ہبوط کو ان کے مادی اور دنیاوی ظہور کے معنوں میں لیں تو بہت سی مشکلیں بے دقت حل ہو جاتی ہیں۔ اور اگر ہم تھوڑی سی جرأت کر کے لفظ "جنت" کو اس کے لغوی معنوں میں لے کر اس کا ترجمہ "مخفی مقام" کریں۔ اور شجر ممنوعہ سے گیہوں یا انجیر وغیرہ کی بجائے "عقل و خرد" مراد لیں۔ تو اس مضمون کی متعلقہ آیات صداقت، سمات کا مطلب یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ "خالق کائنات نے آدمؑ کو خلق کرنے کے بعد اس کو ایک مدت تک نادان اور بے سمجھ رکھا۔ اور اسے بتا دیا کہ اگرچہ اس میں تمام قسم کی قابلیتیں مضمر رکھی گئی ہیں۔ جیسا کہ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ کُلَّهَا الخ سے ظاہر ہے۔ لیکن اس کے حق میں بہتر یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اگر مگر کے ہیر پھیر میں پڑنے اور عقل و خرد کے اُتار چڑھاؤ میں پھنسنے سے بچائے رہے۔ ورنہ وہ اپنے نفس پر ظلم کریگا"۔ چنانچہ ایک عرصے تک تو انسان اسی عالم بے خبری میں رہا۔ مگر آخر اس کا نفس کافر کیش اسے اکسا اکسا کر ہوش میں لے آیا۔ اور گویا آدمی اس جنون یا پوشیدگی سے نکل کر صفحۂ زمین پر آگیا۔ اور اس ہوش میں آنے کا سب سے پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو اپنی برہنگی کا خیال آیا۔ اور اس نے اپنے جسم کو درختوں کے پتوں سے ڈھانکنا شروع کیا۔ اسی حالت کا کلام الٰہی میں ان پاک الفاظ میں ذکر کیا ہے فلما ذاقا الشجرۃ بدت لھما سواتھما وطفقا یخصفن علیھما من ورق الجنۃ اس تشریح سے اس معاملے کی بابت حال کی تحقیقات اور مذہبی بیان میں پوری مطابقت ہو جاتی ہے۔ اور اس تاویل کے لئے آیات قرآنی کے صرف دو لفظوں کے معنی عرف عام سے کسی قدر مختلف کرنے کی ضرورت ہوئی۔ میرے خیال میں ان دونو لفظوں کے جو معنی مذکورۂ بالا عبارت میں میں نے لئے ہیں وہ کچھ بہت بعید از خیال اور دور از کار نہیں ہیں۔

Marfat.com

"جنت" کے معنی مخفی مقام کے ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہو سکتا۔ عرف عام میں جو جنت۔ جنت کہلاتی ہے۔ وہ بھی اپنے اخفا ہی کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہے۔ علی ہذا القیاس جن۔ جنون۔ جنین۔ جنان۔ وغیرہ تمام الفاظ اپنے غیر مرئی ہونے کے لحاظ سے ہی ان ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ شاید کوئی صاحب فرماویں کہ لفظ جنت کے ان معنوں میں تو بحث نہیں مگر جنت تو آسمان پر مانی جاتی ہے۔ یہ ایک نئی جنت بحر ہند میں سے ڈوبی ہوئی کہاں نکل آئی؟ میں ان کے اس نہایت بجا اعتراض کی صحت کا معترف ہوں مگر میں اس کے جواب میں یہ کہونگا کہ اس معروف جنت کا بھی بالائے فلک ہونا کم از کم مختلف فیہ تو ضرور ہے۔ اس کو بھی جانے دیجئے۔ عام اعتقاد کے مطابق بھی ایک جنت یعنی باغ ارم کو تو صفحہ زمین ہی پر مانتے ہیں۔ یہ بھی نہ سہی۔ مگر ہم یہ تو ضرور کہینگے کہ اس زمانے میں یہ زمین ہر قسم کے شور و شر سے پاک ہو گی۔ چاروں طرف قدرت کا سدا بہار گلزار اور ہمیشہ بہنے والی نہریں ہونگی۔ کھانے کے لئے عمدہ سے عمدہ میوے اور سیر کے لئے ہر وقت کھلے ہوئے پھول ہونگے۔ پھر کیا وجہ کہ خدا اس جگہ کو جنت سے تعبیر نہ کرتا مشہور ہے ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد ✤ کسے را با کسے کارے نباشد

پھر اس پر بے فکری کا عالم اور بے خبری کی حالت۔ سچ تو یہ ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ حقیقی جنت میں بھی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے! اس کے علاوہ ایک امر اور بھی قابل لحاظ ہے۔ اور وہ یہ کہ اس مضمون کے متعلق خدا نے ہر جگہ "جنت" ہی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حالانکہ اس کے مرادف الفاظ اور بھی بہت سے ہیں۔ جو اس موعودہ عالم مسرت و اطمینان کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔ مثلاً خُلد ہی ایک ایسا لفظ ہے۔ جو کلام الٰہی میں اس جگہ کے لئے اکثر آیا ہے۔ اور اس کے دوام کے اظہار کے لئے ہے بھی بہت موزون۔ مگر حضرت آدمؑ کی ابتدائی جائے رہائش کے بیان میں خدا نے ہر جگہ اسی لفظ جنت کو فرمایا ہے۔ اگر ان باتوں کے ساتھ ہی یہ بات بھی خیال میں آجائے کہ آغاز بشر کا مقام بالکل نامعلوم ہے۔ بایں کہ وہ (تحقیقات جدیدہ

کے موافق) سطح آب میں چھپ چکا ہے تو اس کے لئے جنت کا لفظ اور بھی زیادہ متناسب اور پُرمعنی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ دلائل کچھ بہت قوی نہ ہوں مگر جب ان کا یکجائی اثر حال کے خیالات کے ساتھ ملا کر دیکھا جاتا ہے تو میرے خیال میں تو وہ بہت معقول اور پُرزور ہو جاتے ہیں۔ دوسرا لفظ جس کی تعبیر معمولی ترجمے سے مختلف کی گئی ہے۔ وہ الشجرۃ ہے۔ عموماً اس سے گیہوں کا درخت سمجھا گیا ہے۔ اور بعض مفسرین نے اسے انجیر یا انگور کا درخت خیال کیا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ شجریت کے لحاظ سے یہی معنی موزوں بھی ہیں۔ مگر میں نے اس کے جو معنی لئے ہیں وہ اگرچہ لفظی لحاظ سے بہت بعید از قیاس ہیں۔ مگر معنوی حیثیت سے کم از کم مجھے تو بہت چسپاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ میں کچھ خودستائی سے نہیں کہتا۔ بلکہ میں ان کے سوا اس کا اور کوئی مفہوم سمجھ ہی نہیں سکتا۔ عام معنوں پر سب سے پہلے تو طبعاً یہی سوال وارد ہوتا ہے۔ کہ گیہوں۔ انجیر۔ یا انگور یا اور کسی خاص درخت کے پھل کو روکنے سے اللہ نے کیا فائدہ مدنظر رکھا ہوگا۔ یہ صحیح ہے کہ مشیّت ایزدی کی مصلحتوں پر بحث کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ مگر اتنا تو ہم جانتے اور مانتے ہیں کہ خدا کا کوئی حکم خالی از مصلحت نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی کہ وہ ہمارے ہی فائدے کے لئے ہوتا ہے۔ کچھ اس لئے نہیں ہوتا کہ خدا کو اپنے حکموں کی تعمیل کرانے کا شوق ہے۔

اب جہاں تک ہماری عقل کام کرتی ہے۔ کسی خاص درخت کو اس تشدد کے ساتھ ممنوع بنانے میں کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ اور پھر وہ درخت بھی ایسا جو بعد میں انسان کے لئے مضر ثابت نہیں ہوا۔ اور جس سے تمام آدمیوں کو نہ کوئی خاص رغبت ہے نہ کوئی نفرت۔ گیہوں تو خیر کسی قدر عام استعمال کی چیز ہے بھی۔ مگر انجیر اور انگور کا تو نوّے فی صدی آدمیوں نے کھانا کیا نام بھی نہ سنا ہوگا۔ زیادہ مستند قول یعنی گیہوں کی صورت میں یہ بھی دقت ہے۔ کہ اپنی موجودہ حالت میں تو گیہوں ایسی چیز نہیں جسے آدمی بے کسی قسم کی تیاری کے کھا سکے۔ لیکن خیر شاید وہ کچھ اور طرح کے گیہوں ہوں۔ اس مضمون

Marfat.com

کی آیات قرآنی ہیں تو اس ممنوعہ شجر کے پاس جانے سے بھی آدم کو روکا ہے۔ کھانا تو بڑی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس درخت کے پاس جانے کا نتیجہ یہ فرمایا ہے کہ فتکونا من الظالمین ممکن ہے کہ یہ نتیجہ حکم ایزدی سے سرتابی کا ہو مگر لیکن فحوائے کلام سے یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ ثمرہ خود اس درخت سے قریب ہونے کا ہے۔ اور گویا خدا تعالیٰ نے حضرت آدم ؑ کو اس سے اسی طرح ڈرایا ہے۔ جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو آگ کے ہاتھ لگانے سے روکے۔ اب اگر اس گناہ کی سزا کو دیکھا جائے تو وہ اپنی نوعیت میں سخت ترین گناہوں کی سزا سے بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اور جو ضرر نوع انسان کو اس سے پہنچا ہے وہ کسی درخت کی قربت کیا احکام الٰہی کی نافرمانی سے بھی پہنچنا مشکل ہے۔ کیونکہ ہر قسم کے گناہ یہاں تک کہ شرک اور الحاد کی سزا بھی بحکم لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ خود ذات فاعل ہی تک محدود رہتی ہے اور عصیاں اور نافرمانی تو ایسے گناہ ہیں جو ہم خطاکار ہر وقت ہی کرتے رہتے۔ ان کی تو کچھ گنتی ہی نہیں لیکن اس جرم کی سزا ایسی سخت ہے کہ وہ حضرت آدم ؑ کی تمام اولاد کو دی جارہی ہے۔ اور قیامت تک دی جاتی رہیگی۔ کیونکہ ہمارا جنت سے نکالا جانا۔ اس الم آشوب دنیا کے ہردم کے ظلم و ستم سہنا۔ اور پھر اس کے بعد آیندہ کی سزا و جزا میں مبتلا ہونا کیا کچھ کم سزا ہے۔ اور یہ سب کچھ کس لئے صرف حضرت آدم ؑ کے اس درخت یا پھل چکھنے سے۔ یا زیادہ سے زیادہ ایک حکم کی نافرمانی کی وجہ سے۔ حافظ نے خوب کہا ہے ؎

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود　　آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

میں احکام ایزدی سے سرتابی کو کوئی چھوٹی سی بات نہیں کہتا۔ لیکن میں یہ کہتا ہوں۔ کہ موجودہ احکام شریعت میں سب سے زیادہ تاکیدی حکم بھی اگر پورا نہ کیا جائے۔ تو بھی اس کی سزا فاعل کے سوا کسی دوسرے کو نہیں دی جاتی اور معذرت اور استغفار کی صورت میں خود فاعل سے بھی درگزر کرنے کا وعدہ صادق ہے۔ چہ جائیکہ اس جرم میں فاعل کے تمام لواحقین و متعلقین ابدالآباد تک ماخوذ رہیں۔ اور کوئی ایسا ممنوعہ درخت اب بھی

Marfat.com

نہیں مل سکتا جس کو نوع انسان کا ہر فرد بشر استعمال کرتا ہو اور اس لئے قابل سزا ٹھہرایا جا سکے۔ چونکہ اس سے منصف حقیقی کے رحم و انصاف پر اعتراض ہوتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں لفظ شجر اور عصیان آدم کی ایسی تشریح ہونی چاہیئے۔ جو تمام نوع انسان کو گھیر لے۔ اور جس کی وجہ سے وہ سب کے سب بلا استثناء سزا و جزا کے پھندے میں آجائیں۔ اب اگر غور کیا جائے تو ایسی چیز جس پر سزا اور جزا کا مدار ہے عقل کے سوا اور کچھ نہیں۔ کیونکہ یہی وہ چیز ہے۔ جو انسان اور حیوان میں مابہ الامتیاز ہے۔ اور نوع انسان میں بھی جن لوگوں کو کسی وجہ سے عقل سے محروم مان لیا گیا ہے وہ قانون اور شریعت دونوں کی پابندی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اور دین اور دنیا دونوں کے جھگڑوں سے نجات پا گئے ہیں۔ اس لئے میری رائے میں تو عقل ہی ایک ایسی مضر چیز ہو سکتی ہے۔ جو ہمیشہ کے لئے انسان کو احکام شریعت کی بجا آوری کا مکلف بنا سکتی ہے۔ اور جس کے حاصل کر لینے کے بعد انسان اس جنت مثال عالم بے خبری سے نکل کر گویا اس دنیا کی تکالیف و حوادث کا آماجگاہ بن سکتا ہے۔ اور یہ سزا کچھ خدا کی نافرمانی کی وجہ سے نہیں ہے۔ بلکہ خود حصول عقل ہی کا تقاضا ہے۔ بقول ذوق ؎

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا　　کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا

میرے خیال میں وہ بار امانت بھی یہی ہے جس کا کلام پاک میں ارشاد ہے کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۔ دیکھئے خدا تعالےٰ نے یہاں بھی اپنی ہی پیش کردہ امانت کے اٹھا لینے پر انسان کو اپنے اوپر ظلم کرنے والا ٹھہرایا ہے ؛

تیسرا مسئلہ البتہ ایسا ہے کہ جسے اہل مذہب ہی نے نہیں بلکہ عام طور پر سب نے ہی مردود کیا ہے۔ اب سے پچاس برس پہلے تو اہل یورپ و امریکہ بھی کسی طرح اس کے قائل نہ ہوتے تھے۔ مگر آخر رفتہ رفتہ انہوں نے تو اس کو تسلیم کر لیا۔ اور تسلیم کرنے کے بعد اس کی اسقدر قدر کی کہ آج وہ ایک ایسا پیش پا

افتادہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔ جسے بچّہ بچّہ جانتا ہے۔ اور جس کی کسی قسم کی تشریح و توضیح کی حاجت نہیں خیال کی جاتی۔ گویا کبھی اس سے انکار یا اختلاف کیا ہی نہ گیا تھا۔ ہاں اہل ہندوستان نے ابھی تک اچھّی طرح اس مسئلے کو سنا بھی نہیں کہ یہ ہے کیا۔ اور اس سے مطلب کیا ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ عقائد مذہبی کے مخالف ہونے کے علاوہ ہمارے ان خیالات کا منافی ہے جو ہم نے اپنے گہواروں میں اپنے ماں باپ سے حاصل کئے ہیں۔ اور جو ہماری طبیعتوں کا جزو۔ اور ہمارے اعتقادات کی بنا بن گئے ہیں۔ میں یہاں اس کے متعلق کوئی راے نہیں دے سکتا۔ اور میری راے کچھ وقعت بھی نہیں رکھتی۔ مگر میں یہ ضرور کہونگا کہ اہل نظر اس کو ایک دفعہ غور سے دیکھیں ضرور۔ کیونکہ اگر خود اس مسئلے کے نئے اور عجیب ہونے کو نظر انداز بھی کر دیں تو بھی یہ اس حیثیت سے ضرور قابل غور ہے کہ اب یہی مسئلہ تمام علوم جدیدہ کا مدار بنایا جا رہا ہے۔ اور آج کل کے تمام فلاسفہ مغرب کے مسائل کا اصل اصول ہو گیا ہے۔ اس مسئلے پر غور کرتے وقت اس بات کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیئے کہ یہ مسئلہ ہستی واجب الوجود اور روح سے ہرگز انکار نہیں کرتا۔ اور انکار کر ہی کیونکر سکتا ہے۔ جب اس نے ان امور کی بحث کو اپنے موضوع ہی میں شامل نہیں کیا۔ اس لئے ایک بڑی مباینت جو اس میں اور اصول مذہب میں ہو سکتی تھی۔ نہیں رہتی۔ اس مسئلے کی بحث صرف اس بات پر ہے کہ دنیا کی موجودہ اشیاے ذی حیات نے یہ موجودہ صورت کس طرح حاصل کر لی۔ گویا یہ مسئلہ مختلف حیوانات کے وجود و حیات کا سبب قریب تلاش کر کے ان سب کو ایک سلک انتظام میں منظوم کرنا چاہتا ہے۔ تمام اشیا کے سبب بعید اور علت العلل پر کسی طرح کی بحث یا گفتگو نہیں کرتا۔ اور یہ ظاہری بات ہے۔ کہ اگرچہ اس بات کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھنا ہمارے لئے ضروری ہے کہ فی الحقیقت ہر فعل کا فاعل اور ہر کام کا آمر خداے تعالےٰ ہی ہے لیکن دنیوی لحاظ سے مختلف اسباب قریبہ کی چھان بین اصولاً مخالف مذہب نہیں ہو سکتی۔ ورنہ شریعت کے تمام احکام بے کار ہو جائیں۔ اور انسان کا فاعل

Marfat.com

مختار ہونا ناممکن بن جاے۔ جس سے نہ دنیوی قانون کی پابندی قائم رہے۔ نہ دینی احکام کی تعمیل لازمی ٹھہرے۔ اور اس طرح تمام نظام عالم درہم وبرہم ہوجائے۔ کسی نے خوب کہا ہے ؎

بے ابر صدف قطرۂ از بحر نیاید در عالمِ امکاں نتواں ترکِ سبب کرد

ہر شخص اپنے کاروبار میں تھوڑی دور تک ظاہری اسباب تلاش کرتا ہے۔ اور اگر وہ فاعل حقیقی کو بالکل بھولا ہوا نہیں تو کچھ بیجا نہیں کرتا۔ افراد انسانی وحیوانی کی خلقت میں بھی بہت سے مختلف مدارج تو مذہباً اور عقلاً ہم تسلیم کرتے ہی ہیں۔ جن میں سے ہر ذیحیات شئے کو اپنی ابتدا سے انتہا تک گزرنا ہوتا ہے۔ اس مسئلے نے صرف عرف عام سے کسی قدر زیادہ دور تک کے اسباب ظاہری تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور جو مدارج ہم پہلے سے افراد کے لئے مانتے آتے تھے۔ اسی قسم کے مراتب اس نے انواع و اقسام حیوانات کے لئے بھی ثابت کئے ہیں۔ اور جس طرح ہم چند بھائی بہنوں کا ایک ماں باپ کی اولاد ہونا۔ یا چند قبائل کا ایک قوم کی شاخیں ہونا۔ یا چند قوموں کا ایک نسل کی فرع ہونا مانتے تھے۔ اسی طرح اس نے چند مختلف قسم کے جانوروں کا ایک ہی نوع یا چند انواع کے حیوانات کا ایک ہی خاندان کی مختلف شاخیں ہونا ثابت کیا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ اس میں اور ہمارے عام خیالات میں تعارض اکثر جگہ ہوگیا ہے۔ اور میرے خیال میں یہ معارضہ ہی ہم کو مجبور کرتا ہے کہ ہم مسئلۂ ارتقا پر غور کریں۔

مذکورۂ بالا بیان سے میرا مدعا اس کتاب کے مضمون کو عقائد مذہبی کے ساتھ مطابقت دینا نہیں ہے۔ کیونکہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس قسم کی تحقیقات کو مذہب کے مقدس اصول میں شامل کرنا نہایت خطرناک اور دنیا دین اور مذہبی ہر دو حیثیتوں سے مضر ہے۔ اس کے علاوہ آیات قرآنی کی تفسیر و تشریح میری لیاقت و قابلیت سے بہت زیادہ ذمہ دار می کا کام ہے۔ میں نے مسطورۂ بالا سطور میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر ہم پرانے خیالات سے خالی الذہن ہوکر عقائد مذہبی اور تحقیقات علمی کو باہم منطبق کرنا چاہیں تو یہ

کوشش بالکل بے سود نہ ہوگی۔ شاید آپ کہیں کہ جب میں مذہب کو ان باتوں سے الگ ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ تو پھر ان دونو کی تطبیق کے کیا معنی۔ یہ صحیح ہے کہ میں ان باتوں کو عقائد مذہبی سے جدا رکھنا مفید سمجھتا ہوں مگر میں کہہ چکا ہوں کہ یہ خیالات آہستہ آہستہ ہمارے دماغ پر اپنا اثر جما لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے متعلق مذہبی اقوال کی بھی ایسی ہی تاویل کی جانے لگتی ہے جو ان کے مطابق ہو۔ اور نامعلوم طور پر خود بخود ہمارے عقیدوں میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ عوام تو عوام اکثر علمائے کرام بھی ان کو اصول مذہب سے ممتاز نہیں کرتے اور ان کو اسی شد و مد سے منوانا چاہتے ہیں۔ جس طرح نہایت اہم اور ضروری ارکان ایمان کو۔ پس ایسے اصحاب کے لئے ضرور ہے کہ اس زمانے میں جبکہ نئے قیاسات پرانے خیالات کی تردید کر رہے ہیں۔ یا تو وہ ان نئی باتوں کا معقول ابطال کریں۔ یا ان کو بھی مذہبی عقیدوں سے ویسی ہی مطابقت دیں جس طرح پرانے خیالات کو ہو گئی تھی۔ اگرچہ ان دونو سے بہتر صورت یہی ہوتی کہ ان کو کسی طرح مذہب کے معارض ہی نہ ہونے دیا جاتا۔ یعنی اس قسم کے مضامین کو شروع ہی سے اصول مذہب میں شامل نہ کرتے۔ بہرکیف میں نے اس کتاب کو محض اس کے مضمون کی دلچسپی اور اس کے موضوع کی جدت کی وجہ سے اہل وطن کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ اس کے ترجمے میں مجھے جو دقتیں نایابی الفاظ کی وجہ سے پیش آئیں۔ میں انہی کو ترجمے کی خامی کے الزام میں اپنا عذر خواہ سمجھتا ہوں۔ اردو زبان میں علوم و فنون کی ڈکشنریوں کے نہ ہونے کے سبب سے مجھے اکثر جگہ خود لفظ وضع کرنے پڑے ہیں اس کے سوا اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ اتنا خودستا تو میں نہیں ہوں کہ یہ سمجھنے لگوں کہ میرے وضع کردہ الفاظ جزو زبان بن لیں گے۔ لیکن تاہم یہ تو ہوگا کہ خواہ مخواہ ان معانی کے ادا کرنے کے لئے ان سے بہتر کوئی اور لفظ وضع ہونگے۔ اور یوں میں اپنے دل کو یہ کہکر خوش کرونگا کہ بالواسطہ گویا میں ہی اردو زبان کی توسیع کا سبب ہوا گو سبب بعید ہی سہی ÷

میں نے اکثر جگہ تاریخی ناموں اور تشریح طلب لفظوں کے نیچے مختصر نوٹ دیکر

Marfat.com

ترجمے کو زیادہ عام فہم اور آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ گو اب بھی کتاب میں بعض مقامات کسی قدر غور کے محتاج ہیں۔ خاص کر دوسرا باب جس میں آغاز نوع انسان کی بابت علم ہیئت سے نتائج اخذ کئے گئے ہیں۔ اس میں ریاضی کے چند مسائل بھی بیان کئے گئے ہیں۔ اور چونکہ ان کا سمجھنا ان سے پہلے مسائل کے جاننے پر مبنی ہے۔ میں نے بھی ان کی زیادہ تشریح نہیں کی۔ کیونکہ جو اصحاب ان مسائل سے واقف ہونگے ان کے لئے کسی توضیح کی ضرورت نہیں۔ اور جو لوگ ان سے ناآشنا ہیں۔ ان کو چند سطروں کے فٹ نوٹ کیا فائدہ دے سکتے ہیں۔ پھر بھی اگر ان مسائل ریاضی کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو باقی باتیں زیادہ مشکل نہیں رہتیں۔ میں ناظرین کی توجہ اس باب کی طرف خاص طور پر مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ابواب مابعد کے تمام نتائج زیادہ تر اسی بحث کے اخذ کردہ نتائج کی تاکید کرتے ہیں۔ اگر اس باب پر تھوڑی سی بھی توجہ کی گئی تو تمام مضمون واضح ہو جائیگا ؛

میرے خیال میں دیباچے کے لئے اتنی باتیں کافی بلکہ اس سے بھی کچھ زائد ہیں۔ زیادہ تفصیلی بحث کے لئے ناظرین کو متن کتاب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔ مترجم کو اس سے زیادہ سمع خراشی کی ضرورت نہیں ؛

خاکسار مترجم

Marfat.com

باب اوّل

بدوِ نوعِ انسان کی بابت چند سوالات

بنی نوع انسان کی تاریخ کی ابتدا میں اس مضمون کے متعلق چند سوالات ہیں جو طبعاً ہر شخص کے سامنے آتے ہیں ۔ اور اس کی توجہ کو کھینچے رہتے ہیں ۔ اگر ان سوالات کو فراموش یا نظرانداز کر دیا جائے تو وُہ بار بار دماغ کو پریشان کرتے ہیں ۔ گویا بے کافی و شافی جواب لئے آگے بڑھنے سے روکتے ہیں ۔ یہ سوالات عالموں کے دل میں کھٹکتے ہیں ۔ شاعروں کے خیال اور فلسفیوں کے دماغ پر اِن کا اثر یکساں ہے ۔ اگر کچھ دیر کے لئے بُھلا بھی دئے جائیں تو تھوڑی دیر میں وُہ پھر اور زیادہ زور سے پیدا ہو جاتے ہیں ۔ کوئی زمانہ اور کوئی قوم ایسی نہیں جس میں یہ خیالات نہ آئے ہوں ۔ کوئی زبان اور کوئی لہجہ ایسا نہیں جس میں یہ سوالات نہ ہوئے ہوں ۔ حقیقت میں اُس سے زیادہ نادان کوئی نہیں جو یہ نہیں جانتا کہ آدمیوں نے ان سوالات کا قرین قیاس اور واقعی جواب دینے کے لئے کیا کیا کوششیں اور کیسی کیسی محنتیں کی ہیں ۔

یہ سوالات جن کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے ۔ تعداد میں تین ہیں ۔ اوّل تخمیناً یا حقیقتاً کس وقت روئے زمین پر نوعِ انسان کا وجود ہُوا ؟ دوم کس قطعہ زمین میں ابتداً انسان کا ظہور ہُوا ؟ سوم وُہ صورت یا طرز یا طریقہ کیا تھا جس سے انسان اس زمین پر بحالت ہوش و حواس وارد ہُوا ۔ یہاں کے اشرف المخلوقات ہونے کا دعوےٰ کیا اور پھر اپنے آپ میں اپنے خیال اور افعال پر غور کرنے کی قابلیت

معلوم کی؟

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ سوالات آسانی سے رد نہیں کئے جا سکتے۔ یہ بات انسانی طبیعت میں داخل ہے۔ کہ ہم اپنے آغاز وجود کے وقت۔ جگہ اور طرز کی بابت غور اور تحقیق کریں۔ انسان نے فطرتاً ان باتوں کے جواب کے لئے تمام علوم مختلفہ کو چھان مارا ہے۔ کسی میں یہ خواہش تحقیق کم ہے۔ کسی میں زیادہ۔ مگر ہے سب میں۔ دنیا کے وحشی سے وحشی طبقے میں بھی ایسے فاتر العقل اور بے وقوف کا ملنا دشوار ہے۔ جس میں اپنی فہم ناقص کے مطابق اپنی قوم کی ابتدا اپنے قبیلے کے آغاز اور اپنی پیدائش کے متعلق شوق جستجو تک نہ ہو۔ جب وحشیوں کا یہ حال ہے تو مہذب دنیا کے عقلمند فاضلوں کے شوق تحقیق کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جن کا ذہن رسا آسمان کے تارے اُتارتا ہے۔ اور جن کی نظر بینا زمین کے خزانے دیکھتی ہے ؛

یہ بات ظاہر ہے کہ ان نہایت ہی ضروری اور اہم سوالات پر بڑے عجز و نیاز سے غور کیا جائے۔ منصف مزاج محقق کو شروع ہی سے اپنی قابلیت کی وسعت اور اپنے سارے ذریعوں کی محدودیت پر غور کر لینا چاہئے۔ سچائی اور بے تعصبی اس کے مزاج کا جزو ہوں۔ طلب صادق اس کی رہنمائی کرے۔ یکسوئی توجہ اس کی رہبر ہو۔ متانت اس کے دست و قلم کو سنبھالے۔ خواہش صداقت اس کی ہمت بڑھائے۔ اس کا اصلی منشا اور مدعا یہ ہو کہ اگر ہو سکے تو وہ نوع انسان کے فائدے کے لئے اُن کے خزانۂ علمی کو ترقی دے۔ اور اپنے نور دماغ سے اس غار تیرہ و تار کو روشن کرے جس کی طرف اتنی آنکھیں لگی ہوئی ہیں۔ شاہد صدق کے سچے عاشق اور تحقیق علم کے اصلی شائق کی غرض و غایت یہی ہونی چاہئے۔ نہ یہ کہ وہ کسی پرانے نتیجے کو اشاعت دے۔ یا کسی چھوٹے سے تعصب کی تائید کرے۔ یا کسی پوسیدہ خیال کی تاکید کرے جو اگلے لوگوں کی کم علمی اور ناواقفیت سے پیدا ہوا ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی نہ چاہئے کہ وہ موجودہ علم و یقین پر حملہ کرے۔ اور ان کو مٹا دے۔ یا زبردستی ان پرانے عقیدوں کو متذبذب اور متزلزل کرے جن کو اس کے بزرگوں کے دل نے اپنے اظہار بیم و رجا کے بہترین

Marfat.com

طریقے قرار دیتے ہیں۔ بلکہ اس کو چاہیئے کہ ہر چیز کا اچھی طرح درست موازنہ کرے اور بالکل خالی الذہن ہو کر ہر ایک خیال و عقیدۂ انسانی اور واقعہ موجودہ پر غور کرے۔ لیکن آخر آدمی ابتدائے آفرینشِ انسان کے وقت اور جگہ کی بابت کیا خیال کرتا ہے۔ اور ان حالات اور واقعات کی نسبت کیا رائے رکھتا ہے جس سے ظہور آدم وقوع میں آیا۔ شاید ان سوالات کے حل کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزون مشابہت ہر فرد بشر کی خود اپنی ابتدائے ہستی کی بابت واقفیت ہے۔ یہ تشبیہ اور اس کا خیال تعجب ہے کہ اکثر نظر انداز کیا گیا۔ ہر شخص کا علم خود اپنے متعلق ایسا عام ہوتا ہے کہ اسے ابتدائے عالم کو اس پر محمول کرنے کا خیال تک نہیں آتا۔ اگر ہم اپنی زندگی پر نظر ڈالیں اور گزشتہ وقت کے حالات پر ذہن دوڑائیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جوں جوں ہم آغاز کی طرف بڑھتے ہیں۔ یہ حالات دھندلے ہوتے جاتے ہیں یہانتک کہ بچپن کی باتیں بالکل مٹی مٹی معلوم ہوتی ہیں۔ اور آخر شیر خواری کی حالت میں ایک وقت آتا ہے کہ اس کے آگے ہماری بصارت اور بصیرت بالکل کام نہیں دیتی۔ غور کرو اور دیکھو کہ عمر کا وہ حصّہ جو ہم ابھی گزار کر آئے ہیں۔ حافظے کے نور سے روز روشن ہو رہا ہے۔ اس سے کچھ اور پیچھے ہٹیں تو روشنی ہلکی اور چیزوں کے رنگ پھیکے ہیں۔ عمر کی دوسری دہائی کا خیال کرتے ہوئے حافظہ اکثر باتوں میں پہلوتہی کرنے لگتا ہے۔ اور سوائے موٹے موٹے واقعات کے اور جزئیات پر دھندسا چھا جاتا ہے۔ اس سے پیچھے ہٹیں تو حافظے کا سورج ڈوبنے لگتا ہے۔ صرف شفق کی روشنی میں کسی کسی بات کی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر وہ بھی اصلی صورت سے مختلف۔ باپ کا چہرہ۔ بھائی کا ہاتھ۔ ماں کی پیاری گود اور بس۔ اس کے بعد مطلع صاف ہے۔ اور رات کی تاریکی گہری۔ ہاں یہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہمارے حافظے کی انتہائی پہنچ سے پہلے بھی ہم موجود ضرور تھے۔ اور دوسروں کی طفولیّت دیکھکر ہم نے جان لیا ہے کہ زندگی کے پہلے دو ڈھائی سال تک ہم بالکل ناسمجھ اور محض بے خبر تھے۔ یہ وقت صرف نشو و نما کا تھا تمیز سے تیز عقل اور قوی سے قوی ذہن کبھی اس قابل نہیں ہے کہ خود اپنے بچپن کے حالات پر سے تاریکی کے پردے اُٹھا سکے۔ یا اپنے ذاتی تجربے سے بتا سکے وہ ابتدا میں کیا تھا۔؟

اور اپنے علم و یقین سے دکھائے کہ کیسے کیسے تغیّر و تبدّل کے بعد اس کی روح عالم ہستی کی دلفزا فضا کے سیر کے لائق ہوئی تھی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ہماری ابتدائے زندگی کی بے خبری میں بہت سے لوگ ہمارے خبرگیراں تھے۔ اِن دنوں میں ہمارے والدین اور اَور عزیز بڑی دلچسپی سے ہمارے حالات پر غور کرتے تھے۔ گھر والوں میں ہماری باتوں کے قصّے کہے جاتے تھے۔ ہماری حرکتیں کہانیاں تھیں جن کی بنیاد سچائی اور جن کی دلربائی محبّت تھی۔ کچھ دن بعد ہمارے ہوش سنبھالتے ہی یہ قصّے کہانیاں بار بار اور طرح طرح سے ہمارے کان پڑیں۔ اور جہاں کافی دلچسپ ہوئیں وہاں ہم نے خود ان میں کمی بیشی کر کے ان کو شاعرانہ رنگ میں رنگ دیا۔ اور حافظے نے انکو اپنے بچپن کی دلچسپ یادگار سمجھ کر اپنے سینے میں جمع کیا۔ اس طرح ہر شخص کے گردِ بچپن کے نیم رنگ قصّوں اور افسانوں کا ایک حلقہ ہو جاتا ہے۔ جو آئندہ زندگی میں اس کے تغیّر و تبدّل اور نشو و نما کا سب سے زیادہ سچّا اور صحیح بیان سمجھا جاتا ہے۔

مذکورہ بیان سے ہم اپنے قبیلے، اپنی قوم اور آخر اپنی نوع کے متعلق چند مفید اور مناسب نقاط اشتراک و مشابہت اخذ کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کی پوری قدر اُس وقت سے ہوئی ہے۔ جب سے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر فرد اپنی نوع کا ایک مختصر نمونہ ہے۔ اس فرد اور نوع کی باہمی مشارکت نے اکثر ایک دوسرے کے حالات پر علمی روشنی ڈالی ہے۔ اس مہتم بالشان کام یعنی تمدّن و تہذیب کے آغاز، اسباب شرائط۔ ترقی۔ اور میلان الی الکمال وغیرہ کی نہایت مفصل اور خاطر خواہ تشریح حالات نوع اور سوانح فرد کے مختلف طبقوں کے مقابلہ کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ بہرحال فی الوقت ہم کو ان باتوں سے چنداں علاقہ نہیں۔ پس اگر ہم نوع انسان کو ایک فرد بشر قرار دیں۔ جس کی شیر خوارگی بے خبری کے پردے میں چھپی ہوئی ہے جس کا بچپن بہت کم جھلکتا ہے۔ جس کا شباب نمایاں مگر دھندلا ہے۔ اور جس کی کہولت کامل العقل اور سریع الفہم ہے۔ تو ہم کس قدر حالات کی علمیّت اور کس قدر واقعات کی واقفیّت کا دعوےٰ کر سکتے ہیں۔ جن سے وجود انسانی کی سب سے پہلی حالت اور اس بے خبری کی کیفیّت دریافت ہو سکے جو ہر قوم کی یادداشت کی حد سے باہر اور

Marfat.com

ہر شخص کے وہم وقیاس کے دائرے سے پرے ہے۔ کیا تصوّر اور تخیّل کے ایسے معتبر ذرائع ہیں۔ جن کو علم کہہ سکیں اور جن سے اس دور دراز سرزمین پر جو انسانی ہوش وحواس کے افق سے پرے ہے۔ تحقیق کی روشنی منعکس کی جا سکے ✦

نہایت ہی خوش نصیبی کی بات ہے کہ ایسے ذرائع فی الواقع موجود ہیں۔ ان میں سے اکثر حال ہی کی تحقیق ہیں۔ مختلف علوم و فنون کے میدان انسانی دل و دماغ کے لئے صاف کر دئے گئے ہیں۔ اور ہر بار کی تفتیش ہمارے ان اہم سوالوں کے متعلق نئی اور قیمتی معلومات مہیّا کرتی ہے۔ بہت سے روز افزوں ترقّی کرنے والے علموں کی کوششیں ان نتائج کے لئے وقف ہو رہی ہیں۔ جن کو پھیلانے سے نسل انسانی کی ابتدائی حالتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں زیادہ مفید اور معتبر یہ ہیں۔ علم ہیئت۔ طبقات الارض۔ آثار قدیمہ۔ علم نباتات قدیمہ۔ تشریح الابدان۔ علم الاقوام۔ تہذیب الاقوام۔ قصص۔ سوانح (اس میں پرانے زمانے کی کتب نظم۔ افسانے۔ اور تذکرے بھی شامل ہیں) اور سب کے آخر میں علم تاریخ۔ اور علم السنّین

(Astronomy, Geology, Archeology, Palaentology, Anthropology, Ethnology, Ethnography, Tradition, History and Chronology).

شاید نظر اول میں ان مذکورہ علوم کا فائدہ آغاز ہستی کی بابت سمجھنا دشوار ہو۔ مگر ذرا غور کرنے سے اس کی پوری توضیح ہو سکتی ہے ✦

(۱) علم ہیئت۔ یعنی وہ علم جو اجرام فلکی کے نظامات۔ حرکات اور خصوصیات پر بحث کرتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور ضروری حصّہ نظام شمس کے متعلق ہے۔ جسکا ایک چھوٹا اور ادنےٰ رکن زمین ہے گیلیلیو[1] اور کوپرنکس[2] (Galileo and Copernicus)

[1] (۱۵۶۴-۱۶۴۲) اٹلی کا ایک نہایت مشہور حکیم اور فلسفی جس نے پینڈیولم کی حرکتوں کے مساوی الوقت ہونے کا اصول دریافت کر کے گھنٹے ایجاد کئے۔ دوربین کو بھی اس نے بہت ترقی دی۔ چنانچہ اس کی بنائی ہوئی ۳۲ گنا طاقت کی دوربین سے علم ہیئت اور نجوم کی تحقیقات میں ایک نئی جان پڑ گئی ۱۶۳۲ء میں اُس نے اپنی مشہور کتاب علم ہیئت پر لکھی جس میں نظام شمسی کے متعلق اُس نے کوپرنکس کی رائے کی تائید کی تھی۔ اسی بنا پر اُس پر الحاد کا الزام لگایا گیا۔ اور مجبوراً اُس کو اپنے عقیدے سے انکار کرنا پڑا جس سے اُس کی جان بچی۔ آخر ۸ جنوری ۱۶۴۲ء کو اُس کا انتقال ہوا ✦

[2] (۱۴۷۳-۱۵۴۳) جرمنی کا مشہور فاضل ہیئت جس نے فضلائے یورپ میں سب سے پہلے نظام شمسی کی بابت بطلیموس کی رائے کو غلط ثابت کر کے فیثا غورث کے خیال کی تصدیق کی ✦

کے زمانے سے اب تک یہ علم ترقی کے بہت سے زینے طے کر چکا ہے۔ جن میں سے سب سے آخری وُہ ہے جسے اصطلاح حال میں۔ ہیئت جدید کہتے ہیں۔ اور جس کی غرض نظام شمس کے اجزا اور حقیقت کی چھان بین کرنا ہے۔ اس عظیم الشان تحقیق کا ایک جزو ترتیب آفرینش کا پتہ لگانا ہے۔ مجازی عبارت اور شاعرانہ طرز ادا کے مطابق جو اس حصّے نے اپنے لئے اختیار کر رکھی ہے۔ اس کا منشا اجرام سماوی کی پیدائش۔ طفولیّت۔ شباب۔ کہولت۔ پیری اور موت کے متعلق ہے۔ ان مراتب کی خاطر خواہ تحقیق کی جا چکی ہے۔ اور یہ یقینی بات ہے۔ کہ ایک ایک سیارہ اپنی ابتدائی حالت سے حالت ارضیت تک کے تغیّرات میں ان تمام مراتب کو طے کرتا ہے۔ یہ بات اچھّی طرح واضح اور ثابت ہو گئی ہے۔ کہ وہ عجیب و غریب شے جس کا نام زندگی ہے۔ صرف خاص خاص مراتب نجمی میں پائی جاتی ہے۔ اور اس کا وجود ان مراتب کے وجود پر مبنی ہے۔ صاف لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ سیّاروں کے عالم طفلی میں وہاں زندگی کا وجود ممکن نہیں۔ کیونکہ ایسی حالت میں بعض ایسے اسباب موجود ہوتے ہیں۔ جن کے ہوتے زندگی کسی صورت میں بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس میں شک نہیں کہ ہر ایک سیّارہ میں درست قابلیّت ارضیّت حاصل ہونے سے پہلے بہت سے تغیّر و تبدّل ہوتے ہیں۔ جن میں حیات کی کوئی طرز بھی ممکن نہیں ہوتی۔ آخرالامر ایک خاص حالت میں بعض اشیا پیدا ہوتی ہیں۔ جن کو زندہ یا ذی حیات کہہ سکتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد اس طبقے سے ذرا اور ترقّی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اس نئی دنیا میں ایسے جاندار پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو اس کی سطح کو بساتے ہیں۔ اس کے پانی میں تیرتے ہیں۔ اور اس کی ہوا میں اُڑتے ہیں۔ یعنی جو عرف عام میں بھی جانور کہلانے کے مستحق ہیں۔ یوں ہم تاریخ کواکب کے اس رتبے تک پہنچتے ہیں۔ جسے عالم حیات کہتے ہیں۔ عالم حیات کے درجہ ترقّی میں نوع انسان کی طرح عقلمند جانوروں کا وجود امکان رکھتا ہے۔ اور پھر ایک مدّتِ دراز تک یہ سیّارہ اُن ترقّی یافتہ جانوروں کا مسکن رہتا ہے۔ جو ہماری طرح عقل تمیز اور ہوش رکھتے ہیں۔ اور اشرف المخلوقات ہونے کے مدعی ہوتے ہیں۔ یہ مدت حیات مختلف سیّاروں

ہیں مختلف ہوتی ہے۔ علم ہیئت اس مدت کے پرے کے حالات کا قیاس کرنے سے نہیں رُکتا۔ اور صاف بتاتا ہے کہ کچھ دن بعد حالت ارضیت ضعیف ہو جاتی ہے۔ اور اس سیارے کے جاندار نابود ہوتے جاتے ہیں۔ گویا وُہ سیارہ مرجاتا ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ جہاں تک یہ تحقیق قیاس صحیح۔ اور واقعات موجودہ کے علمی نتائج خود ہمارے سیارۂ زمین کی حالت ارضیت کے آغاز اور انجام کا سراغ لگانے میں مدد دیں وہیں تک علم ہیئت نوع انسان کی قدامت۔ اس کے زمانۂ بے خبری کی طوالت اور اس کے ابتدائے آفرینش کے وقت کے معلوم کرنے میں ایک مفید اور عمدہ ذریعہ ہے +

(۲) علم طبقات الارض۔ جہاں علم ہیئت حیات کوکبی اور حیات بشری کی بحث تمام کرتا ہے۔ وہیں سے وسیع اور معتبر علم طبقات الارض اس مضمون کو شروع کرتا ہے۔ علم اوّل الذکر تمام ستاروں اور اُن کے باہمی انتظام پر حاوی ہے۔ مگر دوسرا علم صرف ہماری زمین ہی کی بابت تحقیق کرتا ہے۔ اس کی غایت یہ ہے۔ کہ ان تمام کیفیات کا سراغ لگائے جو اس زمین پر ہیولائے ابتدائی سے الگ ہونے سے لیکر اب تک گزری ہیں۔ اس تفتیش کے ضمن میں حیات ارضی کی تمام مختلف طرزوں کی مادی حالتیں بھی آجاتی ہیں۔ کیونکہ زندگی کی ہر صورت حالات و کیفیات ارضی سے وابستہ ہے۔ اگر طبقات زمین کا پورا علم یعنی اس سیارے کے مختلف تغیّرات کی صحیح تاریخ دریافت ہو سکے تو ابتدائے حیات کی صحیح جگہ معلوم ہونا چنداں دشوار نہیں ہے +

تغیرات ارضی کی تاریخ کے مختلف درجے عالم زندگی کی تاریخ کے طبقوں سے ہم قدم ہوتے ہیں۔ اور عالم زندگی میں نوع انسانی کا درجہ اس سیارے کی مادی کیفیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اس عالم کے ہر طبقہ والے زمین پر اپنے نقش قدم چھوڑ گئے ہیں۔ جو زمانہ آیندہ کے ذہنوں اور عقلوں کے لئے گویا تحریر کا کام دیتے ہیں۔ اور بتدریج آنے والے جانداروں کی ابتدائے ہستی اور تغیّر و تبدّل یا ترقّی و تنزّل کے گوناگوں مدارج کے وقت ظہور اور حالات وقوع پر شاہد صادق ہیں +

Marfat.com

(۳) علم آثار قدیمہ۔ جو تعلق علم طبقات الارض کو ہیئت سے ہے وہی آثار قدیمہ کو طبقات الارض سے ہے۔ عالم حیات کے وجود اور نتیجے کی جو شہادتیں طبقات زمین یا اجرام فلکی سے ملتی ہیں۔ وہ اگرچہ واضح اور نمایاں تو بہت ہیں مگر خود ان رہنے والے جانداروں کی پس ماندہ نشانیاں نہیں ہیں۔ اس سے مذکورہ علوم ان کو نایاب اشیا کے وجود ماضی کی دلیل گردانتے ہیں۔ لیکن ان علامتوں اور نشانوں کے علاوہ خود ان جانداروں کے ڈھانچے وغیرہ بھی ملے ہیں جو وقتاً فوقتاً اس زمین پر رہتے سہتے تھے +

ہماری اپنی نسل نے بھی اپنا ورثہ چھوڑا ہے۔ زمین انسانی یادگاروں (بقیوں) سے بھری پڑی ہے۔ کیونکہ آدمی بھی جہاں کہیں بسے وہیں اپنی نشانیاں چھوڑ گئے۔ اس اعلےٰ درجے کے عقلمند اور باتمیز طبقہ حیوانات میں جس کی ہم خود ایک زندہ مثال اور سچا نمونہ ہیں۔ یہ بات فطری تھی کہ اس کے افراد اشیائے قدرتی کو لے کر درست کرتے اور اپنے لئے کارآمد بناتے تھے اور نقل مکان کرتے ہوئے یا مرتے ہوئے یہیں پھینک جاتے تھے۔ اس طرح زمین کا کوئی طبقہ اور کوئی حصہ انسانی یادگاروں سے خالی نہیں۔ اور ان میں سے اکثر ایسے مادوں کی بنی ہوئی ہیں جن کا مٹنا ہزاروں برسوں میں بھی مشکل ہے۔ نہ یہ ممکن ہے کہ موجودہ نسل انسانی ان پرانی نشانیوں کو پہچاننے میں دھوکا کھائے۔ کیونکہ ان سب کی بناوٹ سے ایک خاص لیاقت اور نمایاں عقل ظاہر ہوتی ہے۔ جو ان کو اور جانداروں کے بقیوں سے ممتاز کرتی ہے۔ باقیات صالحات انسانی کی تفتیش اسی صدی میں شروع ہوئی ہے۔ جس کا نتیجہ علم کا وہ کشادہ اور فراخ میدان ہے۔ جسے ارکیالوجی یا آثار قدیمہ کہتے ہیں۔ اس کی دو قسمیں ہیں ایک کا تعلق زمانۂ جدید سے ہے اور دوسری کا زمانۂ قدیم سے۔ یہاں ہماری مراد زمانہ جدید سے وہ زمانہ ہے جبکہ مختلف اقوام انسانی کم و بیش اپنے حالات و خیالات کو نقش و نگار یا عمارات و مینار کی صورت میں ظاہر کرنے لگیں۔ اور جس کو نوع کی طفولیت کہہ سکتے ہیں۔ اور زمانہ قدیم سے وہ وقت جو حافظہ انسانی کے دھندلے سے دھندلے خیال سے بھی پرے واقع ہے۔ اور جبکہ ہمارے آباؤ اجداد

Marfat.com

خواب غفلت میں پڑے تھے +

اپنے اصول اور طرز تحقیق میں یہ علم انسانی صنّاعیوں کے ساتھ خاص ہے۔ جن پر ان کے آس پاس کے طبقات زمین کے لحاظ سے غور کیا جاتا ہے۔ انسانی دستکاری کا ہر ایک نمونہ ان قدیمی نباتات اور حیوانات کے بقیوں میں گھرا ہوا ہوتا ہے۔ جن کی ترتیب اور تدریج علم طبقات الارض پہلے ہی معلوم کر چکا ہے۔ اس سے خود ان کی بابت بھی اندازہ کرنے میں چنداں غلطی کا احتمال نہیں ہے۔ اس علم کا اصل اصول یہ ہے کہ ترقّی انسان کے مختلف طبقوں کی صنعت گری اور دستکاری میں اور اس سرزمین کی تاریخ میں جہاں وہ پائی گئی ہیں۔ ایک خاص وابستگی اور تعلّق ہے۔ اس سے واضح ہے کہ یہ علم ابتدائے آفرینش نوع کے محقق کے لئے کس قدر بیّن اور معتبر شہادتیں مہیّا کرتا ہے +

(۴) علم نباتات قدیمہ یہ علم آثار قدیمہ سے بہت مِلتا جُلتا ہے۔ اور اس کی غرض یہ ہے۔ کہ اس دنیا کے قدیم اور نایاب نباتات اور حیوانات کی بناوٹ۔ طرز و روش اور جماعت بندی کے متعلق دریافت کرے۔ یہ علم ان کو ان کے زمانہ وقوع و ظہور کے لحاظ سے درجہ بدرجہ منقسم اور مرتب کرتا ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کہ زندگانیٔ حیوانی اور حیات نباتی میں ایک خاص تعلق ہے۔ اور یہ کہ جاندار اشیا کا انحصار بے جان چیزوں پر ہے۔ اس تحقیق کے لئے نہ صرف زمین کی سطح بلکہ اندر کا پرت تک بعض جگہ سے کھود کر تفتیش کا حق ادا کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ارکیالوجی کی طرح (جس کی یہ علم ایک فرع ہے) یہ بھی آخر میں طبقات الارض ہی پر موقوف اور منحصر ہے۔ آگے چلکر اس علم کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ علم حیوانات یا (Zoology) اور علم نباتات یا (Botany) کیونکہ دونوں نامے قدیم کے حیوانات اور نباتات کی بدلی ہوئی صورتیں اور بگڑے ہوئے نمونے ہیں۔ اس علم کی تحقیقات بھی اکثر جگہ انسان کے وجود اور حالت کے ابتدائی زمانے کے بیان سے ٹکراتی ہے۔ کیونکہ یہ علم انسان کو حقیقت میں ان جانوروں کا ترقّی یافتہ اور مکمل نمونہ قرار دیتا ہے۔ جن کی قدامت چٹانوں میں اور جن کی آج کل کی نگے دو ہماری خشک زمینوں اور گہرے سمندروں پر ہوتی ہے۔ اس طرح یہ علم بھی انسان

قدیمی کے ہمعصر جانوروں کی بحث اور کبھی کبھی خود آفرینش انسان کے زمانے کا ذکر کر کے ہمارا ہاتھ بٹاتا ہے +

(۵) علم تشریح الانسان۔ یہ پانچواں علم ہمارا ایک نو پیدا شدہ معاون ہے۔ یہ اتنا نیا ہے کہ ابھی اچھی طرح اس کی تشریح اور توضیح بھی نہیں ہونے پائی۔ یہ انسان کو تاریخ قدرت (Natural History) کا ایک جزو سمجھتا ہے۔ اور سب سے پہلے اس کی مادی اور جسمانی کیفیت پر غور کرتا ہے۔ اور اس کو ایک قسم کا جانور مان کر اس کی شکل و شباہت۔ خو۔ بو۔ طرز و روش اور باہمی تعلقات پر بحث کرتا ہے۔ اس طرح علم طب (Physiology) اور تشریح الابدان (Anatomy) اس کی دو شاخیں ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ نیا علم انسان کی دماغی اور اخلاقی حالت کو بھی لیتا ہے۔ اور تمام تغیراتِ قلبی اور ان اصول و امور کی تحقیق کرتا ہے۔ جن کو علمی اصطلاح میں علم النفس (Psychology) کہتے ہیں +

یہ علم گزشتہ حالات پر غور کر کے تاریخ کا ایک معاون بن جاتا ہے۔ کیونکہ یہ اُن تمام مختلف درجوں اور زینوں کی تحقیق کرتا ہے۔ جو انسان طے کر آیا ہے۔ یہ نوع کی ابتدا کا سراغ بھی لگاتا ہے۔ یہاں تک کہ آثار قدیمہ کی حد سے جا لگتا ہے۔ اور اس علم کے ساتھ زمانہ قدیم کی انسانی یادگاروں میں حصہ بٹاتا ہے۔ اور اس تقسیم کی صورت یہ ہے کہ افعال انسانی کی یادگاریں آثار قدیمہ کو مل جاتی ہیں اور ذات انسانی کے بقیے اس علم کے ہاتھ لگتے ہیں۔ اور اس طرح دونوں علم ایک دوسرے کے ہمدست و ہمداستاں ہو جاتے ہیں +

اس میں شک نہیں کہ زمانہ قدیم کے انسانی بقیے اب تک پائے جاتے ہیں یہ اکثر ہڈی کی قسم سے ہوتے ہیں۔ اور بآسانی ان چیزوں سے جدا کئے جا سکتے ہیں۔ جو انسانی صنائع کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً انسانی اوزار۔ برتن۔ یا پہننے کی چیزیں۔ گو یہ سچ ہے کہ زمانہ قدیم کے آدمی کی کھوپری یا کوئی اور ایسی ہی ہڈی اور اس کی مستعمل پتھر یا کانس کی کدال اس کی قدامتِ وجود اور ایک حد تک اس کے زمانہ وجود کی کافی دلیل ہیں۔ مگر حقیقت میں غور کیا جائے۔ تو یہ دونوں بالکل مختلف علموں کے متعلق ہیں۔ ایک خود ساخت انسانی کا جزو ہے۔

Marfat.com

اور دوسری گویا اس کی تہذیب کا ایک نمونہ۔ ایک اس علم کے متعلق ہے۔ اور دوسری تاریخ آثار قدیمہ کے متعلق۔ یہ بات صفحات آیندہ میں واضح ہوگی کہ اس علم نے کہاں تک انسان کے آغاز ہستی پر روشنی ڈالی ہے +

(۶) علم الاقوام۔ یہ علم ایک حیثیت سے مذکورۂ بالا تحقیقات کی ایک شاخ ہے اور اس کا مقصد یہ ہے۔ کہ نوع انسان کی مختلف قوموں۔ خاندانوں۔ اور نسلوں کی خو بو۔ طرز انداز۔ میل جول اور حسب نسب اور عام خصوصیات کی بابت مطالعہ کرے۔ وہ حالات جسمانی جو نوع انسان پر اثر ڈالتے رہے ہیں۔ وہ مدارج تہذیب جو اس نے طے کئے ہیں۔ وہ تمدنی زندگی کے مختلف پہلو جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اور ترقی کے وہ قدرتی قانون جن کے موافق ہماری نوع اُس ابتدائی حالت سے اس انتہائی حالت تک پہنچی ہے۔ یہ تمام مسئلے اس علم کے زیر بحث ہیں +

اس کی ابتدا ان دستکاریوں سے ہوتی ہے۔ جو قدیمی انسان کی نہایت ہی سادہ طرز زندگی کی ادنےٰ ضرورتوں اور پست ترین حاجتوں کے لئے کافی تھے۔ اور اس کی انتہا ان صناعیوں پر پہنچتی ہے۔ جو آجکل کے موجدوں کی نہایت ہی جانکاہ محنتوں اور نہایت ہی نازک کوششوں کے لئے آلات فراہم کرتی ہیں۔ یہ علم اپنے عمل میں بڑی محنت اور بڑا تحمل چاہتا ہے۔ اس کا احاطہ بھی بہت وسیع ہے۔ کیونکہ انسانی تمدن کا کوئی شعبہ اس کی تحقیق سے بچا ہوا نہیں۔ کبھی یہ اس بات پر غور کرتا ہے کہ ابتداً انسانی زندگی دنیا میں کس قسم کی خوراک سے قائم رکھی گئی۔ اور کبھی یہ کہ مختلف اقوام انسانی نے توالد و تناسل کے لئے اتحاد زن و مرد کے متعلق کیا کیا رسم و رواج اختیار کئے۔ اور کیونکر تعلق زن و شوئی کے قاعدے اور قانون وحشیانہ رنگ سے مہذبانہ لباس میں آئے۔ کبھی یہ زبانوں کے مسئلے کو لیتا ہے۔ اور ان تمام زبانوں کے اختلاف کو سوچتا ہے۔ جن میں کہ انسانی قوموں نے اپنے خیال۔ عقیدے اور آرزوئیں ادا کی ہیں۔ حکومت اور ان تمام ملکی اور تمدنی قانون پر بحث کرنا بھی اسی کا کام ہے۔ جو انسان کے لئے تجربے اور عقل صحیح نے مختلف وقتوں میں باہمی معاشرت اور مشارکت کے لئے وضع کئے

Marfat.com

ہیں۔ اور سب سے آخر میں یہ مذہبوں کی چھان بین کرتا ہے۔ جن کی صورتوں کی گوناگونی کی یہ کثرت ہے۔ اور اس کثرت پر بھی اکثر باتوں میں شرکت ہے۔ اور جن سے روح انسانی کے بیم ورجا اور عقیدے اور مدعا ظاہر ہوتے ہیں۔ جب کہ وہ اس دار ناپائدار سے بیزار۔ اور ملک ابدی کی آرزو میں بیقرار ہوتی ہے۔ اس طرح اس علم کی تحقیقات سے بھی آدمی ان راستوں کو دیکھ سکتا ہے۔ جن سے انسان اپنی ابتدائی حالت سے یہاں تک پہنچا ہے۔ اور یوں بالواسطہ اس کے ابتدا کے وقت اور حالات کی تحقیق ہوتی ہے ٭

(۷) علم تہذیب الاقوام۔ علمائے حال نے تجویز کیا ہے کہ علم الاقوام کے اس حصے کو جو قوموں کی عادات ورسوم اور قانونوں پر بحث کرتا ہے۔ اصلی علم سے الگ کرکے تہذیب الاقوام یا اتھنا گرافی نام دیں۔ ایک کا کام محض بیان ہے۔ دوسرے کا منشا اس کی تشریح وتوضیح ہے۔ پہلا حصہ انسانی عادات ورسوم کا صرف ذکر کرتا ہے۔ دوسرا ٹکڑا ان باتوں کی فلسفیانہ توجیہہ وتاویل کرتا ہے۔ ان دونوں میں ویسا ہی تعلق ہے۔ جیسا جغرافیہ اور طبقات الارض میں۔ اگرچہ فرق ایسا نمایاں اور واضح نہیں ہے۔ لیکن تہذیب الاقوام کا مطالعہ علم الاقوام کی نسبت زیادہ آسان اور سطحی ہے۔ انسانی زندگی کی اشیا مل جائیں۔ تو ان کو ان کے متعلقہ مضامین کی حیثیت سے مرتّب کرنا چنداں مشکل نہیں۔ لیکن ان مہتم بالشان واقعات کی تفصیل کے لئے جن میں مختلف اقوام انسانی کی تاریخ کا ماخذ ہے۔ زیادہ وسعت نظر اور قابلیت تحقیق وتدقیق کی ضرورت ہے۔ پس جہاں تک علم تہذیب الاقوام مختلف انسانی قوموں کے حالات اور ان کے باہمی مباہنت کے واقعات بیان کرتا ہے۔ وہیں تک یہ ہماری تحقیق میں ہماری مدد کرتا ہے ٭

(۸) قصص وسوانح۔ اس طرح آخر مختلف علوم عالم کو دیکھتے بھالتے ہم تاریخ ارضی سے تاریخ انسانی تک پہنچتے ہیں۔ ہر فرد کی زندگی کی طرح قوم اور نسل کی زندگی میں بھی آخر ایک وقت آتا ہے۔ جب اس کے قوائے دماغی کام کرنے لگتے ہیں۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ فرد کی زندگی میں اس وقت کے آتے ہی وہ اپنے آپ کو سمجھنے لگتا ہے۔ اور اپنے واقعات وحالات پر غور کرنے اور ان کو کچھ کچھ یاد رکھنے

لگتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح قوم کی زندگی میں بھی اس وقت سے اس کے باہمی واقعات پر ایک طرح کی بحث و گفتگو ہونے لگتی ہے۔ جس کو ہم قصص و سوانح کہتے ہیں۔ آدمیوں کا وہ مجمع ایک قوم بن جاتا ہے اور خود اپنے متعلق سوچنے لگتا ہے۔ اور قوم کے سب سے زیادہ عقلمند اور تیز ذہن افراد روزمرہ کی باتوں اور پرانی کہانیوں سے پہلے کچھ بے جوڑ اور بعد میں ایک سلسلہ وار حالات مرتب کرتے ہیں ٭

اس طرح قصص و سوانح زندگی قوم کے ہوش میں آنے کا پہلا ذکر ہوتے ہیں۔ اور یہ ذکر اور ہر قسم کے علمی تذکروں سے مقدم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ سب سے پہلے انسانی داستان گو نے نظم کو استعمال کیا ہو۔ مگر مضمون ضرور اس کا ذکر ماضی ہی ہوتا ہے۔ اور یوں انسانی زندگی کا بیان شروع ہوتا ہے۔ یقیناً پہلے حالات خود ان کی اپنی قوم سے خاص ہوتے ہیں۔ اور فسانہ گوئی کی طاقت پورے زور سے کام کرتی ہوتی ہے۔ سچے جھوٹے ہر قسم کے حالات گڈمڈ ہوتے ہیں۔ غرض اس قومی صبح کا مورّخ حکیم اور گویّا تذکرہ نویس اور داستاں گو وغیرہ سب کی معجون مرکب ہوتا ہے۔ مگر اس کا ہر ایک قول قومی دماغ میں جڑ پکڑ لیتا ہے۔ یہ بالکل صحیح اور معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اور پیچھے آنے والے شاعر اور تذکرہ نویس اسے سند سمجھتے ہیں۔ اور حالات کا دفتر پھیلتا چلا جاتا ہے۔ اگرچہ بعض باریک بین مصنّف اس میں کاٹ چھانٹ بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر حقیقت کو کہانیوں سے الگ کرنے کے لئے عمریں چاہئیں۔ آخر آدمی ترقّی کرتے کرتے تہذیب اور تعلیم کے اعلےٰ پائے تک پہنچتے ہیں۔ قوائے دماغی اور بہت سے علموں کے خزانے کھول دیتے ہیں۔ مختلف قومیں ایک دوسرے پر اثر کرتی ہیں۔ ملکی اور سیاسی امور کا جال جنجال بن جاتا ہے۔ یہ سب کچھ سہی مگر پرانے زمانے کی تاریخ کے بناوٹی قصے اسی طرح زبان زد رہتے ہیں۔ اور باقی حصّے کو بھی رنگین رکھتے ہیں۔ مگر قصص اور سوانح میں فرق کیا ہے۔ کیا یہ دونوں متحد نہیں ہیں۔ کیا ان کا ٹھیک فرق واضح کرنا ممکن ہے۔ کیا ان دونوں انسانی دماغ کے نتیجوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے ان پر غور کر سکتے ہیں؟ ہاں یہ ممکن ہے۔ کیونکہ اس میں شک نہیں کہ یہ دونوں چیزیں ایک ہی شے نہیں

Marfat.com

ہیں ۔ مگر پھر بھی یہ ایک دوسرے سے اتنی وابستہ اور پیچیدہ ہیں کہ ان کا امتیاز کرنا بھی آسان نہیں ۔ قصّے گزشتہ امور کے وہ تذکرے ہیں ۔ جو فقط بعد نسل انسانی حافظے اور گفتگو کے ذریعے سے زبان زد ہوتے آئے ہیں ۔ ان کا وجود انہیں طاقتوں پر مبنی ہے ۔ اور ان کی بقا بار بار دوہرانے پر منحصر ۔ اگر یہ قصے حوالۂ قلم بھی کر دئے جائیں تو بھی اُن کی حالت میں کچھ فرق نہیں پڑتا اور یہ سوانح کا رتبہ حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ اگر واقعہ ایک نسل سے دوسری نسل تک بھی زبان زد رہا ہے تو پھر اس میں قصّے کی خصوصیات راسخ اور ناقابل محو ہو جاتی ہیں +

اس بیان سے یہ بات واضح ہے کہ قصوں کا اعتبار اس وقت کے لحاظ سے ہوتا ہے ۔ جو وقوع واقعہ سے لیکر قصہ کے قلمبند کئے جانے تک گزر چکا ہے ۔ اگر یہ وقت زیادہ ہو تو قصّہ بالکل قابل اعتبار نہیں ۔ کیونکہ جب تک کوئی بات صرف انسانی یادداشت اور بیان پر مبنی ہو ۔ تب تک وہ کسی طرح کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ سے بچ نہیں سکتی ۔ لیکن اگر یہ تھوڑے ہی دن یا زیادہ سے زیادہ ایک پشت بعد تحریر سے مضبوط کر دی گئی ہے ۔ تو وہ حقیقی تاریخ کے قریب قریب ہی معتبر خیال کی جا سکتی ہے +

یہاں طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقع میں ہر ایک تاریخ اور تذکرہ انجام کار قصّوں پر مبنی نہیں ہے ؟ فی الحقیقت خواہ واقعہ کتنا ہی قریب الوقوع کیوں نہ ہو اسکی تاریخ کا مصنّف کے دماغ میں سے گزر کرنا لازمی اور لابدی ہے ۔ اور اسی واسطے اس کا آدمی کی ذاتیات سے متاثر ہونا بھی ضروری ہے ۔ لیکن اگر مصنف نے کوئی چشم دید واقعہ راست راست بے کم و کاست قلمبند کیا ہے تو غلطی کا احتمال اتنا کم ہے کہ نظر انداز کیا جا سکتا ہے ۔ مگر واقعی تاریخ کے لئے صرف مصنّف کا معائنہ اور راست بیانی ہی کافی نہیں ۔ بلکہ اور بھی کئی خوبیاں ہونی چاہئیں ۔ آج کل اس اہم کام کی تعریف میں نئی نئی شرائط بڑھائی جاتی ہیں ۔ جن سے تاریخ کا دائرہ روز بروز تنگ ہوتا جاتا ہے ۔ سب سے بڑی خوبی مصنف کے لئے یہ ہے کہ اس کے اپنے ذاتی خیالات واقعے

Marfat.com

پر مطلق رنگ نہ چڑھائیں۔ اور وہ خود اپنی کتاب میں اتنا ہی نامعلوم رہے۔ جتنا کہ شیکسپیر ہیملٹ میں اس میں شک نہیں کہ مورخ اظہار واقعات کا واسطہ ہے مگر اس بیان پر اس واسطے کا مطلق اثر نہ پڑنا چاہیئے۔ عکسی تصویر کے لئے فوٹو گرافک کیمرا لازمی ہے۔ مگر یہ نہیں ہوتا کہ تصویر میں اس کیمرے کی بھی صورت ہو۔ نقش میں نقاش کے ہاتھ۔ آنکھ اور برش کی ضرورت ہے مگر کیا نقش میں ان میں سے بھی کسی چیز کا نقش ہوتا ہے؟ نہیں۔ پس بعینہٖ یہی حال مؤرخ کا بھی ہونا چاہیئے +

لیکن ہم نفس مضمون سے دور جا رہے ہیں۔ یہاں قصوں اور تذکروں کا فرق دکھانا مطلوب نہیں ہے۔ بلکہ یہ جتلانا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ابتدائے آفرینش کے متعلق کیا کہتی ہیں۔ اور یہ کام قصّوں کا ہے۔ پرانے آدمیوں کا دماغ اپنی ابتدائی حالت کے دھندلے دھندلے نقشے سے بھرا ہوا تھا جو خواب کے مضمون سے بہت کچھ ملتا جلتا تھا۔ اور جس کا خاکہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی کہاوتوں اور بڈھوں کے گیتوں سے کھینچا تھا +

قدیم زمانے کے انسان خاموشی پسند نہ تھے۔ اور گو بعض قومیں نسبتاً ایسی لسّان نہ تھیں مگر اکثر ترقی یافتہ اور ذہین فرقے اس قدر پُرگو ہوتے تھے کہ شاید آج کل انہیں بکواسی کہتے۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو میں اکثر ابتدائے آفرینش کا ذکر چھڑ جاتا ہوگا۔ اور یہی گفتگو آگے چل کر ان قصّوں کا مضمون بن گئی۔ کیونکہ وہ لوگ بھی بچّوں کی طرح اپنی نسل کی ابتدا کا پتہ لگانے کے دلدادہ اور خواہاں تھے +

اس کے علاوہ ان کی نئی نئی دماغی طاقتوں کے سامنے قدرت کا میدان وسیع پڑا تھا۔ جس میں انسان کے سوا اور ہر چیز بھی دلچسپ اور تشریح طلب تھی۔ جس کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ کہانیوں۔ افسانوں اور قصوں کا ایک انبار جمع ہوگیا اور پھر ان میں اقوام اور افراد کے مختلف تصورات سے ایک عجیب گوناگونی پیدا ہوگئی۔ ہاں اس ایک بات پر البتہ سب متفق تھے۔ کہ انسان کی پیدائش کے وقت۔ جگہ اور کیفیت کی کچھ نہ کچھ تفسیر ضرور کرنی

چاہیئے۔ اس بات پر بھی سب متحد تھے کہ کسی نہ کسی طرح اس کی پیدائش ضرور ہوئی اور ہر ایک کی نظروں میں زمین اور آسمان کی وہ حالت چھا رہی تھی جس میں انسان کا وجود معدوم تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر قوم نے خود اپنے قیاس۔ اپنے بزرگوں کے قول اور واقعات موجودہ کی مناسبت کے لحاظ سے آغاز انسانی کے متعلق کچھ نہ کچھ قصّہ بنا کر دل کی تسلّی کر لی۔ اگرچہ ایک حیثیت سے ان میں سے ہر قصّہ ایک نئے انداز اور ایک نرالے ڈھنگ کا تھا۔ مگر ان میں بعض باتیں مشترک بھی ضرور تھیں اور یہی مشترک باتیں زمانۂ جدید میں بھی ایک مدت مدید تک مسلم اور مستند مانی جاتی رہیں +

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قصّوں نے ابتدائے زمانۂ قدیم کے متعلق انسانی دل و دماغ پر کتنا گہرا اثر کیا ہے۔ آج کے دن تک بھی یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ تمام عقل و قیاس انسانی ان قصّوں کے آگے سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ اس لئے ان اہم سوالات کی تفتیش و تحقیق کرتے ہوئے ہم قصّوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے +

اس کے آگے تذکروں اور تاریخ کا میدان ہے۔ جس طرح تذکرے انسان کے دماغی کاموں میں سب سے مقدم اور سب کے پیشرو تھے۔ اسی طرح اب تاریخ سب علوم سے موخر اور سب کے نتائج کی نگران اور ترتیب دینے والی ہے۔ اور پہلے کی طرح اب تک بھی ان سوالوں کے جواب کا بار اُسی کے سر پر ہے۔ اس کی بلند پروازی نے تمام علوم عالم کو اپنے پروں کے نیچے لے رکھا ہے۔ گویا ان میں سے ہر ایک اس کے لئے سامان مہیا کرنے میں کوشاں ہے۔ سچّی تاریخ حقیقت میں ان تمام باتوں کا ماحصل ہے جو انسانی دل و دماغ میں گزری ہیں۔ اور جو انسانی محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ اگر یہ کامل ہو جائے۔ تو نہ صرف انسان کے آغاز کا عقدہ حل ہو جائے۔ بلکہ انجام کا بھی حال کھل جائے۔ فی الوقت ہم مقر ہیں کہ ہماری کشش و کوشش آغاز کا ہی کچھ زیادہ پتہ نہیں لگا سکتی انجام تو دور ہے۔ اور نہ ابھی امید ہے کہ یہ علم العلوم ان دونوں طرفوں میں کچھ بہت آگے بڑھ سکے۔ ہاں آغاز کی بابت جس قدر واقفیت ہماری عقل اور

ہمارا ذہن مہیّا کر سکتا ہے۔ وہ ناظرین کی خدمت میں ہے +

(۹) کرونالوجی یا علم السنین ۔ یہ علم بھی تاریخ عام کا ایک جزو ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس علم کا ماحصل اور نتیجہ ہے۔ اصطلاح قدیم میں وقت کے معیار کو کرونالوجی سے تعبیر کرتے تھے۔ لیکن اصطلاح علمیہ حال کے مطابق اس سے "تاریخ عالم کے ترتیب واقعات کا لحاظ رکھنا" سمجھا جاتا ہے۔ اس کا کام یہی نہیں ہے کہ خاص امور کی ٹھیک تاریخ وقوع دریافت کرے۔ بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کی باہمی ترتیب کی بھی تحقیق کرے۔ فی الواقع یہ ترتیب اور مختلف باتوں کے ہونے کے درمیانی عرصہ کا لحاظ علم تاریخ کا بڑا ضروری حصّہ ہے۔ ہمارے بزرگان نوع اپنے اکثر نہایت دلچسپ بیانوں میں اس ترتیب کو مدنظر رکھتے تھے۔ اگرچہ ٹھیک تاریخ لکھنا بھول جاتے تھے۔ اس سے اس فن کی جدّت میں کلام پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف اس کے طبعی اور فطری ہونے کا ثبوت ملتا ہے +

اس علم کا مبنیٰ اجرام سماوی کا دَور ہے۔ جس میں سب سے مقدم کرۂ زمین کی محوری اور شمسی گردش ہے۔ محض وقت کا تصوّر بیرونی اشیا کے لگاؤ کے بغیر اتنا دشوار ہے کہ نظر اوّل میں اس کی دشواری خیال میں بھی نہیں آتی۔ زیادہ صاف الفاظ میں ہمارا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم چاہیں کہ بے دن رات۔ ماہ و سال وغیرہ کو ذہن میں لائے اُس شے کا تصوّر کریں جسے عرف عام میں "وقت" کہتے ہیں۔ تو یہ بات تقریباً ناممکن ہوگی۔ مثاید یہ مثال اس کی توضیح کرے کہ گوہر بینا شخص روشنی کو جانتا ہے۔ مگر فی الحقیقت اگر ہم چاہیں کہ بے ان مادّی چیزوں کے خیال کے جن کو ہم روشنی سے دیکھتے ہیں۔ خود روشنی کو ہی دیکھیں یا تصوّر کریں تو یہ بات آسان نہ ہوگی۔ بہرحال ہم کو ان ذہنی الجھنوں اور دماغی بھول بھلیّوں میں پڑنے کی زیادہ حاجت نہیں۔ کیونکہ ہمارے کرہ کی گردش اور ان انقلابات کے دیکھنے سے جو اس گردش کی وجہ سے اجرام فلکی کے مقاموں میں نظر آتے ہیں۔ ہم وقت کو آسانی سے ماپ سکتے ہیں۔ اگر ہم اس علم کا

Marfat.com

احسان نہ لیں تو تمام گزشتہ کاروبار انسانی ایک عجیب بے ترتیبی اور تذبذب کی حالت میں خلط ملط نظر آئیں۔ اس واسطے ضروری ہے کہ یہ ترتیب مدنظر رکھی جاے۔ اور اس کی ابتدا ابتداے آفرینش انسان سے کی جائے۔ اگر ہم کو وہ ابتدا ٹھیک معلوم ہوجائے تو پھر کچھ مشکل نہیں رہتی۔ بلکہ صرف واقعات مختلفہ کو مرتب کرنا رہجاتا ہے۔ مگر چونکہ اصل سوال ہی ابتداے آفرینش انسان کی تحقیق ہے۔ اس سے ہم کو تمام مذکورۂ بالا مختلف اور وسیع علموں کی مدد کی ضرورت ہوئی۔ تاکہ ہم اگر قطعی نہیں تو کم از کم کسی قدر تخمیناً ہی اس زمانے کا پتہ لگائیں۔ جس سے تمام کاروبار انسانی کی ابتدا اور اس کرۂ زمین کی آبادی کا آغاز ہوتا ہے۔

باب دوم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم ہیئت کی تحقیق

ہم نے پچھلے باب میں مجملاً ان علوم کا ذکر کر آے ہیں۔ جو ہماری موجودہ تحقیق میں مفید اور آئندہ نتائج کے ثبوت ہیں یہ ظاہر ہے کہ اکثر ان علموں کی شہادت اور افادت بالواسطہ ہوگی نہ براہ راست۔ کیونکہ سواے طبقات الارض اور آثار قدیمہ کی چند باتوں کے باقی تمام انسانی تحقیقات جواب تک آغاز ہستیے انسان کی بابت کی گئی ہے۔ وہ بطور نتائج اخذ کی گئی ہے۔ اس کی مثال بعینہٖ ایسی ہے گویا ہم بلندی پر ایک آئینہ کھڑا کریں جس میں دور افق کے نیچے کی چیزیں منعکس ہوں۔ اور باوجود ان تمام علموں کی اعانت کے ہماری حالت ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص اڑتی ہوئی ریل کی کھڑکی میں سے دور کے درختوں اور جھاڑیوں۔ میدانوں اور پہاڑیوں کو بھاگتا ہوئے دیکھے۔

بہرحال حیات ارضی اور حیات انسانی کے متعلق ہمارا موجودہ علم ان لوگوں

Marfat.com

کی طرح ہے۔ جو بچپن میں ہماری ہر بات کی بابت دیکھا کرتے تھے +
اگرچہ بعض جبلتیوں سے ہمارا علم اپنی پیدائش کے وقت اور جگہ اور
اپنے بچپن کے حالات کے متعلق ہمارے اس علم سے جو ہم ان تمام علوم و
فنون کی مدد سے آغاز نوع کی بابت رکھتے ہیں۔ زیادہ واضح۔ صحیح اور
تسلی بخش ہے۔ مگر بعض اور لحاظوں سے دوسرا پہلے سے بڑھا ہوا ہے۔
کیونکہ نہ اس پر کوئی حاشیہ چڑھایا گیا ہے۔ نہ انسانی شہادت کی خامی سے
اس کا رنگ بدلا ہے۔ اور نہ کسی شخص کے ذاتیات نے اس پر اثر ڈالا ہے۔
حالانکہ ہر فرد بشر کے آغاز اور بچپن کے حالات ان تمام باتوں سے متاثر
ہوتے ہیں۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان علموں کی شہادت کو
غنیمت خیال کریں۔ اور دیکھیں کہ فرداً فرداً یہ علوم علم انسانی کے مختلف شعبے
اپنے پیدا کرنے والے کی پیدائش اور بچپن کے متعلق کیا کہتے ہیں +

اگر ہم کسی منجم کے نقطۂ خیال سے نظام شمسی پر نظر کریں۔ تو ہم دیکھینگے
کہ اس نظام کے مختلف رکن حیات کی حیثیت سے مختلف مدارج ترقی پر
ہیں۔ ہم نے یہ مان لیا ہے کہ تمام اجرام فلکی میں اس حالت کے قائم رکھنے
کی قابلیت ہے۔ جسے ہم حیات یا زندگی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ
ہمارے سامنے ہی کی یہ تحقیق کہ فی الحقیقت تمام سیاروں اور ستاروں
کے اجزا بالکل یکساں ہیں۔ اس بات کی کافی دلیل ہے کہ تمام ستاروں اور
سیاروں میں زندگی کے قائم رکھنے کی قابلیت بھی یکساں ہے۔ یہ بات
پوری طرح ثابت ہو چکی ہے۔ کہ نظام شمسی کے متعلق تمام کرے جن میں
سے ایک یہ زمین ہے۔ سب کے سب بالکل یکساں اجزا سے بنے ہوئے
ہیں۔ اور عظیم الشان آفتاب سے لے کر مریخ کے چاند تک ایک ذرہ بھی
ایسا نہیں جو اس یکسانیت سے الگ ہو۔ اس لئے یہ بات مان لینے میں
کوئی عذر نہیں ہو سکتا کہ ہمارے گرد و نواح کے تمام کرے قابل رہائش
ہیں۔ مگر ایک اس سے بھی زیادہ قوی دلیل خود قیاس صحیح ہے۔ اس
آدمی کی عقل بھی طرفہ معجون ہوگی جو بے ردوکد یہ بات تسلیم کر سکتا ہے۔

Marfat.com

کہ زندگی کا وجود صرف اس چھوٹے سے کرۂ زمین پر محدود ہے ۔ ایسی ضعیف الاعتقادی بجز اس کے کہ ہر سمجھدار آدمی کے تبسم کا باعث ہو ۔ اور کس لائق ہے؟ اس خیال سے بڑھکر بیہودہ اور پوچ کیا ہو سکتا ہے؟ کہ یہ نہایت ہی ناچیز اور بے وقعت کُرہ ۔ جس کا اجرام سماوی کے ہجوم میں ڈھونڈے بھی پتہ نہیں ملتا ۔ قیام زندگی کے لئے منظور نظر اور مرغوب خاطر قطعہ قرار دیا جائے ۔ اور باقی تمام کائنات کے کمر وڑہا کروڑ کُرے جن میں سے ایک ایک اس سے ہزاروں گنا بڑا ہے ۔ گویا محض بیکار پڑے رہیں ۔ اور اتنا بے انتہا مادّہ بالکل فضول ضائع کیا جائے ۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝

یہ سچ ہے کہ پرانے آدمیوں کا یہ خیال گو سراپا غلط اور مہمل مگر بالکل طبعی اور قدرتی تھا ۔ اور وہ معذور بھی تھے ۔ مگر آجکل کے ترقّی اور روشنی کے زمانے میں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیونکر اس قدر لچر اور لایعنی خیال ایک منٹ کے لئے بھی کسی دماغ میں آسکتا ہے ۔ اور کیونکر کوئی آدمی اتنا احمق اور کورخرد ہو سکتا ہے جو اس پر اعتبار کرے ۔

فی الجملہ یہ بات ظاہر ہے کہ ان تمام کُروں کا وجود ان کی قابلیّت حیات پر دلالت کرتا ہے ۔ کسی لحاظ سے بھی یہ ممکن معلوم نہیں ہوتا کہ اشیاے مادی محض اپنے لئے پائی جاتی ہوں ۔ اور قیاس صحیح کے نزدیک ہمارے جیسے کسی نظام کے وجود کا اور کیا مدّعا ہو سکتا ہے ۔ سواے اس کے کہ اس میں آثار حیات پیدا کئے جائیں اور آخر کار اس میں عقل و تمیز والے جانداروں کا مسکن ہو ۔ اگر کوئی چاہے اور بنا سکے تو ان ہزاروں نظاموں کی خلقت کی کوئی اور توجیہ بنا کر دکھاے ۔ کوئی معقول اور مناسب توجیہ با خیر معقول نہ سہی ۔ مگر قرین قیاس تو ہو جو ان کے وجود کا کوئی اور سبب بتائے ۔ معترض ذرا اس قسم کی کوشش کر کے دیکھے ۔ اور اس کی ناکامی اس کی غلطی کو ثابت کر دیگی ۔ کائنات مادی کا حال ہی یہ ہے کہ وہ آثار حیات کے اظہار کے لئے مناسب سامان فراہم کرتی ہے ۔ جس کی معراج کمال انسان

جیسے ذی عقل جاندار کی پیدائش ہے +

ہم یہ مانتے ہیں کہ ہماری موجودہ حالت علمی میں ابھی تک کسی کُرے کی آبادی کا کوئی بیّن ثبوت نہیں ملا اور ممکن ہے کہ آئندہ سالہا سال تک یا خود حیات ارضی کے تمام ہونے تک بھی نہ ملے۔ لیکن ہماری تمام ترقیوں کا مدار اس پر ہے کہ ہم قیاس صحیح پر غور کریں اور اس کے احکام پر اعتبار کریں۔ ہم یہ خیال نہیں کر سکتے کہ یہ تمام نظامات عبث اور بیکار ہیں۔ ہم یہ قیاس نہیں کر سکتے کہ ہماری یہ چھوٹی سی زمین اور اسکی بھلائی بُرائی انتظام کائنات میں اپنے عظم و حجم کے اندازے سے بڑھ کر کوئی خاص رتبہ رکھتی ہے۔ اور ہم یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ ہماری ذاتی بہبودی کیلئے قانون قدرت کوئی خاص رعایت یا کوئی انوکھی صورت اختیار کر سکتے ہیں +

اس طرح آخر ہم ان کُروں پر غور کرتے ہیں جن کا ہماری زمین سے ملکر ایک ہی نظام بنتا ہے جن کے ایک ہی سے حالات ہیں۔ جو ایک ہی سے قانون کے زیر اثر ہیں۔ جن میں ایک ہی سے تغیّرات ہوتے ہیں۔ اور جن کا ایک ہی سا انجام ہوتا ہے۔ وہ سیّارے جو فضائے کائنات میں دَور کرتے ہیں بالکل ہماری زمین ہی کی طرح ہیں۔ گو بعض چھوٹے اور بعض لا انتہا بڑے ہیں۔ مگر ساخت۔ خصوصیات اور مدعا ایک ہی ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر ہمارے آس پاس کے سیّاروں اور زمین میں بڑا نمایاں فرق اُن کے موجودہ مدارج ترقّی میں پایا جاتا ہے۔ بعض اس تغیّر و تبدّل کی حالت میں ہیں۔ جو آثار حیات کے وقوع سے پہلے ہر ستارے پر گزرتے ہیں۔ اور جن میں سے ہماری زمین طبقات الارض کے زمانے میں مدتیں گزریں کہ گزر چکی ہے۔ بعض اگر زیادہ تیز روی سے ان حالتوں کو حاصل کر چکے ہیں۔ جن کی طرف ہماری زمین آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر جا رہی ہے۔ اور جہاں پہنچنا اس کو قوانین قدرت کے مطابق ضروری اور لازمی ہے +

سیاروں میں صرف عمر ہی کا اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ ان کی عمر اور عالم حیات کے باہمی تناسب میں بھی فرق ہوتا ہے کسی سیارے کی محض قدامت

Marfat.com

سے اس کی قابلیت حیات کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی - یعنی بعض زیادہ قدیم ستاروں میں یہ تغیرات ایسے آہستہ ہوتے ہیں - کہ وہ بعض اور ستاروں سے جن میں یہ انقلاب نسبتاً جلدی ہوتے ہیں - قیام حیات کی قابلیت میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں - عام طور پر یہ بات بروے تحقیق کہی جاسکتی ہے کہ چھوٹے کرے کروی صورت حاصل کرنے کے بعد نسبتاً بہت جلد اپنے شباب پہنچ جاتے ہیں - اور بڑے بڑے کرے اس حالت تک بہت دیر میں اور بہت آہستہ آہستہ پہنچتے ہیں +

ہیئت جدید نے ہمارے نظام کے ہر ایک تارے کے درجۂ ترقی کا اندازہ لگایا ہے - اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نظام میں تاروں کے لحاظ سے سب سے پرانے تارے مریخ (Jupiter) اور زحل (Saturn) ہیں - اور اسی لئے عالم حیات کے لحاظ سے یہ عظیم الشان دنیائیں سب سے چھوٹی اور بچپن کی حالت میں ہیں اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ یا جوان تارے ہماری زمین اور عطارد (Mars) ہیں - جو اور بھی بہت سی کیفیتوں میں متفق ہیں - گو اس میں شک نہیں کہ خود ان دونوں تاروں میں زمین زیادہ سن رسیدہ ہے - کیونکہ ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ تاروں کی عمر ان کی کیفیت حیات سے قرار دی جاتی ہے - ہمارا مطلب یہ ہے کہ زمین اور عطارد نے اپنی بے انتہا حرارت کا زائد حصہ جلد دور کر دیا - اور ان کی سطح اور تمام ستاروں کی نسبت بہت جلدی ٹھنڈی ہو کر نباتات اور حیوانات کی رہائش کے قابل ہو گئی - حالانکہ سب سے بڑے اور سب سے پرانے تارے مریخ اور زحل ابھی اس حالت سے بہت دور ہیں - گو اس میں شک نہیں کہ وہ بھی اس حالت پر پہنچینگے ضرور اور کبھی نہ کبھی اُن کی زمین اور اُن کے سمندر نباتات اور حیوانات سے آباد ہونگے - اس میں بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ رفتہ رفتہ ہماری زمین اور عطارد کی یہ قیام حیات کی قابلیت زائل ہو جائیگی - اور اس کے بعد ہماری زمین پر کسی قسم کے جاندار کا وجود بھی ممکن نہ ہوگا - اور گو یہ ممکن ہے کہ خود یہ کرہ بے انتہا عرصے تک نظام شمسی میں اپنی جگہ قائم رہے - مگر ہماری شاعرانہ اصطلاح میں وہ وقت زمین کی موت کا ہوگا +

Marfat.com

غرض مذکورۂ بالا تمام بیان سے مقصود یہ ہے - کہ ہر ستارے کی عمر میں ایک وقت ایسا آتا ہے - کہ اس میں قیام حیات کی قابلیّت پیدا ہو جاتی ہے - اس وقت سے عالم حیات شروع ہو کر اس ستارے کی حالتوں کے برابر برابر قائم رہتا ہے - یہاں تک کہ آخر اس کی حالتیں اتنی بدل جاتی ہیں کہ وہ فعل زندگی کو روک کر عالم حیات کا خاتمہ کر دیتی ہیں - اور اس کے بعد وہ ستارہ گویا مر جاتا ہے - (جیسے غالباً ہمارا چاند ہے) اگرچہ اس سے اس کی حرکتوں اور اس کی جگہ میں کوئی فرق نہیں آتا ٭

اب اس تمہید کے بعد ہم کو مختصراً یہ دیکھنا چاہئے کہ ہماری زمین نے علم ہیئت کی حیثیت سے ہمارے استقبال کی کیا تیاری کی تھی - اور کس کس انقلاب کے بعد یہ زمین ہماری رہائش کے قابل ہوئی - کیونکہ ہم کو اس کا یقین کر لینا چاہئے کہ زمین کی یہ قابلیّت اور انسان کی پیدائش قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئی ہو گی - زمین کی آبادی میں سب سے زیادہ موثر کیفیّت حرارت ہے - مطلب یہ ہے کہ اگر ہم علم ہیئت کے قاعدوں کے مطابق ایک مساوات حرارت بنالیں - زمین کی وجود انسانی سے پہلے کی ہیئتی حالت جان لیں - اور زمین کی کیفیّت نجمی کے انقلاب کی رفتار کا اندازہ کریں تو ہم نسل انسانی کے آغاز کا وقت تخمیناً صحیح بتا سکیں گے - مذکورہ مساوات حرارت کا بڑا انحصار اس تھرتھراہٹ یا لمبی جنبش پر ہے جو زمین کے ہیولے اوّل سے الگ ہونے سے لے کر اس کی انتہا تک اس کے آربٹ[1] (مدار یا طریق الارض) میں رہی ہے اور رہے گی - یہاں ہم کو علم ہیئت کے چند مسائل کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے جن کو [illegible] ہیں - مگر جن کی پوری اہمیت کا اندازہ ٹھیک نہیں کیا گیا - زمین کا [illegible] بیضوی ہے - جس کا ایک فوکس[2] یا مرکز سورج ہے - لیکن اس بیضے[3] کی صورت ہمیشہ

[1] (مدار یا طریق الارض) اس شکل کو کہتے ہیں جو زمین اپنی حرکت حولیہ میں آفتاب کے گرد گردش کرتے ہوئے فضا کے محیط میں بناتی ہے - [2] علم ریاضی کے اس شعبہ میں جس کو انگریزی میں کونک سیکشن یعنی "تقطیع مخروطیات" کہتے ہیں - بیضوی شکل یا ایلپس کی یہ تعریف ہے - کہ وہ ایسی شکل ہے جس کا محیط ایک محدود خط منحنی ہو - اور اس میں دو نقطے (ف - م) ایسے ہوں کہ اس خط منحنی کے ہر ایک نقطے اور ان دونوں نقطوں

یکساں نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس کے دونوں قطر جو باہم زاویہ قائمہ بناتے ہیں۔ ہمیشہ یکساں طویل نہیں ہوتے۔ بلکہ ان میں ایک تغیر جاری رہتا ہے۔ جس سے ان دونوں کے طول کی نسبت بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے زمین کے بیضوی آربٹ کی صورت بھی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ پہلے اس کا چھوٹا قطر بڑھتا جاتا ہے۔ یہاں تک یہ بڑے قطر کے قریب قریب لمبا ہو جاتا ہے۔ گو برابر کبھی نہیں ہوتا۔ اور بیضوی آربٹ تقریباً مدور بن جاتا ہے۔ گو پورا دائرہ کبھی نہیں ہوتا۔ اس کے بعد یہ پھر سکڑنے لگتا ہے۔ اور بڑے قطر سے بہت چھوٹا ہو جاتا ہے۔ جس صورت میں آربٹ انتہا درجے کی لمبائی حاصل کر لیتا ہے۔ اور دائرے سے نہایت دور جا پڑتا ہے۔ اس انتہا لمبائی کو آربٹ کی اکسنٹریسٹی کہتے ہیں۔ اس کے بعد پھر چھوٹا قطر بڑھنے لگتا ہے۔ اور یہ سلسلہ یونہی خدا جانے کب سے جاری ہے۔ اور کب تک جاری رہیگا +

اس میں شک نہیں کہ یہ تغیر بہت دیر دیر میں واقع ہوتا ہے۔ نقاط معدل النہار کی حرکت اقدامی کے زور سے دونوں قطروں کی صورت بدلتی رہتی ہے۔ اور وہ دونوں وقتاً فوقتاً آسمان کے مختلف حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اور حدود مقررہ کے اندر سکڑتے اور پھیلتے رہتے ہیں۔ یہ باتیں ہیں۔ جن پر زمین کے آربٹ کی یکسانی منحصر ہے +

یہاں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ناظرین ظاہری طریق الشمس کی سطح ہمارے کرے کے آربٹ کی صورت اور آفتاب کی ظاہری حرکت کی سطح۔ زمین کے محور اور اس سطح کا درمیانی زاویہ۔ خطوط استوائے ارضی و فلکی۔ اور نقاط تقارب و تباعد سے

(بقیہ صفحہ ۲۳) کے درمیانی فاصلے کا مجموعہ ہمیشہ یکساں رہے۔ ان دونوں نقطوں میں سے ہر ایک کو فوکس یا نقطہ ماسکہ کہتے ہیں +
جو خط (ا ب) دونوں فوکسوں میں سے ہوتا ہوا محیط ابلپس کو کاٹتا ہے۔ وہ قطر بزرگ کہلاتا ہے۔ اور جو خط (ج د) اس قطر بزرگ کے نقطہ اوسط (ہ) سے اس پر عمود وار گزرتا ہے وہ قطر خرد کہلاتا ہے +
یہ ظاہر ہے۔ کہ جس قدر ان دونوں قطروں کے طول میں فرق کم ہوگا۔ اسی قدر اس بیضے کی شکل زیادہ مدور ہوتی جائیگی۔ اور اگر یہ دونوں برابر ہو جائیں تو بیضہ پورا دائرہ بنجائے۔ اور دونوں فوکس باہم قریب ہوتے ہوتے آخر دونوں قطروں کے نقطۂ تقاطع پر ملجائیں۔ اور اس دائرے کا مرکز بنجائیں۔ اس کے برعکس ان دونوں قطروں میں جس قدر فرق زیادہ ہوگا اسی قدر بیضے کی شکل دائرے سے زیادہ متفاوت ہوتی جائیگی۔ اور اگر یہ فرق بے حد بڑھ جائیگا۔ تو ایک وقت آجائیگا کہ قطر خرد صرف ایک نقطہ

Marfat.com

خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ یہ بھی مان لیا گیا ہے کہ وہ خزاں اور بہار کے نقاط معتدل النہار اور ان کی حرکت اِقدامی کو سمجھتے ہیں۔ موسموں کے اختلاف کے اسباب جانتے ہیں۔ اور غالباً یہ سمجھنے کے قابل ہیں۔ کہ یہ تمام گوناں گونی اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ زمین کا محور اس کے آربٹ کی سطح سے ایک خاص زاویہ بناتا ہے۔ اور اس کا آربٹ کبھی دائرے کے قریب کی اور کبھی دور کی صورت اختیار کرتا ہے۔ بہرحال یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آج کل ہماری زمین کا آربٹ دائرے کی صورت اختیار کرتا جاتا ہے۔ بڑا قطر چھوٹا ہو رہا ہے۔ اور چھوٹا بڑھ رہا ہے۔ اور آربٹ کی اکسنٹریسٹی نہایت آہستہ مگر یقینی طور پر گھٹتی جاتی ہے۔ اور تقارب اور تباعد کی مسافتوں کا فرق کم ہو رہا ہے۔ اور برابر کم ہوتا جائیگا۔ یہانتک کہ اپنی انتہائی حد تک پہنچ جائے۔ مگر وہاں پہنچتے ہی شرائط بدل جائینگی۔ اور فوراً ترقی معکوس شروع ہو جائیگی۔ بڑا قطر بڑھنے لگیگا۔ اور چھوٹا قطر گھٹنے لگیگا۔ اور یہ تغیر نقاط تقارب و تباعد کی صورت کو بھی بدل دیگا۔ علمائے حال نے ان تغیرات پر بڑا غور کیا ہے۔ اور چند دن سے ہی ان کے وقت کا بھی اندازہ کرنے کی جرأت کی ہے۔ اب ہمارے آربٹ کی مساوات کے رکن زیادہ وضاحت سے معلوم ہو گئے ہیں۔ اور ان کے حل کرنے سے معلوم ہوا ہے کہ ہمارے آربٹ کی زیادہ سے زیادہ اکسنٹریسٹی ۰.۰۷۴۷ ہے اور کم سے کم ۰.۰۰۲ ہے۔ ان دونوں حدوں کے درمیان ہمارا آربٹ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور ہئے نئے موسم آتے رہتے ہیں +

ہم یہاں مساوات حرارت کے بھی ضروری اجزا کا مختصر حال بیان کردیں تو مناسب ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے آربٹ میں ایک نقطۂ تقارب ہے اور ایک نقطۂ تباعد۔ فی الحال ان دونوں خاص صورتوں میں زمین اور آفتاب

(بقیہ صفحہ ۲۴) رہجائیگا۔ اور بیضہ اپنے قطر بزرگ پر منطبق ہو کر ایک سطح ہونے کی بجائے صرف ایک خط بنجائیگا +
نقطۂ تقارب یعنی مدار الارض کا وہ مقام جہاں زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ کم سے کم ہوتا ہے۔ جو شکل مذکور میں نقطہ ا واقع ہوا ہے +
نقطۂ تباعد۔ یعنی مدار الارض کا وہ مقام جہاں زمین اور سورج کا باہمی فاصلہ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے جو شکل مذکور میں نقطہ ب دکھایا گیا ہے +

Marfat.com

کی مسافتوں کا فرق تیس لاکھ میل ہے۔ ہر شخص جان سکتا ہے کہ یہ فرق گرمی پیدا کرنے میں کتنا نمایاں اختلاف ڈالی سکتا ہے۔ یہ بات غور سے مدنظر رکھنی چاہئے کہ آج کل ہمارا نقطۂ تقارب عین سرما میں اور نقطۂ تباعد وسط گرما میں واقع ہوتا ہے۔ صاف عبارت میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب محور زمین کے میلان کی وجہ سے دن نہایت چھوٹے اور راتیں نہایت بڑی ہوتی ہیں۔ اور سردی اپنے شباب پر ہوتی ہے تو ہم سورج سے تیس لاکھ میل زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ بہ نسبت اُس زمانے کے جب کہ گرمی کا زور ہوتا ہے۔ اور آفتاب عین ہمارے سروں پر چمکتا ہوتا ہے۔ خود آفتاب کی گرمی دو صاف شرطوں پر مبنی ہے۔ شرط اوّل وہ زاویہ ہے جو آفتابی شعاعیں زمین کے ساتھ بناتی ہیں۔ شرط دوم وہ فاصلہ ہے جو زمین اور آفتاب میں واقع ہوتا ہے۔ اگر ہم عرف خاص کی بجائے عرف عام میں یہ مطلب ادا کریں تو بات صرف یہ ہے کہ اگر سورج کی کرنیں سیدھی پڑیں تو گرمی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور اگر ترچھی ہوں۔ تو گرمی بھی اسی قدر کم ہو۔ دوسرے یہ کہ زمین جتنی سورج کے پاس آجائے اتنی ہی گرمی شدید ہو۔ اور جتنی دور چلی جائے اُسی قدر گرمی کم ہو۔ کیونکہ گرمی کی کمی اور دونوں کُروں کے بُعد کے مربّع باہم متناسب ہوتے ہیں۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم لوگ جو خوش قسمتی سے شمالی حصے میں رہتے ہیں۔ عین سردی میں آفتاب کے قریب اور ٹھیک گرمی میں آفتاب سے دور ہوتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ ایک طرف سردی کی شدّت کم ہو جاتی ہے۔ دوسری طرف گرمی کی حدّت گھٹ جاتی ہے۔ اگر معاملہ برعکس ہوتا۔ یعنی نقطہ تقارب گرمی میں اور نقطہ تباعد سردی میں آتا تو آسانی سے قیاس ہو سکتا ہے۔ کہ موسموں میں کیا فرق ہوتا۔ بجائے اس کے کہ آج کل کی طرح دونوں موسموں میں اعتدال ہوتا۔ ایک طرف سردی کی سختی آفتاب سے دوری کی وجہ سے اور بڑھ جاتی۔ دوسری طرف گرمی کی تیزی آفتاب کی نزدیکی کے سبب سے اور زیادہ ہو جاتی ۔

فاضل لوگوں نے موسموں کی اس تبدیلی کا اندازہ کیا ہے۔ اور یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ اگر مذکورۂ بالا نا موافق صورت ہوتی تو جاڑوں میں سردی اور گرمیوں

Marfat.com

میں گرمی تقریباً $\frac{1}{15}$ پندرھواں حصہ موجودہ حالت سے زیادہ ہوتی۔ گویا اب موجودہ حالت میں حصہ شمالی میں $\frac{2}{15}$ حصّے گرمی اور سردی معتدل ہو جاتی ہے +

کہا جاتا ہے کہ بہت دن ہوئے ایک زمانہ فی الواقع ایسا ہی تھا کہ نقطہ تقارب گرمی میں اور نقطہ تباعد سردی میں آیا کرتا تھا۔ ایک بات یہ بھی دل نشین رکھنی چاہیئے کہ آج کل آربٹ کی اکسنٹریسی انتہائی طوالت کی حالت سے بہت کم ہے۔ اس نہایت ہی دور دراز کے گزشتہ زمانے میں مسافت تقارب یعنی زمین کی سورج سے کم سے کم دوری آٹھ کروڑ پچاس لاکھ میل تھی۔ اور مسافت تباعد یعنی زیادہ سے زیادہ بُعد ۹ کروڑ نوّے لاکھ میل۔ اس طرح ان دونوں مسافتوں کا فرق ایک کروڑ چالیس لاکھ میل تھا۔ حالانکہ آج کل یہ فرق صرف تیس لاکھ میل ہے۔ اور جب یہ تفاوت موسموں کی حرارت میں $\frac{2}{15}$ کا فرق پیدا کر دیتا ہے۔ تو اس زمانے میں گرمی کی حدّت اور سردی کی شدّت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے +

یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم یہ تمام باتیں شمالی حصّہ زمین کے لحاظ سے کہہ رہے ہیں۔ جس زمانے میں آربٹ انتہائی طوالت کی حالت میں تھا۔ اس وقت چونکہ نقطہ تباعد سردی میں آتا تھا۔ اس لئے حصّہ شمالی میں آج کل کی نسبت نہایت سخت اور شدید سردی پڑتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارا کرہ قیام حیات کے بالکل قابل نہ تھا۔ اور وہ حالت آج کل کی حالت کے بالکل برعکس تھی۔ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حصہ شمالی کی وہ سردی جو اب بھی اس قدر سخت ہوتی ہے کہ اتنے بڑے بڑے قطعوں کو برف پوش بنا دیتی ہے۔ اور اکثر زیادہ شمالی زمینوں کو ہمیشہ برف میں دبائے رکھتی ہے۔ اس کی اُس وقت کیا حالت ہوگی۔ یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ گرمی بھی تو اسی نسبت سے سخت اور تیز ہوتی ہوگی۔ مگر اس کا جواب یہ ہے۔ کہ گرمی سخت تو واقعی زیادہ ہوتی تھی۔ مگر رہتی بہت کم تھی۔ کیونکہ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ سیّاروں کی رفتار نقطۂ تقارب کے آس پاس نہایت تیز ہو جاتی ہے۔ اس لئے اس حالت میں جو موسم بھی ہوتا ہے وہ جلد ختم ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے نقطۂ تباعد کے قریب رفتار

Marfat.com

انتہا درجے کی سُست پڑ جاتی ہے۔ اس لئے اس حالت میں جو موسم ہوتا ہے بہت زیادہ دیر پا ہوتا ہے۔ پس چونکہ اس زمانے میں نقطہ تقلیب کی حالت میں گرمی ہوتی تھی۔ اس لئے گو سخت ہوتی تھی۔ مگر رہتی بہت کم تھی۔ البتہ جنوبی حصے میں یہ حال نہ تھا۔ کیونکہ وہاں شمالی حصّے کے برعکس موسم رہتے ہیں۔ اس لئے وہاں کی سردی گرمی کی شدّت اور درازی کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے وہاں کے برف کے پہاڑ پگھل پگھل کر سمندر بن گئے ہونگے ✦

اس بیان کے بعد ہم یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ آج کل کے موسموں کو دیکھکر ہم اس زمانۂ قدیم (جس کا اوپر ذکر ہوا) کے موسموں کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ زیادہ تر نوع انسان کا مسکن شمالی حصّہ ہے۔ اس کے موسم آثار زندگی کی قابلیّت کے لئے معتدل ہو گئے ہیں۔ لیکن جنوبی حصّے میں حال برعکس ہے۔ وہاں قطب جنوبی سے سینکڑوں ہزاروں میل تک دائمی برف کے پہاڑ اور برف کے سمندر پھیلے ہوئے ہیں۔ بحر منجمد جنوبی میں زمین کی نایابی ہی زندگی کی مانع نہیں ہے۔ بلکہ دائمی سردی کی سختی بھی ہر ایک صورت حیات کو روکتی ہے۔ وہ موافق حرارت کے $\frac{2}{15}$ حصّے وہاں مخالف ہو جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم ہیئت کے لحاظ سے آج کل رہائش کے لئے شمالی حصّہ جنوبی حصّہ کی نسبت $\frac{2}{15}$ حصّے زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ یہ حالت ذہن نشین کر کے اب ناظرین کو چاہیئے کہ ہمارے ساتھ اس زمانے کا تصوّر کریں۔ جب آربٹ کی انتہائی لمبائی کی حالت میں سردی نقطہ تباعد کے ساتھ آتی تھی۔ جب کہ برف کے پہاڑ قطب شمالی اور بحر منجمد سے لے کر خط استوا کے آس پاس تک تمام سطح زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی جنوبی حصے کی زمین صاف اور ہوا معتدل تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس زمانے میں منطقۂ باردۂ جنوبی کے کچھ حصے سطح سمندر سے اوپر ہوں۔ اور حصّہ شمالی کے اکثر جزیرے اور ملک برف میں دبے ہوئے ہوں۔ حاصل کلام یہ کہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم علم ہیئت کے لحاظ سے علم طبقات الارض کے اس زمانے کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ جن کو اس علم والے یخ بستہ عالم کہتے ہیں۔ ہم نے اس کی وجہ بھی دیکھ لی ہے۔ ہم نے یہ بھی جان لیا

ہے کہ آربٹ کی انتہائی طوالت کی حالت نقاط تقارب وتباعد کی گرمی اور سردی میں آنے سے زمین کا شمالی حصّہ بالکل برف میں چھپا ہُوا تھا +

بہرحال ہم نے علم ہیئت سے جیالوجی کے عالم یخ بستہ کا وجود ثابت کردیا ہے۔ اور ہم نے اس کی وجہ بھی دیکھ لی ہے۔ ہم ان اسباب کو بھی پوری صفائی سے دیکھ سکتے ہیں۔ جنہوں نے اس زمانۂ ویرانی کو یقینی ظہور انسان سے پہلے ختم کردیا۔ ان اسباب کی بڑی وجہ بھی وہی آربٹ کی صورتوں کی تبدیلی تھی۔ اگرچہ قیاساً اس برفانی زمانے کا کمال نقطہ تباعد کے سردی میں آنے اور آربٹ کی لمبائی کے کمال کے ساتھ تھا۔ مگر جس طرح آج کل سردی کا زور بجائے ۲۲۔ دسمبر کے عموماً وسط جنوری تک رہتا ہے۔ اسی طرح اس زمانہ قدیم میں بھی عملاً برفانی زمانہ آربٹ کی انتہائی لمبائی کے ایک عرصے بعد تک رہا ہوگا۔ اور اس کے بعد سردی کا زور کم ہونا شروع ہوگیا ہوگا۔ انتہائی لمبائی کے بعد قطر بزرگ کا گھٹنا اور قطر خورد کا بڑھنا یقینی اور لازمی ہے۔ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ نقطہ تباعد نے بھی وسط سرما سے ہٹنا شروع کیا۔ ہر سال آفتاب زیادہ موافق اور مناسب جگہ میں آتا گیا۔ یعنی بقول **سعدی**

تا ربایدکُلہِ قاقم برف از سرکوہ

یزک تابش خورشید یغما برخاست

نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ عالمگیر برف کی چادر کے نیچے کے کونے شمالی دنیا سے آہستہ آہستہ ہٹنے لگے۔ کبھی کبھی برف کے پہاڑ نیچے آپڑتے ہونگے۔ جیسے اب بھی کبھی کبھی ہوتا ہے۔ اگرچہ بہت چھوٹے پیمانے پر۔ اس طرح رفتہ رفتہ شمالی دنیا کے منطقۂ حارّہ اور معتدلہ کے مختلف حصّوں کا برف گھُل گھُل کر عظیم الشان دریاؤں کی صورت میں بہتا ہوگا +

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ملکوں نے موجودہ صورت کب اور کس طرح اختیار کی۔ یہی زمانہ تھا۔ کہ آہستہ آہستہ امتداد وقت سے برف پگھل جانے کے بعد یہ عظیم الشان وادیاں بن گئیں جن کی تہ میں اب تک ان خوفناک برفانی دریاؤں کی مٹی مٹی نشانیاں۔ یعنی آج کل کی ندیاں بہتی ہیں۔ شمالی حصّے کے تمام

Marfat.com

براعظموں اور ملکوں میں یہ بات بالخصوص قابل دید ہے۔ کہ دریائی گھاٹیاں اتنی وسیع ہیں۔ کہ تاریخی زمانے میں جو دریا اس میں بہتے رہے ہیں۔ اُن کو گھاٹیوں کی وسعت سے کچھ نسبت ہی نہیں ۔ مزید برآں ان گھاٹیوں کا امتحان کرنے سے یہ بات قطعاً ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ کسی زمانے میں یہ نہایت عظیم الشان اور تیزی سے بہتے ہوئے دریاؤں سے پُر تھیں۔ جو ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی تک چڑھے ہوئے تھے۔ اور کئی کئی میل چوڑے ہوتے تھے یہ دریا اپنے بے انتہا سیلابوں کے بہاؤ میں پرانے یخ بستہ عالم کی ہر ہلکی بھاری چیز اور اپنے کوہ آسا تودہائے برف کے دباؤ سے پتھروں اور چٹانوں کے ٹکڑے اپنے ساتھ بہائے لئے جاتے تھے۔ یہ مضمون حقیقت میں علم طبقات الارض کا ایک جزو ہے۔ مگر ناظرین نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ ان دونوں علموں کی سرحدیں ملی ہوئی ہیں۔ اور ایک کا انجام دوسرے کا آغاز ہے ۔ یہاں ہم جس بات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ظہور انسانی عالم یخ سے اِس طرف واقع ہوا ہے۔ کیونکہ مذکورۂ بالا واقعات صاف بتا رہے ہیں۔ کہ وہ زمانہ جبکہ یہ عظیم الشان برفانی دریا اتر گئے۔ جو شمالی دنیا میں یخ کے پہاڑوں کے پگھلنے سے چڑھ گئے تھے۔ وہ وقت تھا۔ جس میں حیات انسانی کے ظہور کی ابتدا ہوئی +

یہاں یہ ضرورت معلوم نہیں ہوتی کہ ہم ان تمام دلیلوں کو پیش کریں۔ جن کو دیکھ کر ظہور انسانی کے لئے یہ وقت قرار دیا ہے۔ ان کا تعلق علم طبقات الارض کی بحث قدامت انسان سے ہے۔ یہاں ہم صرف یہ چاہتے ہیں۔ کہ اگر ہو سکے تو ان مذکورہ انقلابات کو کبھی کی میعاد اور ان کے وقت کا اندازہ کریں۔ اور پھر ان سے ظہور انسانی کی تاریخ کا تخمینہ لگائیں۔ اس قسم کی تحقیقات میں یقینی نتیجے چاہنا تو محض ناممکن اور خلاف عقل ہے۔ علم ہیئت کے زمانوں اور طبقات الارض کی مدتوں کو شمار کرنے میں یہ چھوٹی چھوٹی سی صدیں اور قرنیں جو آدمیوں نے دنوں اور موسموں کے اختلاف سے اپنے لئے بنا رکھی ہیں۔ نظر سے غائب ہو جاتی ہیں۔ ان بڑی بڑی باتوں کے لئے معیار بھی بڑے بڑے

Marfat.com

ہی ہونے چاہئیں۔ اگر ہم انقلابات سماوی کے لئے ہزاروں لاکھوں کو ایک ایک اکائی فرض نہ کریں۔ تو سالوں اور صدیوں کو گنتے گنتے ہمارے اعداد تمام ہو جائیں۔ اور جہاں اکائیاں ایسی ہوں وہاں کسی واقعے کا ٹھیک سال اور مہینہ بتلانے کا کون خیال کر سکتا ہے +

خوش قسمتی سے آج کل علم طبعیات اتنی ترقّی کر چکا ہے۔ کہ ہم اس تخمینے کو قریب قریب بالکل صحت تک پہنچا سکتے ہیں۔ ہرشل کے زمانے سے طریق الارض کی تبدیلیاں اور اس کے نتیجے یعنی موسموں کے اختلاف پر پورا غور و خوض ہوتا رہا ہے۔ ہرشل کے بعد انیسویں صدی کی ابتدا میں اراگو۔ ہمبولٹ اور اور مشہور علما نے اس پر بحث کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر جیمس کرول اپنی تحقیقات میں اپنے تمام متقدمین سے زیادہ کامیاب ہُوا۔ اس نے سن گیارہ لاکھ قبل مسیح سے اب تک کا ایک نقشہ تیار کیا ہے۔ اس زمانے کو اس نے دس دس ہزار برس کے ٹکڑوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر ٹکڑے کے لئے طریق الارض کی مسافت تقارب و تباعد کا فرق اور گرمی کے دنوں سے سردی کے دنوں کی زیادتی دریافت کی ہے +

علمائے ہیئت داں خوب واقف ہیں۔ کہ بعض خاص معلومہ وجوہات سے اکسنٹریسٹی کی کمی بیشی پوری باقاعدہ نہیں ہے۔ مگر ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ عام طور پر تمام غالوں میں کمی بیشی ایک خاص طور پر اور خاص نسبت سے ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام خالوں کے سب سے بڑے اور سب سے چھوٹے اعداد میں ایک نمایاں مگر بظاہر غیر مقررہ تعلق پایا جاتا ہے۔ اس نقشے سے وہ زمانے آسانی سے دریافت ہو سکتے ہیں۔ جبکہ طریق الارض انتہائی طوالت کی حالت میں تھا۔ ان میں سے پہلا واقعہ ۹ لاکھ پچاس ہزار سال قبل مسیح۔ دوسرا ۸ لاکھ پچاس ہزار سال پہلے۔ تیسرا ۷ لاکھ پچاس ہزار سال پہلے۔ چوتھا اس حد سے ذرا آگے بڑھ کر ۶ لاکھ سال پہلے۔ پانچواں ۵ لاکھ سال پہلے۔ چھٹا ۲ لاکھ پچاس ہزار اور ۳ لاکھ کے درمیان میں۔ اس کے بعد ۲ لاکھ دس ہزار سال پہلے۔ اور آخری ایک لاکھ سال پہلے ہوا۔ عام طور پر ہم کہہ سکتے ہیں

Marfat.com

کہ گزشتہ ۱۰ لاکھ سال میں طریق الارض کے ایک دفعہ انتہائی طول حاصل کرنے سے لے کر دوبارہ اس حالت میں آنے کے لئے کم و بیش ایک لاکھ سال چاہئیں۔ یہ حرکت اس قدر باترتیب ہے کہ ہم اس عرصے کو اندازاً تبدیلی کا ایک معیار قرار دے سکتے ہیں۔ ابتدائی تمام صورتوں کو نظر انداز کر کے ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ انتہائی طول کی آخری حالت لاکھ سال قبل مسیح واقع ہوئی۔ موجودہ تحقیقات کے لئے ہم اسے اپنی خاص تاریخ مقرر کر سکتے ہیں۔ یہ زمانہ انتہائی طول کا ہی نہ تھا۔ بلکہ اس میں نقطۂ تباعد بھی سردی میں آتا تھا۔ اس لئے معلوم ہوا کہ یہ وقت ہمارے کرے کی آخری انتہائی سردی کا زمانہ تھا۔ یا طبقات الارض کی اصطلاح کے مطابق یوں کہیئے کہ یہ یخ بستگی کا عالم تھا۔

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ شدید سرما کی حالت گزشتہ قبل مسیح سے کچھ ورے تک قائم رہی ہوگی۔ اور جس طرح معمولی طور پر سالانہ سردی کی شدت ۲۲۔ دسمبر کی بجائے وسط جنوری تک خیال کی جاتی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہم کو اندازاً ۵ یا ۱۰ ہزار برس اور سردی کی شدت کے نذر کر دینے چاہئیں۔ اس کے بعد قطعی ان اسباب میں تغیّر شروع ہو گیا ہوگا۔ جو عالم یخ کے ظہور کا موجب تھے۔ یعنی ہر سال سورج اور زمین زیادہ مناسب اور موافق موقعوں پر آتے گئے۔ اور آخر کار قانون قدرت کے اثروں سے کوہ نما تودہائے برف کے جنوبی کنارے پگھلنے لگے۔ اور دریاؤں کی اسی طغیانی اور سیلاب کا عالم پیدا ہو گیا۔ جس کا ہم ذکر کر آئے ہیں۔ مگر اب ہمارے پاس وقت کا معیار بھی ہے۔ جو پہلے ذکر میں نہ تھا۔ اور یہ وقت کا معیار علم ہیئت کی تحقیقات کے مطابق مقرر کیا گیا ہے یعنی اب ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ انتہائے سرما کا عالم لاکھ سال قبل مسیح اپنے زوروں پر تھا۔ اور اس کے بعد ایک مدت مدید تک رہا۔ یہاں تک کہ تغیّر حالات سے حرارت بڑھی اور اس کا زور کم ہونے لگا۔ یہ معلوم کرنا کہ وہ مدت مدید کس قدر تھی۔ جس کے بعد حرارت آفتاب برفستان کے جنوبی حصّوں کو پگھلانے کے قابل ہوئی صرف قیاس اور اندازے کا کام ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ یہ مدت بہت معقول تھی۔

Marfat.com

اس میں تو کچھ شک ہی نہیں ہو سکتا کہ ظہور انسانی عالم یخ کے بعد ہؤا۔ کیونکہ اس زمانے کی شمالی حصۂ زمین کی معلومہ اور مذکورہ حالتوں کی وجہ سے وجود انسانی اگر عالم یخ سے پہلے ہوتا بھی تو معدوم ہو جاتا۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ نکالنے کے مجاز ہیں کہ" وہ جاندار جو انسان کہلاتا ہے عالم یخ کے بعد اُس وقت اس زمین پر آیا۔ جبکہ اس کی سطح تودہائے برف سے صاف ہو کر قابل رہائش ہو گئی تھی۔ جبکہ برفانی دریا اپنی طغیانی کے بعد پھر اتر چکے تھے۔ اور برّاعظموں کی موجودہ صورت اور تقسیم قائم ہو چکی تھی"*

پیشتر اس کے کہ ہم اس علم کی تحقیقات کو چھوڑ کر علم طبقات الارض کی طرف جھکیں۔ بہتر ہے کہ جانے سے پہلے ایک دو نتیجے اور بھی ذہن نشین کر لیں۔ جو اسی علم کے قواعد کے مطابق نکل آتے ہیں +

ان میں سے ایک یہ ہے کہ مذکورۂ بالا آخری بار کی انتہائی طوالت سے پہلے کا زمانہ ایسی حالتوں میں آیا تھا جو شمالی حصّے میں گرمی کے لئے مناسب تھیں۔ یعنی اب سے قریباً ۲ لاکھ ۱۰ ہزار برس پہلے نقطۂ تقارب سردی میں آتا تھا۔ جس کا نتیجہ گرمی کی زیادتی اور اس کے متعلق تمام موسموں کی تبدیلی تھا۔ اس قیاس کی تائید علم طبقات الارض سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اس علم کے مطابق یہ بات مسلّم اور محقّق ہے کہ عالم یخ سے پہلے گرمی کی شدت کا زمانہ تھا۔ اور اس برف کے ڈھیر اور یخ کے پہاڑ جمع ہو جانے سے پہلے منطقۂ معتدلہ بلکہ منطقۂ باردہ تک میں منطقۂ حارہ کی سی حالت پائی جاتی تھی +

اس گرمی کے بیان کے متعلق ایک نہایت ضروری اور اہم بات یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اس زمانے کی نباتات اور حیوانات کے کچھ بقیے جو گویا عالم یخ میں دفن ہو کر عالم طغیانی (طوفان) میں پھر ظاہر ہوئے۔ زمانہ مابعد کے حیوانات اور نباتات کے بقیوں سے ایسے مل جُل گئے ہیں۔ کہ بے پروا طالب علم اور عام دیکھنے والا دونوں کو ہم عصر ہی خیال کرتا ہے۔ اگرچہ محقّق بالغ نظر کے لئے دشواری نہیں ہوتی۔ اس بات سے بڑا نتیجہ یہ نکلتا

ہے کہ آثار حیات کے ظہور کا میدان کتنا وسیع ہے۔ اور جب عالم یخ اور اس سے پہلے کے شدت گرما کے زمانے میں کم و بیش ایک لاکھ برس کا بُعد تھا۔ تو ہم کو قوانین قدرت کی آہنگی اور یکسانیت دیکھتے ہوئے یہ مان لینا چاہیئے کہ اس عالم یخ اور آج کل کے زمانے میں بھی اس سے کم مدت نہ ہوگی +

شاید یہاں اس تمام بحث کا ایک مختصر اور مجمل خلاصہ کر دینے سے وہ تمام اسباب اور نتائج جن سے قدامت انسان کا ثبوت دیا گیا ہے۔ ناظرین کے زیادہ ذہن نشین ہو جائیں۔ اس لئے ہم نہایت مختصر الفاظ میں اپنی بحث کو پھر دُہراتے ہیں :-

(۱) آخری دفعہ طریق الارض کی انتہائی طوالت ایک لاکھ سال قبل مسیح واقع ہوئی +

(۲) اس زمانے میں نقطۂ تباعد سردی میں آتا تھا +

(۳) ان دونوں مجموعی وجہوں سے کرۂ زمین کے شمالی حصّے میں نہایت سخت سردی پیدا ہو گئی تھی۔ جو اصطلاح علم طبقات الارض میں عالم یخ کے نام سے مشہور ہے +

(۴) یہ سردی کی شدّت مذکورۂ بالا (۱) اور (۳) فقروں کی حالت کے ختم ہو جانے کے بعد بھی کچھ عرصے تک رہی +

(۵) اس شدت سرما کے گھٹ جانے کے بعد کرۂ شمالی کے موسم سال بسال معتدل ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ آخر وہ نوع انسانی کے وجود اور بقا کے مناسب ہو گئے +

(۶) یہ مناسب اعتدال اس وقت ہوا۔ جب کہ بڑے بڑے برفانی دریاؤں کی طغیانی کم ہو گئی جو یخ کے پہاڑوں کے پگھلنے سے پیدا ہوئی تھی +

(۷) اندازاً اس عرصۂ طویل کا ایک چوتھائی یعنی ۲۵ ہزار برس شدت سرما کی کمی اور برفانی دریاؤں کے اترنے کے لئے چھوڑ دینے چاہئیں +

(۸) اس کے بعد گویا ہم کو یہ معلوم ہو جائیگا۔ کہ کرۂ شمالی کے قابل رہائش ہونے کی زیادہ سے زیادہ مدت ۷۵ ہزار سال ہے۔ جبکہ اس پر ظہور وجود

انسانی کا امکان تھا۔ لیکن

(۹) یہ عرصہ انتہائی حد بتلاتا ہے۔ جس کے پرے کسی علم اور کسی محقق کو وجود انسانی کی امید یا جستجو نہ کرنی چاہیئے +

(۱۰) عموماً جہاں دو ابتدائی اور انتہائی مدتیں معلوم ہوں۔ وہاں سب سے زیادہ مناسب اور قرین قیاس ان دونوں مدتوں کی اوسط ہوتی ہے +

(۱۱) اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم ہیئت کی تحقیقات کے لحاظ سے طریق الارض کے تغیر و تبدل دیکھتے ہوئے آفرینش انسان کی ابتدا حضرت عیسٰےؑ سے ۳۰ یا ۴۰ ہزار سال پہلے تک واقع ہوئی ہوگی +

(۱۲) یہ نتیجہ ابھی تک پہلا آزمائشی قدم سمجھنا چاہیئے۔ ابھی ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ ہمارے سوالات کے متعلق ہر ایک علم کی علٰحدہ علٰحدہ تحقیقات اس نتیجے کی کہاں تک تائید یا تردید کرتی ہے +

اگر ناظرین نے مذکورۂ بالا بحث کو سمجھ لیا ہے۔ تو انہوں نے ضرور دیکھا ہوگا کہ ہمارے کرۂ زمین کے انقلابات کی رفتار کس قدر آہستہ اور دھیمی ہے اور یہ بات کچھ اس کی کیفیت نجمی ہی سے خاص نہیں ہے۔ بلکہ اس کے متعلقہ آثار حیات کی بھی یہی حالت ہے۔ دنیا کے انتظامات کے نقشے اور صورت اور ہر ایک کیفیت زندگی میں ذرا سی بھی نمایاں تبدیلی ہونے کے لئے بیسیوں بلکہ سینکڑوں صدیوں کی ضرورت ہے۔ اس بے انتہا دھیمی مگر نہایت باقاعدہ نجمی نشوونما اور ترقی کے خیال سے بھی انسانی دل پر وہی اثر ہوتا ہے جو ان سیاروں کے حجم کی عظمت اور ان کی تعداد کی کثرت کے تصور سے ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت جلد باز نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قدرت کے کارخانے میں نہ کوئی شے دفعتاً پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ کوئی چیز یکبارگی غائب ہو جاتی ہے۔ نہ صرف اس کرۂ زمین کی ترقی بلکہ تمام اجرام فلکی کی نشوونما ایسی بطیٔ الحرکت اور سست رفتار ہے کہ بجز ان کے جن کی بقا کو فنا نہیں اور کوئی نہ اس ترقی کو محسوس کر سکتا ہے۔ نہ ان تبدیلیوں کو دیکھ سکتا ہے۔ یہ آسان ہے کہ زمین کے مختلف مدارج ترقی کو

ہم سینکڑوں ہزاروں یا لاکھوں برس کے معیار سے شمار کریں۔ مگر انسانی دل و دما
کی موجودہ حالت میں یہ ممکن نہیں کہ ہم سیاروں کے بچپن۔ طفولیت اور شباب وغیرہ
کی مدتوں کا تصور کریں۔ بہرحال تاریخ ارضی اور تاریخ آثار حیات کی ترقی کی
سستئ رفتار ہر شخص کے دل میں پوری طرح جمی ہوئی ہونی چاہیئے۔ جبکہ وہ حیوان
ناطق کی ابتدائے آفرینش پر غور کرنے والا ہو۔ یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا
ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہم تاریخ ارضی کے لحاظ سے عالم حیات کے کون سے
درجے پر ہیں۔ کیا ہم عالم حیات کی ابتدا ہی میں ہیں یا وسط کے قریب پہنچ چکے
ہیں۔ یا اس پُر شان مجلس کے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ بات یہاں مان
لینی چاہیئے کہ ہماری نوع کی زندگی معقول طویل ہوگی۔ یہ بات نہ قیاس میں آتی
ہے۔ نہ عقل کے مطابق معلوم ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کا آغاز اور انجام باہم
متصل ہی ہو۔ ہر بات جسے ہم جانتے ہیں۔ اور جس پر ہم غور کرتے ہیں۔ ہماری
نوع کی عمر طبعی کی درازی اور طوالت کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ اگرچہ یہ بجا ہے
کہ قدامت انسانی قدامت نباتی کے برابر نہیں ہے۔ مگر اس کرۂ زمین کا منشا
(اگر اس کا کوئی منشا ہو۔ جو کہ ضرور ہونا چاہیئے) سوائے اس کے کہ بنی آدم اس پر
تصرّف اور تسلّط کریں اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور ہم یہ گمان کرنے کے پورے مجاز
ہیں کہ ہماری نوع کا آغاز ماضی میں اور انجام مستقبل میں بہت دور تک پہنچتا
ہے ؛

اس سوال کے حل کرنے کے لئے ہم کو پھر اسی اصلی شرط کی طرف پلٹنا چاہیئے
جس پر وجود انسانی کا مدار ہے یعنی کیفیّت حرارت۔ حیات انسانی کا ظہور اور
حیات انسانی کا قیام ابتدا سے حرارت کی جاں بخش کیفیّت پر مبنی ہے۔ اور انتہا
تک اس پر مبنی رہیگا۔ دنیا میں ایک زمانہ تھا۔ جبکہ حرارت ضروریات زندگی سے
زیادہ تھی۔ دنیا میں ایک زمانہ آئیگا جبکہ حرارت ضروریات زندگی سے کم ہوگی۔
ہمارا کرہ جو ایک زمانے میں گرمی سے کرۂ نار بنا ہوا تھا آخر میں عالم یخ بن گیا۔ اس
کے مسلسل دَور سے اس کی اندرونی گرمی کا بڑا حصّہ خارج ہو گیا۔ اور یہ عمل اخراج
اب بھی جاری ہے۔ جس طرح اور معمولی جسم زیادہ سرد اشیا کو چھونے سے اپنی گرمی

Marfat.com

زائل کردیتے ہیں۔ اسی طرح زمین بھی اپنے مدار میں دوڑنے سے اپنی گرمی آہستہ آہستہ ضائع کرتی جاتی ہے۔ اور اس طرح اس کی قیام حیات کی قابلیت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے ٭

لیکن اس کمی کے پورا ہونے کے دو بڑے ذریعے ہیں۔ اوّل تو خود کرۂ زمین کا اندرونی آتشدان۔ جس نے اس کا تمام اندرونی حصّہ گھیر رکھا ہے۔ اور جو بیرونی سطح زمین کی وجہ سے سرد مہر ہو رہا ہے۔ دوسرے آفتاب کی دائمی امداد ٭

انسانی زندگی اپنے وجود کے قیام کے لئے مذکورۂ بالا دونوں ذریعے بطور مناسب استعمال کرتی ہے۔ لیکن اس کے قیام اور دوام کے لئے بہترین حالت وہ ہے جبکہ اس کرے کی حرارت برآمد و درآمد برابر ہو۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ حیات انسانی کا وسطی زمانہ وہی ہوگا۔ اور وہی ترقی انسانی کا کمال۔ اور وہیں سے عروج انسانی کا زوال ہوگا۔ کیونکہ وہ حالت دنیا پر انسانی آبادی کی بہتات۔ انسانی نسل کے قیام اور انسانی زندگی کے طول کے لئے نہایت مناسب اور مفید ہوگی ٭

اور اگر یہ اعتدال کی حالت قائم رکھی جا سکے۔ تو کوئی وجہ معقول نظر نہیں آتی کہ کیوں نوع انسان ابدالآباد تک یہاں آباد نہ رہے۔ اس نہایت مناسب اور موافق صورت کے پیدا ہونے سے پہلے تمام (محرور المزاج) گرم خون والے جانور جن میں انسان بھی شامل ہے ناموافق اور مضر حالتوں میں ہیں۔ کیونکہ ان کو سطح زمین کی حرارت کی غیر ضروری بیشی سے بے شمار نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ مثلاً بے قاعدہ نشوونما قبل از وقت جوانی۔ عصبات کا زیادہ فکی الحس ہونا اور اس کے ساتھ تیز مزاجی اور زود رنجی۔ اور مختلف کمزوریاں۔ اور اور سینکڑوں خرابیاں جن میں ہم آج کل بھی گرم سیر ملکوں کے باشندوں کو مبتلا پاتے ہیں ٭

اس کے برعکس جبکہ وہ زمانۂ اعتدال گزر جائیگا۔ جیسا کہ ضروری اور یقینی ہے۔ تو زندگی کی کش مکش اور صورت میں ہوگی ٭

جب حرارت کا خروج دخول سے زیادہ ہوگا تو آدمی اور بلاؤں میں مبتلا ہوگا۔

Marfat.com

اور قیام حیات کے لئے گرمی کی کمی کو مصنوعی وسیلوں سے پُر کرنا پڑیگا ۔ اور انسانی کوششوں کا قیمتی نتیجہ اس قدرتی نقصان کی تلافی میں خرچ کرنا پڑیگا۔ آئندہ زمانے میں آنے والی نسلوں کو یہ مصیبت جھیلنی لازمی ہے۔ اور امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ان کی محنتیں روز افزوں سردی کی وجہ سے زیادہ دشوار ہوتی جائینگی۔ اس لئے زمانہ اعتدال کے بعد انسانی کمال کا زوال اور قانون قدرت کے مطابق اس کی ترقی کو تنزل ہوگا۔ ہاں اس زمانے تک البتہ ہماری جسمانی اور دماغی طاقتیں (اور خدا کرے ان کے ساتھ اخلاقی حالت بھی) ترقی پذیر ہونگی۔ مگر اس کے بعد ہماری قوتیں رو بہ کمی ہو جائینگی ۔ اگرچہ امید ہے کہ بہت آہستہ۔ مگر ضرور۔ کیونکہ قوانین قدرت کی اطاعت سے چارہ نہیں۔ علم ہیئت اور فلسفے نے اپنی متحدہ تحقیقات سے کرۂ زمین کی موجودہ حالت اور حیات انسانی سے اس کا تعلق دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ سائنس کی نہایت ہی فاضلانہ معلومات سے اس سوال کا جواب چاہا گیا ہے۔ اور جواب یہ ہے کہ ہمارا کرہ ہماری زندگی کی مناسبت کے لحاظ سے ابھی درجۂ اعتدال تک نہیں پہنچا۔ اور ابھی پہنچنے میں بہت دن باقی ہیں۔ یعنی ابھی تک حرارت کی درآمد برآمد سے زیادہ ہے۔ اگرچہ فرق پہلے کے برابر ہرگز نہیں رہا ہے۔ مگر ہوں جوں ہم اعتدال حرارت کے منتہا کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ اُسی قدر بعض موافق اسباب ہمارے پہنچنے کی رفتار کو دھیما کرتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح انسانی ترقی کا میدان وسیع ہوتا جاتا ہے۔ غالباً ناظرین کو ان موافق اسباب کے معلوم کرنے کا شوق ہوگا۔ وجہ یہ ہے کہ اگرچہ آفتاب کی امداد ہمیشہ یکساں ہی رہتی ہے۔ مگر وہ حرارت جو زمین اپنے دور میں ضائع کر رہی ہے۔ برابر کم ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ خود اس کا ضائع ہونا اس کے نکلنے کی قوت کم کرتا جاتا ہے۔ یعنی زمین کی اندرونی حرارت کے ضائع ہونے سے زمین کی اوپر کی سطح زیادہ مضبوط اور مستحکم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس طرح زمین ہماری نوع کی درازی عمر کے لئے اپنے قیمتی خزانے کو زیادہ حفاظت سے رکھ سکتی ہے ۔

Marfat.com

غرض مذکورۂ بالا تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ ہم ابھی اپنی زندگانی نوع کے لحاظ سے دنیا کے زیادہ مناسب حصّے پر ہیں۔ سوائے ان باتوں کے جو یہاں بیان کی گئی ہیں بعض اور دلیلیں بھی ہیں جن سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ابھی نوع انسان کے لئے سب سے زیادہ مناسب اور مفید زمانہ نہیں آیا۔ اور یہ صرف علم ہیئت کی ہی تحقیقات نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے زمانے کے تمام نہایت ہی لائق اور قابل تعظیم فاضلوں کی متحدہ رائے بھی یہی ہے کہ ابھی کرۂ زمین کی حرارت کا دخل خرچ سے کم ہے +

اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ابھی ہماری ترقّی کا زمانہ بہت ہے۔ اور ہم اپنا دل اس خیال سے خوش کر سکتے ہیں۔ کہ ابھی نوع انسانی اپنی بھرپور جوانی پر نہیں پہنچی۔ ہم اس عالم پر اپنے پہنچنے کی رفتار کا اندازہ نوع انسانی کے گزشتہ حالات سے لگا سکتے ہیں۔ کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہماری ترقّی کی رفتار اب تک ہر طرف سے اس قدر دھیمی رہی ہے۔ کہ تاریخی زمانے کے اندر اندر ہی ایسے وقت موجود ہیں جن میں انسانی زندگی بالکل ساکن یا زیادہ سے زیادہ نہایت ہی ہلکی رفتار سے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ اور بعض وقت تو بالکل صاف ترقّی معکوس نظر آتی ہے۔ اور اس میں انسان کی جسمانی۔ دماغی اور اخلاقی ہر قسم کی ترقّی شامل ہے +

لیکن اگر ہم ذرا زیادہ وسعت نظر سے کام لیں تو ترقّی معلوم تو ضرور ہوتی ہے۔ مگر بہت دھیمی۔ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ نوع انسان ادنےٰ درجے سے اعلےٰ کی طرف چڑھ رہی ہے۔ اس کے افراد کی عمریں پہلے سے زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ عقلیں زیادہ تیز ہیں۔ بالخصوص اشیائے طبیعی کے علم میں اور اسباب قدرت کی زبردست طاقتوں کو اپنا مطیع اور اپنے لئے مفید بنانے میں۔ ان کی آرزوئیں زیادہ پاکیزہ ہیں۔ کامیابیاں زیادہ اعلےٰ ہیں۔ مقاصد زیادہ بلند ہیں۔ اور وہ انتظام کائنات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتے ہیں +

اس جگہ ہم کو پھر خیال آتا ہے۔ کہ جب تاریخی زمانے کے اندر اندر انسانی ترقّی اتنی کم ہے کہ صاف معلوم بھی نہیں ہوتی تو وہ زمانہ جس میں کہ انسان نے

Marfat.com

یہ کل ترقّی کی ہے کس قدر ہوگا؟ ریاضی داں کے لئے یہ بات آسان ہے کہ ایک قطعہ دائرہ کو دیکھکر تمام دائرے کی کیفیّت دریافت کرلے۔ اسی طرح ہمارا مذکورہ بیان علم الاقوام اور علم فلسفہ کے فاضل کو ہماری تمام نوع کی ابتدائی کیفیّت بتلانے کے لئے کافی ہے۔

تاریخ ہم کو بنی نوع انسان کے کئی ہزار سال کے حالات سے اطلاع دیتی ہے۔ اور یہ اطلاع اس تاریخی زمانے کے ابتدائی لوگوں کے مختلف کاروبار اور ان کے عادات واطوار کا سچّا خاکہ ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض باتوں میں اس تمام عرصے میں بھی کوئی نمایاں ترقّی نہیں ہوئی۔ مثلاً محض دانش و فہم میں آج کل کی ترقّی یافتہ قومیں پُرانے زمانے کی اکثر مشہور قوموں سے بڑھنا تو کجا لگّا بھی مشکل سے کھاتی ہیں۔ لیکن اور مختلف امور میں ترقّی ظاہر اور صاف ہے۔ مثلاً درازی عمر یا مطالعۂ قدرت میں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ مگر بالخصوص سب سے زیادہ ترقّی اسباب معاش اور سامان خوراک حاصل کرنے میں ہوئی ہے۔ آج کل بحر و بر نے اپنے خزانوں کے منہ کھول رکھے ہیں۔ زمین کی قابلیتیں معلوم کر کے ان کو مفید اور کارآمد بنایا گیا ہے۔ اور یہ ام الامہات اپنے بچّوں کے پالنے کے لئے ہر فصل اور ہر موسم میں اپنے وسیع دامن کو اپنی بیش بہا نعمتوں سے بھر دیتی ہے۔ اسی طرح علم کی ترقّی اور استعمال میں آج کل کا زمانہ گزشتہ زمانے سے بہت آگے ہے۔ نوع انسانی اپنے گرد و نواح کے قانونوں اور قاعدوں سے واقف ہوگئی ہے۔ اور قدرت دشمن سے دوست بنالی گئی ہے۔ علم طبعیات کے چلتے ہوئے جادو نے ان عنصروں کو جو اتنے دن تک ہمارے بدخواہ سمجھے جاتے تھے۔ ہمارا ہوا خواہ بلکہ فرماں بردار بنادیا ہے اور سامان معیشت ہر جگہ بکثرت دستیاب ہوسکتا ہے۔

یہ تمام باتیں جن کا ذکر صرف آمد کلام میں ایک اشارہ کی طرح کیا گیا ہے۔ عملاً زمین کی قیام حیات کے لئے بہتر قابلیت کی شہادت دیتی ہیں۔ اور یہ ترقّی یافتہ زمانہ اور روز افزوں ترقّی کرنے والے حالات علم ہیئت کے اس مسئلے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مگر دلیل کا اصلی مقصود اور پورا زور اس بات پر ہے کہ جب

کئی ہزار سال کی مدت میں انسانی ترقّی اس قدر خفیف ہے تو تمام انسانی ترقّی کا دائرہ کتنا وسیع ہوگا۔ اور اس نے کتنا وقت لیا ہوگا۔ ہمارے علم و یقین کے دائرے میں ہر بات اور ہر چیز نوع انسانی کی درازی عمر کی طرف اشارہ کرتی ہے اور وہ تمام حالات جن کے زیر اثر ہم اب ہیں۔ یا گزشتہ زمانے میں تھے۔ بڑی سختی سے اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ ہم بقائے نوع کے آغاز یا انجام کے قریب ہیں۔ اگرچہ حیات ارضی کا حیات انسانی سے زیادہ لمبا ہونا بالکل بدیہی اور ضروری ہے کیونکہ جیسے ظہور انسانی سے پہلے لاکھوں کروڑوں برس تیاری کے لئے ضروری تھے۔ غالباً ویسے ہی اس کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی لاکھوں کروڑوں برس اور آنے والے ہونگے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان دونوں کے آثار باہم اتنے وابستہ ہیں کہ ہم کو بالکل یقین ہے کہ وجود انسانی کا آغاز اب سے گزشتہ کئی سو صدیوں پہلے ہوا۔ اور اسی طرح اس کا انجام بھی اب سے آئندہ کئی سو صدیوں بعد ہوگا۔ اس جگہ اگر ہم مجملاً منشائے کائنات کا ذکر کریں تو کچھ بیجا نہ ہوگا۔ یہاں ہم اس منشا کی تائید کرنا نہیں چاہتے جو گزشتہ صدی کے علمائے مذہبی نے اتنے زور شور سے قرار دے رکھا تھا۔ نہ ہم اور اجرام سماوات اور اجسام کائنات کے بامدعا ہونے کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔ جن میں ہمارا یہ کرہ اتنا ناچیز اور بے وقعت ہے۔ انتظام کائنات کی ترتیب ایسی ہی بدیہی اور ظاہری ہے جیسے آثار کائنات کی عظمت و شان اور بوقلمونی ہوگوناگونی ؎

بچشم مصلحت بنگر مصاف نظم ہستی را
کہ ہر خارے دریں وادی درفش کاویان بینی

اگر وہ چیز جس کو پرانے زمانے کے داستاں گو (Chaos) حالت پریشانی کہتے تھے۔ کسی زمانے میں کچھ وجود رکھتی بھی ہوگی تو اب مطلق نابود ہے۔ آج کل کی نہایت طاقتور دوربینوں نے نظر انسانی کو ہزاروں لاکھوں میل کی چیزیں دیکھنے کی قوت بخش دی ہے۔ اور ہمارے اس عظیم الشان نظام شمسی کا ایک ذرہ بھی بے ترتیب یا پریشان معلوم نہیں ہوتا۔ وہ ننھے ننھے تاروں کا حلقہ جو اس میں نظر آتا ہے

Marfat.com

غالباً کسی قدیمی کُرے کا مدار یا اُس کے باقی ماندہ ریزے ہیں۔ لیکن ان پر بھی اور تمام چیزوں کی طرح قانون نے اپنا شاہانہ سایہ ڈال رکھا ہے۔ غرض کائنات کی ہر چیز ایک خاص تسلسل کا جزو اور ایک عجیب ترتیب کا حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ مناسبت نمایاں ہے۔ عقل اس پر حکمراں ہے۔ منشا اور مدعا نظر آتا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ کائنات عقل و تمیز اور غایت و غرض کے رہنے کی جگہ ہے +

ہم کائنات میں ایک منصف اور عقلمند ذات کے وجود اور اس کی ترتیب و غرض اور غایت کے آثار کی بحث کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتے۔ مگر اس مختصر بیان سے بھی یہ تو ظاہر ہو جاتا ہے کہ تمام ستارے اور بالخصوص ہماری زمین ہم جیسے ہی جاندار ان خردمند و با تمیز کا مسکن ہے۔ یہ بات مان لینے کے بعد یہ تسلیم کر لینا بالکل قرین قیاس ہے کہ یہ عالم دیرپا اور پائدار بھی ہوگا۔ کیونکہ کسی کُرے کو آباد مان کر بھی اس کی ہمیشگی یا کم از کم طویل العمری کو نہ ماننا طبعاً بے معنی اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ آخر کیا وجہ کہ اتنے عظیم الشان سیارے بہترین مخلوق کے رہنے کے لئے بنائے جائیں۔ مگر عارضی اور چند روزہ ہوں۔ **ان عقلمند حیوانات کے سب سے** پیچھے آنے اور سب سے جلدی جانے کے لئے قیاس کونسا سبب تجویز کر سکتا ہے؟

دیر آمدن و شتاب رفتن — آئین کدام آشنائیست

اگر مثلاً ہماری زمین میں شروع ہی سے قابلیّت حیات کے آثار اور اسباب موجود تھے۔ جیسے کہ ہمارے خیال میں تمام ستاروں میں ہیں۔ تو ان لا انتہا مدتوں اور کروڑ در کروڑ سالوں کی تیاریوں سے کیا فائدہ۔ جن کا نتیجہ نوع انسانی کا عارضی اور جلد مٹ جانے والا ظہور ہونے والا تھا۔ عقل صحیح تو ہر طرح سے اسی پر زور دیتی ہے کہ ہستی انسانی کا آغاز زمین کی قابلیت رہائش کی ابتدا سے ہو اور اس کی انتہا تک رہے داناؤں کے ایک خاص فرقہ کی یہ منطق بڑی عجیب ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ زمین نوع انسانی کی رہائش کے لئے آراستہ کی گئی۔ مگر پھر بھی اس کی سرسبز اور شاداب سطح لاکھوں کروڑوں برس تک بیکار اور فضول پڑے پڑے اس کے آنے کا انتظار کرتی رہی۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ تمام بحث صرف اسلئے کہ چند پرانی سراپا غلط کہانیوں کی تاکید و تائید ہو سکے۔ ہم قدرت کے متعلق

Marfat.com

ایسی کوتاہ بینی اور کم نظری کو یکبارگی نظر انداز کر سکتے ہیں - اور کہہ سکتے ہیں کہ یہ پرانے زمانوں کی تاریکی اور جہالت کا خیال تھا - کیونکہ قیاس صحیح اور سائنس کی متعلقہ تحقیقات جس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں نوع انسان کے وجود ارضی کو زمانہ ماضی اور مستقبل میں محدود کر چکی ہے - اس لئے ہمارا عمرِ نوعِ انسان کی بابت اندازہ یہی ہے کہ وہ ان حدود مقررہ کے اندر اندر پوری طرح پھیلی ہوئی ہے - قیاس اور واقعات سب کا نتیجہ یہی ہے کہ ان حدود میں انسان کے آغاز کے لئے اوّل سے اوّل ممکن تاریخ مقرر کی جاے - اور اس دنیا میں جس میں دانش اور عقل کی حکومت ہے - عقل کے نتیجے قبول کرنے چاہئیں - اور جس شخص کے دل میں کوئی تعصّب یا پرانی غلط فہمیاں جمی ہوئی نہیں ہیں - اسے مذکورۂ بالا بحث کے قبول کرنے میں کلام نہیں ہو سکتا +

اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ہماری عمر نوعی تاریخ ارضی کے ایک معقول گزشتہ زمانے پر حاوی ہے - اور کوئی شخص جو اس عالم میں کسی ترتیب اور غرض کا قائل ہے اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہماری زمین اور نظام شمسی کا مدعا ہماری نوع کی طول بقا ہے - سب سے آخری بات یعنی یہ کہ ابھی ہماری نسل اپنے درجہ کمال پر نہیں پہنچی - ہم کو سائنس کی تحقیقات کے ہاتھوں قبول کر لینی چاہیے +

باب سوم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم طبقات الارض کی رائے

اب ہم علم ہیئت کو چھوڑ کر علم طبقات الارض کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہاں ہم خود کرۂ زمین کی ابتدا اور عمر پر بحث نہیں کرنا چاہتے۔ کیونکہ وہ سوال ہمارے موجودہ بیان سے باہر ہے۔ بلکہ ہم صرف ابتدائے آفرینش انسانی پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ یہ علم بالکل نو ایجاد ہے۔ اور باقی تمام علما کی تحقیقات مل کر بھی انیسویں صدی کی معلومات کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اب تک ہمارے کرے کی بناوٹ اور اور ساخت قرار واقعی تحقیق نہیں ہوئی تھی۔ لیکن گزشتہ چند دنوں کی کوششوں نے سطح زمین کی کیفیات اور اسکے طبقات کو غالباً صحیح معلوم کر لیا ہے۔ ہم ابتدائے وجود انسانی کا وقت دریافت کرنے کے لئے اس تحقیق کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

زمین کی تہ میں ازوزاک (Eozoic) یا نیستی کا زمانہ ہے۔ اس کے اوپر دوسرا زمانہ (Palaeozoic) یا ہستی قدیم کہلاتا ہے۔ اس کے اوپر (Neozoic) یا ہستی جدید کا زمانہ ہے۔ جو موجودہ سطح تک آتا ہے۔ اور جس میں حال کے آثار زندگی بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ سہولت کے لئے زمانہ ہستی جدید کو پھر دو حصوں پہ تقسیم کیا ہے۔ نیچے کے طبقے کے زمانے کو (Mesozoic) یا زمانہ ثانیہ۔ اور اوپر کے حصے کو (Tertiary) یا زمانہ ثالثہ کہتے ہیں۔ اور اس کے اوپر حال کی سطح کی ساخت کا زمانہ ہے۔ جسے (Quarternary) یا زمانہ رابعہ اور (Pleistocene) یا زمانہ اقربہ کہتے ہیں۔

اس تقسیم میں وہ بھی شامل ہیں جن کو زمین کے آثار متحجرۂ محفوظہ کے طبقے کہتے ہیں (Fossiliferous) اور جو دنیا کے موجودہ نباتات اور حیوانات سے لیکر زمانہ نیستی کے بے جان طبقوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔

Marfat.com

ان طبقات ارضی کی ساخت اور ان مذکورہ زمانوں کے طول عظیم کی طرف اشارہ کرنا گویا ناظرین کو کم فہم قرار دینا ہے۔ کیونکہ کون ایسا احمق ہو سکتا ہے جو ان کاموں کی بے انتہا آہستگی اور ان زمانوں کی بے حد لمبائی میں شک کریگا۔ ابھی تک انسانی کوشش ان زمانوں کی صحیح میعاد معلوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو اکثر تحقیقات میں مفید ہوتا ہے اور جسکی نئی معلومات سے مناسب تصحیح ہو سکتی ہے۔ ابھی تک اس علم کی ترقیوں کا میدان اتنا پھیلا ہوا ہے کہ ہر سال اپنے ہمراہ نئی واقفیت اور نئی تحقیق لاتا ہے۔

یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کون سے ممکن ذرائع ہیں جن سے محقق ان قدیم گزرے ہوئے زمانوں کے امتداد وقت کا عملی نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ اس بجا شبہ کے جواب میں ہم مثالاً وہ چند واقعات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ جن کے متعلق تحقیقات ہو چکی ہے۔ اوّل تو یہ کہ زمین کی دائمی تبدیلی جواب بھی برابر اپنا کام کر رہی ہے۔ تحقیقات کے معائنے اور سائنس کے پیمانے سے معلوم کی جاتی ہے۔ سطح زمین کا دھیما مگر دائمی تغیر۔ اس کی ناہمواریوں کی کمی اس کا مسطح ہونے کی طرف میلان۔ اس کی بعض خاص قسم کے نباتات اور حیوانات کی زندگی کی قابلیت میں نمایاں فرق اور اور بہت سی باتیں جو اس کے مشہور و معروف آثار ہیں۔ ایک عرصے تک سائنس کی باریک بین عینک سے دیکھے جا چکے ہیں۔ اور اب ان سے گزشتہ اور آئندہ دونوں زمانوں کے متعلق نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قدرت کی یکسانیت کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے۔ جس پر حقیقت میں تمام علوم طبیعیات کا مدار اور انحصار ہے۔ ہم بے تامل اس بات کی یقین کر سکتے ہیں کہ وہ قدرتی انقلاب جو ہم آج اپنے اردگرد کام کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ وہی انقلاب ہیں۔ جنہوں نے زمانہ گزشتہ کے کروڑوں سالوں میں ہماری سطح زمین کو اس کی موجودہ صورت و شکل دی ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ہم مختلف زمانوں میں اس انقلاب کی یکسانیت کا دعوے نہیں کر سکتے۔ کیونکہ خود تاریخی زمانے ہی میں تجربے اور مشاہدے نے دکھا دیا ہے کہ اس انقلاب کی رفتار

Marfat.com

اکثر بدلتی رہتی ہے۔ بعض وقتوں میں یہ تبدیلی زیادہ جلد ہوتی ہے۔ لیکن بہر حال تاریخ طبقات الارض کی گزشتہ کیفیتوں اور مدتوں کے معلوم کرنے میں طرزِ انقلاب کے ساتھ رفتارِ انقلاب کو بھی سائنس کی معلومات کے حوالے کر دینا چاہئے۔

شاید اسی سلسلے میں مذکورۂ بالا عام قواعد انقلاب کی چند عملی مثالیں دینا زیادہ مناسب ہوگا۔ مثلاً ایک ایسے انقلاب کی مثال جس سے امتدادِ وقت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وادیٔ نیل کی وہ تہیں ہیں جو سالانہ سیلاب کے ساتھ آکر وہاں جم جاتی ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ وادیٔ نیل کی یہ سالانہ خاک تہ نشین نمایاں و بارزت رکھتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کہے کہ یہ سالانہ پرت چوتھائی انچ موٹا ہوتا ہے تو یہ بات بعید از عقل معلوم نہ ہوگی۔ مگر ذرا سے غور سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس حساب سے وادیٔ نیل مدتوں سے نابود ہو چکی ہوتی۔ اور دریا پھر اپنے منبع کی طرف لوٹ گیا ہوتا۔ ہر سال ایک چوتھائی انچ کے حساب سے ایک صدی میں دو فٹ سے زیادہ موٹی تہ جم جانی چاہئے۔ اور ہزار برس میں ۲۰ فٹ سے بھی کچھ زیادہ۔ سیزر کے زمانے سے اب تک ۴۲ فٹ کے قریب اور ریمسس (فرعون) کے زمانے سے سو فٹ سے بھی اوپر۔ لیکن اصل امر واقعی یہ ہے کہ تاریخی زمانے کے اندر اندر اس سالانہ خاک تہ نشین سے اس وادی کی بلندی دمیاط کے قریب ۵-۶ فٹ سے زیادہ نہیں بڑھی۔ جس سے فوراً نتیجہ نکل آتا ہے کہ سالانہ پرت معمولی کاغذ کے تختے سے زیادہ موٹا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ نہایت ہی ناچیز پرت جب ایک دفعہ صحت کے ساتھ ماپ لیا گیا تو پھر نہ صرف تاریخی زمانے کے لئے بلکہ تاریخ طبقات الارض کے لئے بھی ماضی اور مستقبل میں یکساں درست اور صحیح معیار ہے۔ ساتھ ہی یہ انقلابات ارضی کی باقاعدگی اور آہستگی کی ایک نہایت پاکیزہ اور عمدہ مثال ہے۔ جن سے زمین کی موجودہ سطح بنی ہے۔ اور یہ حد بندی ہوئی ہے۔

مادی تبدیلیوں کے ذریعے سے وقت کی پیمائش کی ایک اور مثال درج ذیل ہے۔ ایک زمانہ تھا جبکہ تمام کرۂ زمین مائع حالت میں تھا۔ اور اس زمانے میں زمین کی گردش محوری کی رفتار جس قدر تیز ہوتی اسی قدر خط استوا

Marfat.com

کے آس پاس کا پھیلاؤ زیادہ ہوتا۔ اور اگر یہ رفتار بہت زیادہ تیز ہو جاتی تو زمین ایک پتلا پہیہ یا گول طباق بن جاتی۔ اس کے برخلاف اگر یہ رفتار ابسی ہی سست ہوتی۔ جیسی کہ مثلاً ہمارے چاند کی ہے۔ تو خط استوا کے موجودہ فراز کا پتہ بھی نہ لگتا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خط استوا کے قریب کی بلندی اتنی زیادہ ہے کہ ہماری زمین کی موجودہ رفتار سے اس کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب زمین مائع یا نیم مائع حالت میں تھی اور جب اس کی صورت اس کی گردش محوری کی رفتار پر منحصر تھی اسوقت وہ رفتار موجودہ رفتار سے زیادہ تیز تھی۔ اور پھر جب سطح زمین جم کر سخت ہو گئی تو پھر زمین کی قطبین پر سے بیٹھی ہوئی نارنگی کی سی کروی صورت اس کی نمایاں سست رفتاری کے باوجود بھی قائم رہی۔ اب علم ہیئت کی تحقیقات اس فرق رفتار کی انتہا معلوم کر سکتی ہے۔ اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد زمین کا موجودہ شکل اختیار کرنے کا وقت معلوم کرنے میں کچھ دقت نہیں رہتی۔ اور وہ زمانہ بآسانی دریافت ہو سکتا ہے جبکہ زمین کا کرہ نیم مائع حالت میں تھا۔ سر ولیم ٹامسن نے فوریئر کے مسئلے پر کار بند ہو کر ایک نہایت طول طویل اور پیچیدہ دلیل سے ثابت کیا ہے کہ اس زمانے کی حد اولےٰ زمانہ حال سے کم سے کم ۲ کروڑ برس دور ہو چکی ہے۔ یہ بات اس نے از روے حساب اور مسلمہ اصول طبعیات کے مطابق ثابت کی ہے۔ اس لئے اس کی صحت میں شک کرنے کی کوئی بجا وجہ نہیں ہے لیکن اگر ہم اس مدت کو بالکل صحیح نہ بھی مانیں تو یہ ماننا تو ضرور پڑتا ہے کہ کرۂ زمین کی موجودہ صورت اختیار کرنے کا وقت اس مدت کے قریب ہی قریب تھا جو سر ولیم ٹامسن نے معین کی ہے۔

لیکن سطح زمین بالکل منجمد ہونے سے پہلے ہی حیات نباتی و حیوانی کا گاہ بن چکی تھی۔ اور ابتدائی درجے کے جانوروں اور درختوں نے اس کی اس خشک اور سخت ساخت سے پہلے ہی یہاں اپنا عمل دخل شروع کر دیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم طبقات الارض کے لحاظ سے آثار حیات کا اظہار زمانہ نیبتی کے ختم ہونے پر اور اس مدت سے بہت پیشتر ہو گیا تھا جو

سطح زمین کے انجماد کے لئے معین کی گئی ہے۔ اور علما نے اس کی مدت کے تخمینے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ سطح زمین کے اکثر طبقے اس رفتار سے بنے ہیں جس رفتار سے وہ تاریخی زمانے کی ابتدا سے لیکر اب تک بنتے آئے ہیں۔ تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ آثار حیات کا تمام زمانہ انجماد سطح زمین کی مدت سے ۳-۴ یا ۵ گنا زیادہ ہے۔ ڈاکٹر جیمس کرول نے زمین کی سطح بر و بحر پر آثار حیات کے اظہار کی ابتدا کم از کم ۶ کروڑ برس دور خیال کی ہے۔ اور اور بڑے بڑے محققوں نے انہی وجوہات سے اس تخمینے کو کم کرنے کی بجائے زیادہ ہی کیا ہے۔ چنانچہ سر ولیم ٹامسن نے اس کی حداد نے کو ۱۰ کروڑ برس دور ٹھہرایا ہے۔ لیکن نسبتاً انسان کی نو عمری کے سب علما قائل ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ صحیح ترین تحقیقات اور بہترین معلومات کے لحاظ سے غالباً انسان سب کے پیچھے پیدا ہوا ہے۔ انسانی باقیات صالحات صرف زمانہ ثالثہ۔ زمانہ رابعہ اور زمانہ اقربہ کے بنے ہوئے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم زمانہ طوفانی کے پرے عدم وجود انسان کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ اور ممکن ہے کہ ہم جیسے حیوان زمانہ تاریخ سے پہلے یہاں رہتے سہتے ہوں۔ مگر اس کے تسلیم کرنے کی کوئی وجہ۔ اور اس کی صحت کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ تجربے اور مشاہدے نے یہ بھی دکھایا ہے کہ ذات انسانی کے آثار اور بقیے جلد مٹ کر اپنے عناصر میں مل جاتے ہیں اور اگر انسانی لاش کھلی چھوڑ دی جائے تو چند دن میں قدرتی طاقتیں اسے فنا کر دیتی ہیں۔ یعنی اس کی گیسیں ہوا میں مل جاتی ہیں۔ اور باقی اجزا خاک ہو جاتے ہیں۔ جسم انسانی کو طبقات ارضی کے ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک محفوظ رکھنے کے لئے نہایت ہی موافق اور مناسب اسباب ہونے چاہئیں۔ اور جہاں ایسے اسباب موافق واقعی موجود ہوں۔ جیسے کہ ہم آگے چل کر دیکھینگے۔ وہاں ہماری نوع کے بقیے بالکل صحیح سلامت باقی رہ جاتے ہیں۔ اور ذرا سی بھی تبدیلی ان میں راہ نہیں پاتی۔ اس بارے میں اجسام نباتی و حیوانی میں پوری مطابقت ہے۔ کھلے پڑے رہنے سے گیہوں اور اور پودوں کے بیج چند دن میں ضائع

Marfat.com

ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ گیہوں کے دانے جو مصری ممیوں کے ساتھ پائے گئے ہیں۔ ان میں ۳ ہزار برس سے زیادہ گزر جانے کے بعد بھی نشو و نما کی طاقت باقی ہے۔ اور ایسی صرف ایک مثال ہی حیوانات اور نباتات کی حفاظت کا قانون ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس لئے طبقات الارض کے ابتدائی زمانوں کے انسانی بقیوں کی نایابی ان زمانوں میں عدم وجود انسانی کی حتمی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ یہ نایابی کسی اثباتی دلیل کے نہ ہوتے ہوئے محض قیاس کی تردید کے لئے کافی ہے۔

اس سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہم کو زمین پر ابتدائے انسانی کے لئے زمانہ طوفانی کے بعد کے حالات پر غور کرنا چاہئے۔ ان اسباب موافق کو واضح کرنے کے لئے ہم کو پھر زمانہ اقربہ کے طبقوں کی خاص خاص کیفیتوں پر نظر ڈالنی ضروری ہے۔ ان بقیوں کی حفاظت کے لئے سب سے زیادہ مناسب جگہ دریا کے قریب کے غاروں کی وہ تہ نشین خاک ہے جو سیلاب وہاں لاکر چھوڑ گئے ہیں۔ یا خود دریاؤں کی اپنی تہ نشین خاک۔ یعنی سنگریزے اور ریت کے اجزا جو پانی کے بہاؤ کے ساتھ چلے آتے ہیں۔ اور کھاڑیوں اور خلیجوں یا دریاؤں کے دہانوں کے قریب پھیلے ہوئے میدانوں میں نیچے بیٹھ جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ زیادہ دلدار تہوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ تیسری مناسب جگہ جھیلوں کی تہ ہے۔ چوتھی جگہ ریت کے وہ ٹیلے ہیں جو بعض جگہوں میں ہوا کے جھونکوں سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ یا کہیں کہیں سمندر اور ہوا کے متحدہ اثر سے بن جاتے ہیں۔ مگر ان سب جگہوں میں سب سے زیادہ موافق اور مناسب وہی پہلی جگہ ہے۔ ایسے غار اکثر پانی کے کاٹ سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہ دریا اپنے کناروں پر اندر ہی اندر نرم چٹان یا خاک کی تہ کو کاٹ کر وہاں بڑے بڑے زمین دوز کمرے اور تہ خانے بنا دیتے ہیں۔ اور پھر عموماً چند دنوں

لہ وہ نعشیں جو مختلف ادویات کے ذریعے سے سالم و قائم رکھی جاتی تھیں۔ اور جو اب تک بعض مقبروں میں سے ویسی ہی محفوظ برآمد ہوئی ہیں۔ نعشوں کی حفاظت کا یہ طریقہ قدیم مصریوں میں بہت رائج تھا۔ اور حال میں ان کے مطالعہ سے قدیم مصر کی تہذیب و تمدن کا بہت کچھ پتہ لگایا گیا ہے۔

Marfat.com

بعد وہاں سے ہٹ کر اپنی اصلی جگہ آجاتے ہیں۔ اور ان جگہوں کو بالکل خشک چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے غار یورپ میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں کے اکثر دریا چاک کے طبقوں پر بہتے ہیں۔ اور یہ طبقے بالخصوص ایسے غاروں کے لئے مناسب ہوتے ہیں۔ پرانے زمانے میں چونکہ برفانی دریا آج کل کی نسبت بہت زیادہ چوڑے اور گہرے ہوتے تھے اسلئے پانی کے زور سے ایسے تہ زمین غار اور لمبی لمبی سرنگیں بکثرت پیدا ہو گئی تھیں ٭

رفتہ رفتہ زمانۂ طوفانی گزر گیا۔ دریاؤں کی طغیانی کم ہو گئی۔ اور پانی کی دھاریں گھاٹیوں کی تہ میں باقی رہ گئیں۔ ان دھاروں سے گھاٹیاں آہستہ آہستہ کٹتی اور زیادہ گہری ہوتی جاتی ہیں۔ چنانچہ امریکہ اور یورپ میں عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ دریاؤں کی دھار بعض دفعہ سطح زمین سے سو سو فٹ نیچے ہوتی ہے۔ تقریباً ہر ایک بڑے دریا کے دونوں طرف دو دو کراڑے نظر آتے ہیں۔ اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹے کراڑے دریا کے موجودہ حجم کا نشان دیتے ہیں۔ اور زیادہ دور کے کراڑے پرانے زمانے کے برفانی دریاؤں کی حد بتاتے ہیں۔ چونکہ پانی کا چڑھاؤ کم ہو گیا ہے۔ اس لئے پہلے کے بنے ہوئے غار اور گڑھے بالکل خشک پڑے ہیں۔ ان کے منہ پہاڑیوں میں دریا کے رخ ہیں۔ اور یہی غار ہوتے تھے جن میں اکثر حیوان اور ابتدائی انسان قدرتاً اپنا ٹھکانا بناتے تھے ٭

تقریباً ان سب غاروں کی تہ میں باریک ریت اور دریائی مٹی کا پتلا فرش پایا جاتا ہے۔ اور اس پر چونے اور کاربن کا ایک مرکب جما ہوا ہوتا ہے۔ جو کچھ حیوانی یا نباتی بقیے یہاں پرانے زمانوں میں چھوڑے گئے تھے۔ وہ عموماً دریائی ریت سے سنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور پھر اس چونے سے گویا ان کا منہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ اب یہ سمجھنا سہل ہے کہ اگر دریاؤں کے اس اُتار کی صحیح مقدار معلوم ہو جائے تو اس زمانے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب کہ یہ بقیے ان غاروں میں چھوڑے گئے۔ اور اسی اعانت کے حاصل کرنے کے لئے ہم نے اس علم کی دقیق تحقیق کی محنت اٹھائی ہے ٭

Marfat.com

یہ بیانات جن کا ذکر آگے بھی کئی بار آئیگا یہاں صرف اس لئے مذکور ہوئے تاکہ زمانہ قدیم کے وقت اور مدتیں معین کر سکنے کا امکان دلنشین ہو جائے +

ناظرین کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہیئے کہ یہ فرش اور پرت بھی جن میں انسانی اور حیوانی بقیے پائے جاتے ہیں بہت وقت میں بنے ہونگے۔ دریاؤں کے نیچے سنگریزوں اور ریت کی تہ بننے کی دھیمی رفتار نہایت مشاق علما اور لائق فاضلوں نے مشاہدہ کی ہے۔ عموماً دریاؤں کی رفتار بہت سُست ہوتی ہے اور جہاں تیز ہوتی ہے۔ وہاں بحکم لزوم ہمیشہ پانی نہایت سخت اور دیرپا سنگین چٹانوں کی دیواروں میں گھرا ہوتا ہے۔ اس لئے عموماً رودخانے بہت آہستہ آہستہ بنتے ہیں۔ لہذا ان عظیم الشان اور گہری گھاٹیوں کو کاٹنے میں کس قدر وقت خرچ ہوا ہوگا۔ جن کی تہ میں ہم آج پانی بہتا ہوا پاتے ہیں۔ اس وقت کو بجائے سالوں اور مہینوں کے صدیوں اور قرنوں سے ناپنا چاہیئے +

یہی سنگریزے اور ریت جو دریا اپنے راستوں پر سے لیتے ہیں۔ کہیں کہیں کناروں پر مگر زیادہ تر دہانے پر جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اس بے انتہا مادے کے جمع ہونے کی پوری مدت کا اندازہ کرنا چاہے تو اسے بچشم خود ان سنگریزوں کے موٹے اور دلدار پرتوں کو دیکھنا چاہیئے۔ جو پانی سینکڑوں میلوں سے اپنے ساتھ لاکر کوسوں کے پھیلاؤ میں بچھاتا ہے۔ نہایت مستند اور مسلم علمائے طبقات الارض نے نہایت غور اور توجہ سے اس خاک نشین کے فرش بننے کی رفتار کا اندازہ کیا ہے۔ اور اگرچہ ان کے نتائج میں بہت اختلاف ہے۔ مگر ان کی ساخت کی آہستگی اور وقت کی طوالت پر سب متفق ہیں۔ پس لازم ہے کہ ان انسانی بقیوں کے لئے بھی جو ایسی جگہوں میں دستیاب ہوئے ہیں۔ بہت معقول قدامت تسلیم کریں +

جھیلوں کی تہوں میں سے بھی بہت سی ایسی اشیا برآمد ہوئی ہیں۔ ان جگہوں میں اکثر انسانی بقیے ایسے جانوروں کے بقیوں کے ساتھ پائے گئے ہیں جن کو معدوم ہوئے مدتیں ہوئیں۔ جس کا مفصّل ذکر ہم پھر کرینگے۔ بہرحال یہاں ہم کو وقت کا صحیح اندازہ کرنے میں وہ کامیابی نہیں ہوتی جیسی کہ

Marfat.com

پہلی دو صورتوں میں ہوئی تھی۔ کیونکہ یہاں وہ یکسانیت نہیں پائی جاتی جھیلوں میں پانی کی آمد اور خاک تہ نشین کی مقدار بالکل غیر معین ہے۔ اور اگرچہ دستیاب شدہ بقیوں کی جگہ۔ اور پانی کی تہ کے نیچے کی گہرائی سے مدت کی طوالت کا خیال کیا جا سکتا ہے۔ مگر علمائے طبقات الارض اس مدت کا صحیح اندازہ کرنے میں پورے کامیاب نہیں ہوئے۔

یہی حال ان ریتلے ٹیلوں کا بھی کہنا چاہیئے۔ جو خاص خاص جگہوں میں ملتے ہیں۔ کیونکہ ان کی صورت میں بھی وقت کا اندازہ اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ وہ طاقتیں جن سے یہ ٹیلے پیدا ہوتے ہیں خواہ بحری ہوں یا بری نسبتاً بہت بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ ان ٹیلوں کی موجودہ صورت ممکن ہے۔ کہ صرف ایک زبردست بگولے نے ریت جمع کر کے پیدا کر دی ہو۔ یا سینکڑوں ہزاروں برس کی متواتر ہوا نے آہستہ آہستہ بنائی ہو۔ لیکن بعض صورتوں میں یہ ٹیلے قطعی انسانی محنت کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ یہ ان ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ڈھیر ہیں جو اکثر ابتدائی انسانوں کے جھونپڑوں کے آس پاس پڑی رہا کرتی ہیں۔ ان صورتوں میں مدت کی درازی تسلیم کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ نہایت آباد شہروں میں بھی سطح زمین کے چند فٹ بلند ہونے کے لئے صدیاں چاہئیں اور شہر بھی آجکل کے۔ جہاں تہذیب چیزوں کو ردی بنا کر پھینکنے میں ایسی سرعت سے کام کرتی ہے۔ اس لئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس ابتدائی کم آبادی اور سادہ روی کے زمانے میں ان ٹیلوں کے بننے کے لئے کتنی صدیاں درکار ہونگی۔ اگر ہم نہایت ہی لائق علما کی قیاس کردہ مدتوں کو لیں تو وہاں بھی یہی نتیجہ خیز اور سبق آموز جواب ملتے ہیں۔ سر چارلس لیل جو علمائے طبقات الارض میں سب سے زیادہ لائق اور مشاق ہے۔ اپنی ایک کتاب میں دریائے مسسپی کے دہانے کی ساخت کی قار کی تحقیق کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس اپت خاک سیلابی کے فرش کا رقبہ ۱۳ ہزار ۶ سو مربع میل ہے۔ سر چارلس نے مختلف جگہ تحقیقات کر کے اس کی اوسط گہرائی ۵ سو ۲۸ فٹ قرار دی۔ ان معلومات سے اس نے

Marfat.com

دریائے مس سپی کی لائی ہوئی تمام تہ نشین اشیا کا اندازہ لگایا - اور تجربوں سے اس دریا نے کے ایک مکعب فٹ پانی میں جمادی اجزا کی کمیّت معلوم کی - چنانچہ ثابت ہوا کہ حجماً پانی کے تین ہزار حصّوں میں ایک حصّہ - اور وزناً ۱۲ سو ۴۵ حصوں میں سے ایک - ریت - مٹّی اور سنگریزوں کا ہوتا ہے - ان تمام حالات میں یکسانیت فرض کر کے سر چارلس لیل نے مذکورہ معلومات سے یہ نتیجہ نکالا کہ ۳ ارب ۷۰ کروڑ ۲۰ لاکھ مکعب فٹ پانی کی سالانہ آمدنی مانکر مس سپی کے دہانے کی موجودہ صورت بننے کے لئے ۶۷ ہزار برس کی ضرورت ہے +

اس حساب میں بعض بڑے بھاری اور بجا اعتراض ہیں - سب سے پہلے اس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا کہ زمانہ طوفانی میں مس سپی جیسے دریا نہایت چڑھے ہوئے ہوتے تھے اس لئے خاک سیلابی کی مقدار حال کی مقدار سے بہت زیادہ ہوگی - زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں - ہم کو برسات میں خود اپنے ندی نالوں اور دریاؤں کی کدورت پر قیاس کر لینا چاہیئے - کہ اس زمانے میں مس سپی کی یہ کدورت زمانہ حال کے جمادی مادوں سے کتنے گن زیادہ ہوگی - ہم اس کا درست اندازہ تب ہی کر سکتے ہیں - جب ہم اس زمانے میں مس سپی کی عظمت اور زور کو آج کل کی حالت سے مقابلہ کریں - اس زمانے کے بھی بعض بڑے دریا جو زیادہ ڈھلوان وادیوں میں واقع ہیں - اپنے پانی کے ساتھ اتنا کچھ سامان بہالے جاتے ہیں - کہ اُن کے کناروں اور دہانوں پر نسبتاً چند ہی دن میں ریت کے ٹیلے اور سنگریزوں کے کڑاڑے بن جاتے ہیں +

اس لئے یہ خیال کرنا بالکل بجا ہے کہ قدیم زمانے میں مس سپی کے دہانے کی سالانہ تہ نشین خاک تاریخی زمانے سے بہت زیادہ تھی - مگر دوسری طرف ایک دلیل اس کی مدمقابل بھی موجود ہے - جس سے اس زیادتی کا زور ٹوٹ جاتا ہے - وہ یہ کہ جب ابتدائی دریا بہت بھرے ہوئے اور بہت گہرے ہوتے تھے تو ان کا بہاؤ اتنا زوردار اور تیز ہوتا تھا کہ وہ اس کدورت کو بجائے دہانے میں چھوڑنے کے دور تک سمندر

Marfat.com

کے اندر لے جاتا ہوگا۔ اور مس سپی کے بارے میں یہ احتمال بالکل بجا ہے کہ اس ابتدائی زمانے کے جمادی مادوں کا زیادہ حصہ تیز دھار اور تند سیلاب کے ساتھ دور خلیج میں جاکر تہ نشین ہوتا ہوگا۔ اس سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ آیا زیادہ کدورت اور زیادہ پانی کا زمانہ اس تہ نشین خاک کے فرش کے لئے مفید تھا یا مضر۔ اس خاص بحث کے متعلق دو اور دلیلیں بھی مدنظر رکھنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ اور بڑے بڑے علما کی متفرق تحقیقات نے بھی عموماً سر چارلس لیل کے اس نتیجہ کی تاکید اور تائید کی ہے۔ سر جان لبک نے اسی تحقیقات کو از سر نو بطور خود کیا اور قریب قریب بالکل وہی جواب ملے۔ اس شخص نے بعد میں اس تمام بحث کو پھر اپنی کتاب موسومہ "قدامت انسان" میں دُھرایا ہے۔ اور وہاں وہ بجائے اس مدت کو گھٹانے کے اس کے بڑھانے کی طرف زیادہ مائل ہے ✦

دوسری بات یہ ہے کہ سر چارلس لیل کے نتائج بعینہ ان نتائج کی طرح ہیں جو کرول کے نقشے سے ہم نے برفانی دریاؤں کے پیدا ہونے کی تاریخ کی بابت قیاس کئے تھے۔ ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہم نے سردی کی انتہائی شدت کو طریق الارض کی انتہائی لمبائی کے ساتھ اب سے قریباً ایک لاکھ سال پیشتر قرار دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ یہی زمانہ یخ کہلاتا ہے۔ اس مدت میں سے اندازاً اگر اتنا عرصہ نکال دیں جو زمین اور سورج کے زیادہ موافق موقعوں پر آنے اور پھر اس برف کے بے انتہا پہاڑ کو گلا کر دریاؤں میں ملانے کے لئے کافی ہو۔ تو ہم عملاً اسی زمانے تک آجاتے ہیں۔ جو علم طبقات الارض کے مس سپی کے دہانے کا فرش بننے کے لئے قرار دیا ہے ✦

ہم گزشتہ صفحوں میں کہہ چکے ہیں کہ وادی نیل کی تہ نشین خاک طبقات الارض اور انسانی تاریخ دونوں کے زمانے ناپنے کام آسکتی ہے۔ اس مضمون پر بڑے صبر اور تحمل سے غور کیا گیا ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کی رائل سوسائٹی نے ایک مشہور عالم پروفیسر ہارنر کو ۱۸۵۱ء میں اس غرض کے لئے روانہ کیا کہ وادی نیل کی تہ نشین خاک کی رفتار سے مصر کی قدامت کا پتہ

لگائے۔ ہیروڈوٹس[1] کے زمانے میں علمائے مصر یہ بات جانتے تھے کہ قدیم زمانے میں ان کا وادی نیل کا شمالی حصہ بحیرۂ روم کی ایک خلیج تھا۔ اور شہر تھیبس[2] کے سواد تک پھیلا ہوا تھا۔ اور چونکہ ان کو خوب معلوم تھا کہ سمندر پانی کے ریلے اور تہ نشین خاک کے پرت کے بلند ہو جانے سے پیچھے ہٹ گیا ہے۔ اسلئے وہ کہا کرتے تھے کہ ملک مصر باوانیل کی دیا ہے۔ اگرچہ ظاہر میں یہ طرز ادا محض پرانی کہانی کی سی ہے۔ مگر فی الحقیقت امر واقعی یہی ہے۔ کیونکہ اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ملک مصر جو انسانی تہذیب اور شائستگی کے لئے پہلا میدان بنا۔ درحقیقت دریائے نیل کی مہربانی یعنی اس کا نتیجہ ہے۔ ہارنر کے ورود سے پہلے اُن علمائے بھی جو نپولین کے ساتھ مصر گئے تھے۔ چاہا تھا کہ ملک کی قدامت کا پتہ دریا کی تہ نشین خاک سے لگائیں۔ اور انہوں نے ۵ انچ فی صدی کا اندازہ کیا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ وادی میں مختلف جگہ اس کی رفتار مختلف ہے۔ چنانچہ ہارنر نے دو پرانے شہر ہیلیوپولس[3] اور میمفس[4] اپنی تحقیقات کے لئے منتخب کئے۔ ایک میں مشہور مینار کھڑا ہے۔ اور دوسرے میں ریمسس[5]

---

[1] (Herodotus) یہ ابوالآباء مورخین عالم یونان کے ایک موضع میں ۴۸۴ سال قبل مسیح پیدا ہوا۔ اس کے والدین شریف اور معزز لوگ تھے۔ تحصیل علم کے بعد اُس نے اکثر ممالک میں سیر و سفر کر کے جنگ ایران و یونان کی تاریخ ۹ جلدوں میں لکھی۔ جو اس علم کی پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب غالباً سنہ ۴۴۳ قبل مسیح کے قریب میں تصنیف کی گئی۔ اور اس کے ۵-۶ برس بعد مصنف کا انتقال ہو گیا +

[2] (Thebes) قدیم مصر کا ایک مشہور شہر۔ جو اٹھارویں خاندان فراعنہ کے زمانے میں اپنے انتہائے عروج پر تھا۔ مگر ہومر کے زمانے میں اس کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ آخر اہل بابل و ایران کے حملوں نے اسے بالکل برباد کر دیا۔ اور فتح اسلام کے وقت یہ ایک گاؤں رہ گیا تھا +

[3] (Heliopolis) یعنی آفتاب کا شہر۔ یہ مصر قدیم کا ایک آباد شہر تھا۔ لیکن اب ویران ہے +

[4] (Memphis) قدیم مصر کا دارالخلافہ جسے پہلے تاریخی بادشاہ مینیز (Menes) نے بسایا تھا۔ یہ شہر عرصے تک نہایت آباد اور مشہور شہر رہا۔ اور جب مسلمانوں نے مصر لیا اُس وقت تک بھی یہ شہر آباد تھا۔ اگرچہ روبہ تنزل۔ کیونکہ عربوں نے اس کے مقابل میں دریائے نیل کی داہنی طرف شہر فسطاط آباد کر لیا تھا۔ جس سے رفتہ رفتہ اس کے کھنڈر تک مٹ گئے +

[5] (Ramesis II) سلاطین مصر کے انیسویں اور بیسویں خاندان ریمسائڈ (Rathessside) یا خاندان فراعنہ کا دوسرا اور سب سے زیادہ زبردست اور شاندار بادشاہ جو چودہ سو سال قبل مسیح کے قریب تخت نشین ہوا۔ اور جس نے ۶۷ سال کے قریب سلطنت کی۔ اسی کی بنائی ہوئی عمارتیں مصر اور نوبیہ کی عمارات قدیمہ میں سب سے زیادہ عالیشان ہیں +

Marfat.com

ثانی کا عظیم الشان بت۔ ان دونوں مشہور یادگاروں کی تاریخ بنا تقریباً ٹھیک معلوم ہے۔ مینار تقریباً ۲ ہزار ۳ سو سال قبل مسیح بنا تھا۔ اور رعمسس ثانی کا زمانہ لیپسس کی تاریخ کے مطابق چودھویں صدی قبل مسیح کے زیادہ حصے کو لئے ہوئے تھا۔ ہارنر کا خیال یہ تھا کہ ان دونوں یادگاروں کے پاس سے زمین کھود کر ان چبوتروں تک پہنچے جن پر یہ دونوں چیزیں قائم تھیں۔ اور سطح زمین سے ان کی گہرائی معلوم کرنے کے بعد سیلاب نیل کی تہ نشین خاک کی رفتار آسانی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی کوششوں سے یہ معلوم ہوا کہ مینار کی جڑ میں ۴ ہزار ایک سو پچاس سال کے عرصے میں ۱۱ فٹ مولڈ تہ بن گئی ہے۔ گویا ہر صدی میں ۱۸ء۳ انچ۔ رعمسس کے بت کے پاس معلوم ہوا کہ سطح زمین اس بت کے چبوترے سے ۱۰½ فٹ بلند ہو گئی ہے۔ مگر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ چبوترہ بناتے وقت خود سطح زمین سے ۱۴-۱۵ انچ نیچے رکھا گیا تھا۔ چنانچہ مناسب کمی بیشی کرنے اور بت کی ۳۲۱۵ برس کی قدامت ماننے کے بعد میمفس میں تہ نشین خاک کے جمع ہونے کی رفتار ۳½-۱ انچ فی صدی کے قریب ہوئی۔

یہ معیار معلوم کرنے کے بعد پروفیسر ہارنر نے وادی میں مختلف جگہوں کو مختلف گہرائیوں تک اور کہیں کہیں خاک سیلابی کی آخری تہ تک کھدوایا۔ چنانچہ ایک جگہ ایک بت کے پاؤں کے پاس ایک مٹی کا برتن سطح حال سے ۳۹ فٹ نیچے دستیاب ہوا۔ مذکورہ معیار کو مانتے ہوئے یہ بات ثابت کرتی ہے کہ اس نواح میں نوع انسان اور اس کی صناعیوں کا وجود اب سے ۱۳ ہزار برس پہلے موجود تھا۔ لیکن چونکہ یہ چیزیں بھی خاک سیلابی کی سب سے نیچے کی تہ سے بہت اوپر تھیں۔ اس لئے ممکن ہے کہ وادی مصر ۱۳ ہزار برس سے بھی پہلے خدا جانے کب سے آباد ہو۔ ان دونوں عظیم الشان دریاؤں کے دہانوں کے علاوہ دنیا کے اور مختلف ممالک میں بھی اسی قسم کی تحقیقات کی گئی ہے۔ اور تقریباً بالکل ایسے ہی نتیجے نکلے ہیں۔ سر چارلس لیل نے فرانس میں دریائے سوم کی وادی اور دہانے کی ایسی ہی تحقیق کی اور آخر میں یہی نتیجہ نکالا کہ اس حصہ

زمین پر بھی نوع انسان تاریخی زمانوں سے کئی ہزار سال پہلے سے آباد تھی ٭

ان غاروں کی قدامت کی دلیل جن کی تہ میں انسانی بقیے ملے ہیں بالکل اسی دلیل کے مطابق ہے جو ہم نے دریائی گھاٹیوں کے کٹنے۔ ان کے ہانوں کے پیدا ہونے۔ اور ان کے سنگین کناروں کے بننے کی مدت مدید کے لئے پیش کی ہے۔ کیونکہ دریاؤں نے یہ چیزیں اسی وقت بنانی شروع کی ہونگی جبکہ ان کا عالم یخ کے پگھلنے کے بعد کا طوفان کم ہونا شروع ہوا ہوگا۔ اور ٹھیک یہی وقت تھا جبکہ کھریا اور چونے کے طبقوں میں وہ غار بن کر پانی کی کمی کی وجہ سے کھلنے اور خشک ہونے لگے ہونگے۔ اور جانوروں اور آدمیوں کی رہائش کے لائق ہوئے ہونگے۔ یہاں ایک بات ضرور ذہن نشین کرلینی چاہیئے۔ اور وہ یہ ہے کہ واقعات اس خیال کی تائید نہیں کرتے کہ ان دریاؤں کے اُترتے ہی اور غاروں کے کھلتے ہی آدمیوں نے وہاں رہنا سہنا اختیار کرلیا ہو۔ اس لئے نوع انسان کو ان غاروں کا ہم عمر کہنا غالباً مبالغہ آمیز ہوگا۔ باقی تمام حیثیتوں سے دریاؤں اور غاروں کی خاک نہ نشین میں دبے ہوئے بقیوں کی قدامت کی دلیل بالکل یکساں ہے ٭

اس علم کے اصول کے مطابق ان بقیوں کی عمر معلوم کرنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔ جو یورپ اور بالخصوص سوئٹزرلینڈ کی جھیلوں کی تہوں میں پائے گئے ہیں۔ جھیل نیوف شیٹل اور بائن کے درمیان مقام پانٹ ڈی تھیل پر نہایت غور اور توجہ سے تحقیقات کی گئی ہے۔ یہ دونوں جھیلیں ایک ندی کے ذریعے سے باہم ملی ہوئی ہیں۔ اور یہ ندی پہلے ایک کھاڑی تھی جو ایک جھیل سے دوسری تک پھیلی ہوتی تھی۔ آخر رفتہ رفتہ ان دونوں جھیلوں کی درمیانی وادی ان طاقتوں کے زیر اثر پر جو اب بھی اپنا کام کر رہی ہیں۔ مٹی اور ریت سے پٹ گئی۔ اس سرزمین میں جھیل کے رہنے والوں کے بقیہ آثاروں کا سراغ ملا۔ اور پھر مٹی اور ریت کے جمع ہونے کی رفتار معلوم ہو جانے سے ان جھیل کے باشندوں کے زمانہ وجود کا تحقیق کیا جانا چنداں مشکل نہ تھا۔ یہ دریافت ہوا کہ سینٹ جین کی خانقاہ جو گیارھویں صدی کے آخر میں پانی کے کنارے پر

Marfat.com

بنائی گئی تھی۔ اب جھیل کے کناروں کے پٹ جانے سے گویا کنارۂ آب ۴۰۶ گز دور ہو گئی ہے۔ پروفیسر گلیرین نے اس تحقیق سے جھیل کے باشندوں کا زمانہ معلوم کیا۔ جن کے گھروں کے کھنڈر اب کنارۂ آب سے ۳ ہزار ۲ سو ۵۰ گز پرے ہٹ گئے ہیں۔ اور یہ نتیجہ نکالا کہ ان آدمیوں کے زمانے کا آخری حصہ کم سے کم ۶۷۵۰ برس پہلے گزرا ہے۔ ناظرین کو یہ بات مدنظر رکھنی چاہئے کہ یہ لوگ جن کا ہم نے ذکر کیا ہے۔ اور جن کو جھیل کے باشندے کہتے ہیں۔ اگرچہ تاریخی زمانے کی حد سے پرے ہیں۔ مگر ان کو یورپ کے سب سے قدیم اور ابتدائی رہنے والے ہرگز نہ سمجھنا چاہئے +

ایک اور جغرافی شہادت مقام مذکور کے پاس ہی کی ایک جگہ سے ملتی ہے۔ جہاں ایک چھوٹی مگر تیز رو ندی جھیل جینوا میں گرتی ہے۔ وہاں ریت اور سنگریزوں کا ایک بڑا ڈھیر لگ رہا ہے۔ جو تاریخی زمانے سے پہلے سے ہے۔ یہ ڈھیر مخروطی شکل کا ہے۔ اور حال ہی میں ریل کی سڑک بنانے کے لئے اس کو تقریباً ہزار فٹ کی لمبائی اور ۳۰ فٹ کی گہرائی تک کھود ڈالا ہے۔ اس قابل دید انبار کی ساخت کی رفتار تقریباً صحیح صحیح معلوم کر لی گئی ہے۔ اور انسانی لاشوں کے بقیے اور انسانی کاموں کے نمونے ۱۹ فٹ کی گہرائی پر ملے ہیں۔ مشہور فرانسیسی عالم ایم مارلٹ کی تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ اس ڈھیر کے جمع ہونے کے لئے ۴۰۰۷ سے ۱۱ ہزار سال تک کی ضرورت ہے۔ سر جان لبک نے اس تحقیقات پر پھر از سر نو نظر ثانی کی ہے۔ اور یہی نتائج حاصل ہوئے ہیں۔ ایک اور بات جو ان بیانوں کے ضمن میں آچکی ہے۔ اور جو اس کتاب کے اکثر حصوں میں برابر پیش آتی رہیگی۔ یہ ہے کہ کس قدر بعید ملک تحقیقات طبقات الارض کے لئے انتخاب کئے گئے ہیں۔ اور کتنے دور دراز حصوں میں تاریخ سے پہلے کے انسانی بقیوں کا سراغ لگا ہے۔ یہاں ہم صرف علم طبقات الارض کی تحقیقات قدامت انسان پر غور کر رہے ہیں۔ مگر ہم کو یہ بھولنا یا نظر انداز کرنا نہ چاہئے کہ زمانہ یخ کے بعد کس قدر جلد نوع انسان دنیا کے اتنے دور دراز اور مختلف حصوں میں پھیل گئی۔ یہ عظیم الشان پراگندگی خود ہی قدامت

Marfat.com

انسانی کی ایک قوی دلیل ہے۔ اور اگرچہ براہ راست اس کو علم طبقات الارض سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مگر یہ اس علم کے ساتھ اتنی وابستہ ہے کہ دونوں کا ذکر یکجا کر دینا کسی طرح نازیبا یا نامناسب نہیں تھا +

اگر ہم تمام نوع انسان کو متحد الاصل اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد سمجھتے ہیں تو ہم کو شروع ہی سے اس کی نہایت معقول قدامت کا یقین کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ ہر شخص خیال کر سکتا ہے کہ اس نوع کی اتنی کثرت اور پھیلاؤ کے لئے کتنا زمانہ درکار ہوگا کہ اس کے افراد تمام روئے زمین کے مختلف برّ اعظموں میں پھیل جائیں اور برّ اعظم بھی ایسے جن کے بیچ میں اکثر ناپید اکنار سمندر اور فلک فرسا پہاڑ حائل ہیں۔ جب ہم ان دور دراز کے ملکوں اور ان کے راستوں کی دشوار گزاری۔ اور ناہمواری۔ اور ابتدائی قوموں کی پیادہ پائی اور آہستہ روی پر نظر ڈال کر اُن کے مختلف باشندوں کی عادات و اطوار کی مشابہت اور ان کے مدارج ترقّی کی یکسانیت کو دیکھتے ہیں۔ تو ابتدائے انسان کی بے انتہا قدامت ہم کو حیران کر دیتی ہے۔ اور ہم اس طول طویل زمانے کے تصوّر سے عاجز رہ جاتے ہیں۔ جو ابتدائی آدمیوں کو اپنے مشترکہ مکان سے چل کر ان تمام ملکوں میں پھیل جانے کے لئے ضروری ہوا ہوگا۔ جہاں آج اُن کے مٹے ہوئے نشان اور بوسیدہ ہڈیاں طبقات الارض کی گود سے نکل کر دنیا کو اپنی قدامت اور بزرگی کا ثبوت دکھا رہی ہیں +

Marfat.com

باب چہارم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم آثار قدیمہ کی رائے

آثار قدیمہ اور طبقات الارض کے علموں کا باہمی تعلق اس کتاب کے پہلے باب میں واضح کیا جا چکا ہے۔ یہاں ہم زیادہ محنت اور زیادہ وضاحت سے دکھانا چاہتے ہیں کہ علم آثار قدیمہ ہماری ابتداے آفرینش کی کیا تاریخ قرار دیتا ہے۔ باوجود لفظی معارضے اور مناقضے کے اس علم کی صحیح تعریف یہی ہے کہ "یہ تاریخی زمانے سے پہلے کی تاریخ ہے"۔ شاید نظر اول میں یہ نتیجہ نکالا جائے کہ چونکہ یہ علم ہم کو بخط مستقیم آثار نسل انسانی کے مختلف درجے دکھاتا ہے۔ اس لئے شاید یہ علم ہیئت اور طبقات الارض کی نسبت زیادہ درستی سے انسانی ابتدا کی تاریخ بتلا سکے۔ مگر معاملہ برعکس ہے۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ابتدائی آدمیوں کی طرز زندگی اور طریق معاشرت کی بابت ہم کو جتنی خبریں اس علم سے ملتی ہیں اتنی علم طبقات الارض سے کیا باقی کل علموں کی متحدہ تحقیقات سے بھی نہیں ملتیں۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ تعین وقت کے لئے آثار قدیمہ بالکل طبقات الارض کے محتاج اور دست نگر ہیں! اسلئے تقسیم اوقات میں یہ علم براہ راست کوئی نئی مدد نہیں دیتا۔ بلکہ صرف اور علموں کے دریافت کردہ نتائج کی تائید اور تصدیق کرتا ہے۔ مگر ان باتوں سے یہ نتیجہ نہ نکالنا چاہئے کہ یہ علم۔ جس کی ترقی اتنے دنوں تک تعصب کی وجہ سے رکی رہی۔ علم طبقات الارض یا اور علوم طبیعی کی طرح محققانہ اور معتبر نہیں ہے۔ بلکہ ہماری نوع کے اس دور کے تاریک اور بے خبری کے بچپن کے آثار اور بقیوں کا امتحان اس کی ترقی اور ایک حد تک اس ترقی کی رفتار دریافت کرنے کا نہایت پاکیزہ اور پسندیدہ ذریعہ ہے۔ وہ ترقی جس نے آدمی

Marfat.com

کو جانوروں کی وحشیانہ حالت سے تعلیم اور تہذیب کے اس درجے تک پہنچا دیا ہے۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ اس ترقی کی مختلف مدتوں کی تعیین اور وقتوں کی تحقیق ان طبقات ارضی پر موقوف ہے۔ جن میں وہ آثار اور بقیے پائے گئے ہیں +

ہم یہاں تمہیداً ان اسباب اور مضامین کا ذکر کرتے ہیں جن سے اس علم کا تعلق ہے۔ زمین کے اوپر کے طبقوں میں انسانی بقیے علم طبقات الارض کے زمانہ طوفانی کے بعد کی اشیا کے ساتھ ملے جلے پائے جاتے ہیں۔ انسانی ہڈیاں خصوصاً وہ جو زیادہ سخت اور پائدار ہوتی ہیں۔ مثلاً کھوپری اور دانت اتفاقاً یا عمداً ایسی جگہوں میں رکھ دی گئی ہیں۔ جو ان کو صحیح سالم رکھنے کے لئے بالخصوص مناسب ہیں۔ ایسے بقیے ان چٹانوں یا طبقوں میں ملتے ہیں۔ جن کا زمانہ معلوم ہے۔ یا ایسے نایاب جانوروں کے بقیوں کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ جن کے درجے اور مرتبے علم حیوانات قدیمہ مقرر کر چکا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ابتدائی آدمیوں کی دستکاری کے نمونے یعنی ان کے اوزار اور برتن جو عموماً نہایت پائدار چیزوں کے ہوتے ہیں۔ اکثر اپنے بنانے والوں اور استعمال کرنے والوں کی ہڈیوں کے ساتھ بکثرت دستیاب ہوتے ہیں۔ وہ چیزیں جن سے ابتدائی آدمی اپنی معمولی ضروریات اور سادہ زندگی کے اسباب بناتے تھے۔ اب تک اسی طرز اور اسی صورت میں باقی ہیں۔ اور اس قدیم ابتدائی زمانے کی بے ہنری اور سادہ رسم و رواج کے نہایت معتبر اور دلچسپ ثبوت ہیں +

ان چیزوں کے انتخاب میں قدرت ان کی رہنمائی کرتی تھی سب سے پہلے انسان نے سیدھے سادھے پتھروں کو جس شکل میں وہ ملے استعمال کیا۔ ان کی اپنی عقل نے ان کو بالکل ہاتھ نہیں لگایا۔ آخر کار مختلف قسموں میں تمیز اور انتخاب کرنے کی عادت ہوئی۔ اور پتھر کی زیادہ مفید مطلب قسموں کا استعمال شروع ہوا۔ چقماق اور خارا کی تلاش پیدا ہوئی۔ برتن اور ہتھیار بنانے میں ہڈیوں اور سینگوں کو بھی کام میں لانے لگے۔ آخر کار عقل کی ترقی

Marfat.com

اور تجربے کی زیادتی سے ابتدائی کاروبار میں دھاتوں کا نمبر آیا۔ برتنوں اور اوزاروں کی ساخت میں پتھروں کی جگہ تانبے اور کانسی نے لینی شروع کی کانسی کے بعد لوہا آیا۔ اور اس کے ساتھ لڑائی کا زمانہ اور تفرقہ قومی کا وقت آیا۔ اور ترقی عقل کے آفتاب کا چمکتا ہوا نشان دیکھکر ظلمتِ جہل کی رات کا رنگ اُڑنے لگا +

اس طرح تاریخی زمانے سے پہلے کی قوموں اور زمانوں کی ترتیب نسبتاً آسان ہے۔ مگر اس ترتیب سے مختلف زمانوں کا ٹھیک وقت ہرگز معلوم نہیں ہوتا۔ اور گو وہ تمام زینے جو ہماری نوع نے انتہائے پستی سے اب تک ترقی میں طے کئے ہیں۔ پوری صحت اور صداقت کے ساتھ معلوم ہو سکتے ہیں مگر ان کے مختلف زمانوں کا طول بالکل مشکوک اور مشتبہ ہے۔ بڑی نمایاں بات یہ ہے کہ بعض قومیں میدان ترقی میں اور قوموں سے گوے سبقت لے گئی ہیں۔ چنانچہ اب تک بھی تاریخ عالم کا ایک شعبہ ہم کو ترقی کے تمام مدارج ابتدائی دکھا رہا ہے۔ دنیا کے پردے پر اب تک ایسی قومیں نظر آتی ہیں۔ جو جرأت اور طاقت کے سوا باقی تقریباً تمام حیثیتوں میں ان ابتدائی قوموں کا جیتا جاگتا نمونہ ہیں۔ جو زمانہ ثالثہ کے طبقوں کی بناوٹ کے زمانے میں دنیا میں آباد تھیں۔ اس لئے اگر ہم اپنے پرانے آباو اجداد کی طرز زندگی کو بچشم خود معائنہ کرنا چاہیں تو ہم کو محض موجودہ دنیا کے بعض حصوں پر نظر ڈالنی کافی ہوگی۔ چنانچہ آسٹریلیا کے اصلی لوگ نیوزیلینڈ کے میوری جمع الجزائر کی اور کئی اصلی قومیں۔ نئی دنیا کے سرخ باشندے۔ جو اب تک پٹیگونیا سے انتہائے شمال تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب تک ہر قسم کی دھاتوں کے استعمال سے ناواقف محض ہیں۔ اور اگر ان میں سے کسی نے کچھ سیکھا بھی ہے۔ تو صرف چند دن سے۔ اس لئے یہ لوگ بھی ازمنۂ قدیمہ کے وحشیوں کی طرح قرن الحجر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے جب تک آثار قدیمہ کو طبقات الارض سے وابستہ نہ کریں تب تک پرانی دستیاب شدہ اشیاء کی کوئی تاریخ قرار دینا محض ناممکن ہے۔ ہم ان کے باہمی تعلق اور

Marfat.com

ترتیب کو دیکھ سکتے ہیں۔ مگر ان کے وقت کو معلوم نہیں کر سکتے۔ یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ فلاں چیز فلاں سے پہلے یا پیچھے کی ہے۔ یا یہ کہ ایک قرن سے دوسری قرن تک ترقی کی رفتار بہت آہستہ ہے۔ مگر آثار قدیمہ کی بابت یہ حکم لگانا کہ یہ چیز کتنی قدیم یا کتنی نئی ہے۔ اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے +

لیکن اس قاعدے میں بعض مستثنیات بھی ہیں۔ خصوصاً وہ جو اقوام قدیمہ کے استخوانی بقیوں کے متعلق ہیں۔ بعض خاص قسم کی بناوٹیں ہیں۔ جو بلاشبہ نہایت قدیم لوگوں کے ساتھ خاص ہیں۔ زمانہ حال کے وحشی وہ نمایاں حیوانی ساخت نہیں رکھتے۔ جن سے پرانے زمانے کے جنگجو وحشی ممتاز تھے +

معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ قدیمہ کے امن پسند حلیم الطبع نرم اور کمزور فرقے ایک حیثیت سے اپنے زیادہ جنگجو اور درشت خو بھائیوں سے زیادہ پائدار اور دیرپا ثابت ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں نے ابھی تک اپنی خو بو اور طرز و روش کو اسی طرح قائم رکھا ہے۔ حالانکہ وہ قومیں جو زیادہ جنگجو اور دلیر تھیں اپنی عادتوں اور رسموں کو کھو کر آج کل کی ترقی یافتہ اور شائستہ قوموں میں منقلب ہو گئیں۔ بہرحال ان وجہوں سے بعض خاص قسم کے انسانی بقیے اپنی قدامت کا خود ہی اظہار کر دیتے ہیں۔ ورنہ عموماً وہ آلات اور اوزار جن سے قرن الحجر قرن الرصاص سے اور قرن الرصاص قرن الحدید سے ممیز و ممتاز ہوتی ہے۔ ازمنہ قدیمہ کی تاریخیں معین کرنے میں بالکل بے سود اور غیر مفید ہیں +

بعض دفعہ انسانی بقیوں کے نایاب جانوروں کے بقیوں کے ساتھ ملنے سے

لہ علمائے علم ارکیالوجی یا آثار قدیمہ نے تاریخ انسانی کے مختلف زمانوں کو انسان کے استعمالی اشیا کے مادوں کے لحاظ سے جدا جدا نام دیے ہیں۔ چنانچہ سب سے پرانا زمانہ قرن الحجر قدیم (Old Stone Age) کہلاتا ہے۔ کیونکہ خیال ہے کہ اس وقت آدمی نہایت معمولی اور ان گھڑ پتھروں سے اپنا کام چلاتے تھے۔ اس کے بعد کا زمانہ قرن الحجر جدید (New Stone Age) کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں آدمیوں کو مختلف قسم کے پتھروں میں کسی قدر امتیاز معلوم ہو گیا تھا۔ اور وہ چقماق وغیرہ سخت پتھروں سے کچھ بھدے بھدے مگر کسی قدر موزوں آلات بنانا سیکھ گئے تھے۔ اس کے بعد قرن الرصاص (Age of Bronze) آیا جس میں دھاتوں کا استعمال بھی آچلا تھا۔ اور سب کے پیچھے قرن الحدید (Age of Iron) آیا جس میں تمام انسانی محنتوں اور صنعتوں کی جان لوہا ہے۔ اور جو ابھی تک چلا جا رہا ہے

ایک اور قسم کی غلطی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان دونوں میں کے لحاظ سے بہت قریبی تعلق خیال کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ روئے زمین پر جانوروں اور خصوصاً درندوں کی تقسیم میں خود انسانی کاروبار نے بھی بہت کچھ حصہ لیا ہے۔ شیر۔ چیتا۔ بجّو وغیرہ خونخوار جانور انسانی تہذیب کے ساتھ اکٹھے ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ نہ صرف ناموافقت آب وہوا کی وجہ سے۔ جیساکہ عام خیال ہے۔ بلکہ زیادہ تر اس لئے کہ اگر آدمی اور چیتا یکجا ہوں تو دونوں میں سے ایک نہ ایک کا مرنا ضروری ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ہیبتناک پہاڑی شیر۔ پہاڑی ریچھ اور پہاڑی بجّو جو اب نہیں پائے جاتے۔ لیکن جن کے بقیے ابتدائی آدمیوں کے ساتھ ملے ہیں۔ یورپ کے زمانہ یخ سے یا بہت پہلے گزرے ہونگے یا بہت پیچھے۔ کیونکہ اس زمانے کی سردی جبکہ یورپ الپس[1] اور پرنیز[2] تک برف میں چھپا ہوا تھا۔ ان جانوروں کے لئے نہایت سخت اور ناقابل برداشت ہوگی۔ جن کا وجود اب صرف ایشیا اور افریقہ کے جلتے ہوئے میدانوں اور جنگلوں میں محدود ہے +

مگر یہ خیال کرتے وقت غالباً یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ چیتا۔ ریچھ بجّو اور شیر بھی آج کے دن تک اچھی طرح ایسی سخت سردی برداشت کرنے کے لائق ہیں۔ جو قطبین کی سردی کے قریب قریب ہو۔ اور یہ جانور اپنے موجودہ مقاموں میں ان کی گرمی کی وجہ سے نہیں گئے ہیں بلکہ تہذیب نے ان کو ان دشوار گزار جنگلوں میں بھگا دیا ہے جہاں نباتات کھانے والے جانوروں کی بہتات درندوں کے لئے سامان خوراک بہم پہنچاتی ہے۔ اس لئے قدیم زمانے میں ان جانوروں کے یورپ میں نہ پائے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ آج کل بھی جہاں کہیں تہذیب نے ان کا راستہ نہیں روکا وہاں ہندی شیر بالکل آزادی سے بارہ سنگھے یا ہرن کے تعاقب میں اپنے جنگل سے نکل کر ہمالیہ کی بلندیوں پر دائمی برف کی حد تک اُن کا پیچھا کرتا ہے۔

---

[1] (Alpes) یورپ کا سب سے بلند پہاڑ جو سوئٹزرلینڈ میں واقع ہے۔ اور ستر ہزار فٹ بلند ہے +

[2] (Pyrenees) ایک اور مشہور پہاڑ جو فرانس اور سپین میں حد فاصل ہے +

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے۔ بگیرا اور تیندوا تو اس سے بھی گزر جاتے ہیں۔ اور اپنے شکار کا سائبیریا کے برفستان میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ان دلیلوں سے ان لوگوں کی غلطی صاف ثابت ہوجاتی ہے۔ جو ان جانوروں کو زمانہ یخ کے بعد کا خیال کر کے ان کے اور انسانی بقیوں کے اختلاط سے نوع انسان کی نوعمری ثابت کرنا چاہتے ہیں +

لیکن اس دلیل کے علاوہ بعض آثار قدیمہ میں خود ہی ان کی قدامت کی علامتیں موجود ہیں۔ اس بات پر سب علما متفق ہیں کہ قرن الحجر انسانی ترقی کا سب سے پہلا زمانہ ہے۔ اور پتھر جب انسانی ہاتھ سے لوٹے یا کسی جانتے سے۔ تو عناصر کی تاثیر کے لئے ایک نئی سطح نکل آتی ہے۔ اور یہ سطح آئندہ ہمیشہ اس ٹوٹنے کے وقت کی جدت یا قدامت کی خبر دیتی ہے۔ سخت سے سخت اور صاف سے صاف پتھروں کی سطح سے بھی چند سال کے بعد یہ اثر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ مصر قدیم کے مستعملہ سنگ خارا کے پیکان ناتجربہ کار دیکھنے والے کو بھی اپنی قدامت کے ناقابل تردید ثبوت دیتے ہیں۔ ہر قسم کے ٹوٹے ہوئے یا صاف کئے ہوئے پتھروں کی چمک رفتہ رفتہ ماند پڑتی جاتی ہے۔ اور آخر کار بالکل معدوم ہو کر کچھ کھردری بھوری سی سطح نکل آتی ہے۔ اور اگر خوردبین سے امتحان کیا جائے تو اس کا اور نئی ٹوٹی ہوئی سطح کا فرق اور بھی نمایاں اور واضح ہوجاتا ہے مزید برآں یہ کہ یہ فرق ضرور ہوتا ہے خواہ وہ پتھر ہوا میں پڑا رہے۔ یا زمین میں گڑا رہے +

اگرچہ نئے اور پرانے ٹوٹے ہوئے پتھر میں فرق ہر شخص دیکھ سکتا ہے مگر ماہر آثار قدیمہ کے لئے یہ فرق نہایت بدیہی اور ظاہری ہوتا ہے۔ اس کی مشاق آنکھ ہر صفحہ سنگ پر اس کی قدامت کا بیان صاف لکھا ہوا پاتی ہے۔ اور اگرچہ اس کی ٹھیک تاریخ نہ بتا سکے لیکن اندازاً اس کا زمانہ بتانے میں غلطی نہیں ہوتی۔ اس لئے یہ آسان ہے کہ زمانہ قدیم کی تمام سنگی یادگاروں کو ان کے فرق سطح کے لحاظ سے مرتب کریں۔ سب سے زیادہ پرانی چیزوں کو علیحدہ کر لیں۔ اور پھر قیاس صحیح سے ان میں سے ہر ایک کی عمر کا تخمینہ لگائیں +

علما نے مذکورۂ بالا طریقوں سے ان [illegible] لگایا ہے۔ جو یورپ میں اب تک ملی ہیں چقماق کے [illegible] کے ایک مقام تھینی کے قریب سے نکلے تھے انسانی کاریگری کے سب سے پرانے نمونے سمجھے جاتے ہیں۔ یہ نمونے اور اس قسم کے [illegible] بڑے ہیں۔ اور غالباً ایک یا دو دفعہ توڑنے سے بنائے گئے ہیں [illegible] طبقات الارض نے ان کو زمانہ ثالثہ کے وسط کا قرار دیا ہے۔ ان کے ہم عمر ہی وہ نمونے ہیں جو لزبن کے پاس دریائے ٹیگس سے برآمد ہوئے ہیں فرانس کے علمائے آثار قدیمہ ان کو انسانی دستکاری کے سب سے زیادہ قدیمی نمونے قرار دیتے ہیں۔ مگر اس جگہ بھی ان اشیا کی تاریخ معلوم کرنے کے لئے اس علم کو ان چیزوں کے آس پاس اور ارد گرد کی چیزوں اور طبقوں کی تحقیق کرنی پڑتی ہے۔ صرف علم آثار قدیمہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں بتا سکتا کہ یہ اوزار ایک آلات استعمال کرنے والے جانور نے بنائے تھے۔ جو آگ کے استعمال سے واقف تھا۔ اور خود ان کے سطحی آثار تاریخی زمانے سے بہت پہلے پیدا ہونے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور ان کے گرد و نواح کے طبقات زمینی ان کے بننے کا وقت وسط زمانہ ثالثہ ٹھیراتے ہیں۔

ان پرانے اوزاروں کی قیاسی قدامت کا تصور کرنے میں ناظرین کو یہ خیال کر لینا چاہیئے۔ کہ ان میں اور ان سے آگے آنیوالے اوزاروں کی کاریگری اور وقت میں بہت طول طویل زمانہ حائل ہے۔ قرین قیاس ہے کہ ان نہایت ہی پرانی یادگاروں کے زمانے اور ان خوبصورت بنے ہوئے چقماق کے پیکانوں اور بھالوں کے زمانے میں جن کو ہم ہر ایک مشہور عجائب خانے [illegible] دیکھ سکتے ہیں۔ اتنے ہی وقت کا فاصلہ ہوگا جتنا ان پیکانوں اور بھالوں اور قرن الحدید میں۔

مذکورۂ بالا سوال کے حل کرنے کے لئے ہم کو پھر عقل و قیاس کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ یہ ابتدائی اوزار جن کا ہم نے ذکر کیا ہے [illegible] حیوان میں پہلا مابہ الامتیاز ہیں۔ ان اشیا کی [illegible]

Marfat.com

بعض قسم کے بندروں کی عیاری اور چالاکی سے صرف ایک زینہ اوپر ہے۔ یہ بات عام ہے کہ بعض قسم کے بندر بھی درختوں میں سے لکڑیاں توڑ کر اپنا حربہ بنا لیتے ہیں۔ اور پھر اسے کہیں محفوظ جگہ رکھ دیتے ہیں تاکہ ضرورت پڑے تو کام آئے چنانچہ اسے پھر استعمال بھی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر کمی صرف یہ ہے کہ وہ بندر اس لکڑی کو اپنے مطلب کے مطابق اور زیادہ مفید بنانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہیں کر سکتے۔ برخلاف اس کے قدیم سے قدیم سنگی آلات میں ہم ان پتھروں کا صرف ایک پہلو صاف کردہ پاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی آدمی ایسے پتھروں کو تلاش کرتے ہونگے جن کو حادثوں نے کسی قدر درست کر دیا تھا۔ تاکہ ان کو صرف ایک ہی پہلو درست کرنے کی محنت اور تکلیف اُٹھانی پڑے۔ قدیمی آلات میں سے اکثر ایسے ہی ہیں کہ ان کے ایک پہلو کو انسانی کاریگری نے گھڑا تھا۔ اور دوسرا پہلو ویسا ہی رہا۔ جیسا قدرتی اسباب نے اسے بنا دیا تھا۔

یہاں سے متناسب اور موزون پیکان بنانے کا زمانہ بہت دور ہے۔ اگرچہ ترقی اور تہذیب کے زمانے میں ایسی تبدیلی کا جلد واقع ہو جانا کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے۔ بلکہ زمانہ حال کے اکثر آدمیوں نے مختلف چیزوں میں ایسی ترقیاں اور تبدیلیاں چند سال کے اندر اندر ہی دیکھی ہونگی۔ لیکن قدیم دنیا میں یہ حالت نہ تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیمی انسان زندگی کے نئے طریقے اختیار کرنے کے لئے بہت کم تیار ہوتے تھے۔ اور ان کی عادتوں کی ذرا ذرا سی تبدیلی بڑی دشواری اور بڑی مدت کے بعد واقع ہوتی تھی۔ اس مسئلے کی تصدیق کے لئے ہم کو صرف چند باتوں کی طرف توجہ کرنی کافی ہوگی۔

مذکورۂ بالا قسم کے آلات کا دنیا کے دور دراز کے حصوں میں پایا جانا۔ اس مسئلے کی صداقت کی طرف بڑے زور سے اشارہ کرتا ہے۔ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی ہے کہ ان آلات کو استعمال کرنے والے صرف انگلستان اور فرانس ہی میں آباد نہ تھے۔ جہاں آثار قدیمہ کے حاصل کرنے میں نہایت کوشش اور پوری کامیابی ہوئی ہے۔ بلکہ یہ پرانے سیدھے سادے اوزار

Marfat.com

دنیا کے ایسے ملکوں میں پائے گئے ہیں۔ جن کے بیچ میں بلند سطح والے فراخ سمندر۔ چوڑے دریا۔ اور ناپید اکنار صحرا حائل ہیں۔ اسی قسم کی یادگاریں مقام آرلیز کے قریب دریائے فون کی ریتوں میں سے اور دریائے پو اور وائیبر (واقع اٹلی) میں سے روم کے جنوب تک نکلی ہیں جن میں بعض اگر بعینہ مشابہ چیزیں دریائے میوز اور شیلٹ (واقع جرمنی) کے کنارے پر سے اور کچھ وسط جرمنی میں سے ہاتھ آئی ہیں۔ اور آگے چلیں تو اسی قسم کی اشیا افریقہ کے دریاؤں اور شمالی امریکہ کی گھاٹیوں میں سے بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ بوسٹن کے ایک پروفیسر ہینز نے ایسی ہی اشیا دریائے نیل میں سے نکالی تھیں۔ ایسے ہی نمونے جنوبی افریقہ کی ہیرے کی کانوں میں سطح زمین سے ۴۰ فٹ نیچے پائے گئے ہیں۔ اور کچھ اور مدراس میں سے اور کچھ اور جاپان میں سے جمع کئے گئے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی آدمیوں کی وسیع پراگندگی کا ثبوت آثار قدیمہ سے ملتا ہے۔ لیکن اگر ان جگہوں پر غور کریں جہاں سے یہ اشیا دستیاب ہوئی ہیں تو ہم دیکھینگے کہ ہر ملک میں وہ جگہیں بالکل یکساں ہی ہیں۔ ابتدائی باشندے دریاؤں کے کناروں پر اپنے گھر بناتے تھے۔ اور وہیں رہتے سہتے تھے۔ نہایت قدیمی وضع کے سنگین اوزار سوئٹزرلینڈ یا کسی اور زیادہ مرتفع زمین پر نہیں ملے اور نہ ایسی جگہوں میں جو کہ کنارۂ دریا سے دور ہیں۔ اس سے ہم کئی نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔ اول یہ کہ ان مذکورہ قوموں کی آبادی کا زمانہ وہ تھا جبکہ پہاڑ اور بلند زمینیں برف کی تہ میں چھپی ہوئی تھیں۔ دوم یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں زمین کی ایسی کیفیت تھی کہ ہر جگہ ابتدائی وحشیوں کو گرم سیر مقاموں خصوصاً دریاؤں کے کناروں کے قریب مدعو کرتی تھی۔ جہاں سے کہ برف پگھل کر بہ گیا تھا۔ اور پانی ہٹ کر خشک ہو گیا تھا۔ سوم ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ابتدائی باشندے سیر و سفر کے شائق نہ تھے۔ یعنی وہ اپنے مقامات سے اسباب معاش بہم پہنچانے کے سوا اور کسی وجہ سے دور نہ جاتے تھے۔ چہارم ہم مجاز ہیں کہ ان باتوں سے ان کی ترقی کی نہایت ہی سست اور دھیمی رفتار خیال کریں۔ حقیقت میں

ان میں سوچنے یا تصوّر کرنے کی قابلیت بالکل نہ تھی۔ قرین قیاس ہے کہ ایسی حالت اور ایسے زمانے میں انسانی ترقی نہایت ہی آہستہ بڑھی ہوگی۔ اور اس کا احتمال ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ نوع کو اسی بے خبری اور یکسانی کی حالت میں کئی ہزار برس گزر گئے ہونگے۔ قبل اس کے کہ وہ اپنی مدہوشی کے پردے کو ہٹا کر اپنے گرد و نواح کی چیزوں سے واقف ہوئی ہو۔ اور اسے ترقی عقل کی ہوا لگی ہو +

ابھی ایک اور نتیجہ بھی پوری موزونیت کے ساتھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ کہ بعض اشیا کے عدم وجود سے قرن اللجر کی قدامت پر کیا روشنی پڑ سکتی ہے اور اس کا فاصلہ زمانۂ حال سے کس قدر عظیم ہے۔ ان تمام دستیاب شدہ اوزاروں میں ایسی کوئی چیز بھی نہیں ملی جو جانوروں کے کھال اُتارنے کھال کو درست کرنے۔ یا ان کو پہننے کے قابل بنانے کے لئے مفید ہوتی۔ اس سے نتیجۂ غالب یہی ہے کہ اس وقت تک ان لوگوں کو مصنوعی طریقوں سے جسم کی حفاظت اور مستوری کا ڈھنگ نہ آتا تھا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس زمانے کی یادگاروں میں کوئی ایسی شے بھی نہیں ملی جس سے مردوں کے دفن کرنے کا ثبوت ملے۔ یا جس سے لاشوں کی کوئی عزت و حرمت یا ضعیف الاعتقادی کی کوئی علامت پائی جائے۔ نہ تعویذ گنڈوں کی قسم کی کوئی شے پائی گئی ہے۔ جس سے اس انسانی زندگی کی نہایت ابتدائی حالت میں کسی مذہبی اعتقاد کا سراغ ملے۔ ہاں یہ البتہ کہا گیا ہے کہ نہایت قدیم اوزاروں کے ساتھ جسمانی آرائش کے لئے خاص قسم کی سیپیاں دستیاب ہوئی ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خوبصورتی کے متعلق نوع انسان کے سب سے پرانے خیالات یہ تھے کہ جسم کو مختلف اشیا سے آراستہ کیا جائے۔ اور ایسا خیال وحشیوں میں ہمیشہ ان کی آئندہ ترقی کا ایک اچھا شگون سمجھنا چاہیئے۔

اس قدیم پتھر کے زمانے کے بعد نوع انسان کے آبا و اجداد نے نہ صرف اپنے اوزاروں میں بلکہ اپنے دل و دماغ میں بھی ایک عظیم تغیر پیدا کر دیا۔ اس زمانے کی یادگاروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سوچنے اور تصوّر کرنے

Marfat.com

کی قابلیت پیدا ہو گئی تھی۔ صنعت سنگ تراشی کی نئی چیزیں [illegible]
ایک خاص طرز پر بنائی جاتی تھیں۔ قرن الحجر کے آخری زمانہ میں بہت نفاست
اور خوش فکری کی علامتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ کی اعلیٰ
مجلّی۔ مصفّا اور مکمل ہے۔ کم از کم خیالاً وہ بھی ہنر کو سمجھنے لگے تھے۔ جو چیزیں وہ
بناتی ہیں کہ ان کے بنانے والے ایک نمونہ ذہن میں قرار دے کر اس کے
مطابق بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ گویا قوّتِ متخیلہ اچھی طرح کام کرنے لگی
تھی۔ اس سے آگے بڑھ کر قرن الرصاص میں یہ قوتیں اور بھی قوی ہو گئے۔
اس زمانے کی یادگاریں حقیقت میں نہایت خوبصورت ہیں۔ نقش و نگار وغیرہ بھی
ہنر کی حد تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اور صنعت گری نے اپنا پورا اظہار کیا ہے۔
اگرچہ وہ چیز چاقو یا استرے کا پھل ہی کیوں نہ ہو +

یہاں ہم کو ابتدائی زمانے سے بعد کے زمانوں تک کی ترقی کے نمونے
دکھانے نہیں ہیں۔ بلکہ ہم صرف ابتدائی انسان کی تاریخ پر بحث کر رہے
تھے۔ چنانچہ ہم نے دیکھ لیا کہ فی الجملہ آثار قدیمہ بالکل طبقات الارض معہ
علم ہیئت کا ہم صفیر ہے۔ حقیقت میں ثبوت کا ہر ایک جزو دوسرے کے ساتھ
گُندھا ہؤا ہے۔ اور تمام باتیں ایسی منقح اور متحد ہو رہی ہیں کہ ان علوم طبعیات
کی جدّت دیکھتے ہوئے اس کی امید بھی نہ تھی۔ اب اگر ہم علم نباتات قدیمہ کی
طرف پھریں۔ تو ہم کو ثبوت میں وہی تصدیق۔ اور تمثیل میں وہی نظیریں پیش
آئینگی۔ ہماری اس موجودہ بحث میں ایک یہ خصوصیت ہے کہ علم ہیئت سے
شروع کر کے جوں جوں مختلف علوم و فنون کی تحقیقات پر نظر ڈالتے ہوئے
اترتے آئیں۔ یہاں تک کہ آخر میں عام علم تاریخ تک پہنچ جائیں۔ تو یہ سب
علم ایک دوسرے کے نتائج کے لئے گویا ثبوت کا کام دیتے جاتے ہیں۔
طبقات الارض اپنی تحقیقات میں آثار قدیمہ پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح
آثار قدیمہ اپنے ساتھ نباتات قدیمہ کو ملا لیتا ہے۔ ہم اگر انسانی زندگی کی
شہادتوں پر غور کرنے کے لئے ابتدائی آلات۔ اوزار۔ ہتھیار۔ برتن۔ زیور
عمارتوں وغیرہ کی تحقیق کریں تو قدم قدم پر ہم کو وہ اشیا بھی ان کے ساتھ ہی ملتی

Marfat.com

ہیں۔ جن کا تعلق حیاتات قدیمہ سے ہے۔ مگر ہم ان پر بحث کئے بغیر ہی ابتدائے آفرینش انسان کے آثار محفوظہ متحجرہ کی شہادت پر غور کرتے ہیں +

زمین کی موجودہ حالت پر صرف ایک نظر ڈالنے سے ہی ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ سطح زمین کے دو سب سے زیادہ نمایاں واقعات آثار حیات کی نباتی اور حیوانی صورتیں ہیں۔ جو زمین کی سطح پر یا اس کی ہوا اور اس کے پانی میں آباد ہیں۔ ان نباتات اور حیوانات کا سرسری امتحان بھی یہ بتلا دیتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دائمی تغیر کی حالت میں ہیں۔ اگرچہ یہ تغیر بہت آہستہ اور باقاعدہ ہوتا ہے۔ مگر اس کا ہونا ایسا ہی یقینی ہے۔ جیسا کہ خود ان چیزوں کا وجود۔ روئے زمین پر آثار حیات کی کوئی صورت بھی نہیں ہے۔ جو امتحان کرنے پر ہمیشہ متغیر ہوتی ہوئی ثابت نہ ہو۔ ہر نوع کے افراد ہمیشہ پیدائش۔ نشو ونما۔ شباب۔ پیری اور موت کے مختلف اثروں اور عملوں سے آتے جاتے رہتے ہیں۔ اور خود وہ نوعیں بھی بعینہ اپنے افراد کی طرح ٹھیک ایسے ہی طریقوں سے ادل بدل ہوتی رہتی ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ نوع کی عمر افراد کی عمر سے بے انتہا بڑی اور لمبی ہوتی ہے +

چنانچہ اس وقت بھی نباتات اور حیوانات کی بعض قسمیں بوڑھی ہو چکی ہیں۔ بعض جوان ہیں۔ اور بعض ادھیڑ۔ اگر ہم سطح زمین کے سب سے اوپر کے پرت کا امتحان کریں تو ہم اس میں آثار حیات کی بہت سی موجود صورتوں کی گزشتہ تاریخ پائینگے۔ مگر اس تحقیق میں ہم بہت دور نہیں جانے پاتے کہ ہم کو بعض نئی قسم کی صورتوں کے معتبر اور ناقابل تردید آثار ملتے ہیں۔ کہ وہ صورتیں اب نایاب ہیں۔ اگر اس تحقیق کو اور آگے لے جائیں اور ان جانداروں کی متحجرہ صورتوں پر غور کریں تو ہم ان کے آس پاس کے طبقات الارض کے تعلق سے ان کی پوری تاریخ یعنی اُن کی پیدائش۔ شباب اور موت کا سارا حال معلوم کرسکتے ہیں +

لیکن جوں جوں ہم سطح زمین کے اندر اپنی کوششوں کو وسیع کرتے ہیں۔ ہم آثار حیات کی اور نئی نئی صورتیں پاتے ہیں۔ جن کا سطح زمین کے اوپر

Marfat.com

مطلق وجود نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے اوپر کے پرتوں میں بھی ان کا کچھ نشان نہیں ہے۔ غرض ہم جہاں تک چلا ہیں اس تحقیقات کو پھیلاتے اور نیچے اترتے چلے جائیں۔ یہی صورت پیش آتی جائیگی۔ اور آخر کار مشاہدہ ہم کو یہ حکم عام لگانے کا اختیار دے دیگا کہ آثار حیات کی تاریخ دونوں کا ایک تذکرہ ہے۔ کہ یہ دور سے زمانہ نیستی سے شروع ہوکر زمانہ حال تک یکے بعد دیگرے صورت پذیر ہوتے جاتے ہیں ✤

اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ تاریخ حیات مختلف نوعوں کا ایک دورانی سلسلہ ہے۔ جو برابر اوپر چڑھتا جاتا ہے۔ دورانی سلسلہ اس طرح کہ اس میں سے پرانی قسمیں فنا ہوکر گرتی جاتی ہیں۔ اور نئی قسمیں پیدا ہوکر بڑھتی جاتی ہیں۔ غالباً یہ سلسلہ دنیا کے قیام تک قائم رہیگا۔ یہ دورانی سلسلہ ایک دفعہ ثابت ہو جانے کے بعد ایسا ہی بے بدل پایا جاتا ہے۔ جیسے طبقات الارض کے مختلف طبقے اور گوناگوں انقلاب۔ اور دنیا کی تاریخ حیات بھی ایسی ہی ناقابل تغیر ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ خود طبقات الارض کی تاریخ ✤

اس نقطہ خیال سے علم نباتات قدیمہ کا ہمارے اصل مسئلے کے متعلق پورا فائدہ ظاہر ہوتا ہے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ وہ نہایت قدیمی سنگین یادگاریں جو ابتدائی آدمیوں کی دستکاری کا نمونہ خیال کی جاتی ہیں اپنے بنانے والوں کی قدامت کا وقت نہیں بتلا سکتیں۔ کیونکہ خود اس زمانے میں بھی لوہے کے ساتھ پتھر کے آلات کا استعمال روے زمین پر موجود ہے۔ گویا قرن الحجر اور قرن الحدید دونوں پہلو بہ پہلو پائے جاتے ہیں۔ لیکن آثار حیات کی پرانی صورتیں موجودہ صورتوں کے ساتھ ہرگز نہیں ملتیں۔ ان کے دورانی تسلسل کی ترتیب ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔ خواہ نباتات میں دیکھیں یا حیوانات میں۔ نئی نسل اور اعلٰے طرز پرانی اور ادنے کی جگہ لیتی ہے۔ اس طرح اگر ایک دفعہ کسی صورت متحجرہ کی صحیح تاریخ اس کے طبقات زمینی کے تعلق سے دریافت کرلی جائے تو یہ علم ہمیشہ آئندہ اس کے متعلقہ صورتوں اور مختلف مدوں کا وقت معین کرنے کے لئے معیار کا کام دیتا ہے ✤

Marfat.com

غرض اس طرح ازمنہ قدیمہ کے تعین میں پہلے پہاڑی ریچھ کا دورہ ہے۔ اس کے بعد میموتھ کا۔ اس کے بعد رین ڈیر کا اور اس کے بعد پالتو جانوروں کا۔ یہ ترتیب اگرچہ وسط یورپ کے لحاظ سے مقرر کی گئی تھی۔ مگر اصل یہ ہے کہ ساری سطح زمین کے لئے ایسی ہی درست ہے۔ جیسے زمین کے مختلف طبقوں کی ترتیب +

اس سلسلہ دورانی کی ترتیب تاریخی زمانے سے پہلے ابتدائے وجود انسانی کے دریافت کرنے میں بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ انسان کو ہمیشہ اور حیوانات موجودہ سے قریبی تعلق رہا ہے۔ عادتاً انسان اب بھی ایک حد تک گوشت خوار ہے اور وحشیانہ حالت میں تو پورا درندہ تھا۔ اسلئے شروع ہی سے سامان خوراک کے لئے انسان نے اپنے ساتھ کے ہمعصر جانوروں کو شکار کرنا اختیار کیا۔ یہاں ہم یہ سب باتیں صرف اس لئے بیان کر رہے ہیں۔ تاکہ انسانی ابتدا کی تحقیق میں جانوروں کی ترتیب اور اُن کے بقیوں کا فائدہ اچھی طرح واضح ہو جائے +

عالم حیوانات کی ابتدائے عالم سے اب تک کی ترتیب کے علاوہ بہت سی مفید اور دلچسپ باتیں حیوانی دنیا کے مطالعہ سے معلوم ہوتی ہیں ان میں سے ایک یہ کلیہ اصول ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے وحشی جانوروں کی قوت و طاقت اور قد و قامت میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ اور پالتو جانوروں میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔ اکثر جانور جو ابتدائی انسان کے ہمزمانہ تھے بڑے قدآور اور جسیم ہوتے تھے۔ ہم ان میں سے چند عظیم الشان درندوں کا ذکر اشارتاً کر ہی چکے ہیں۔ جو یورپ اور امریکہ میں رہتے تھے۔ ان میں سے ایک خوفناک پہاڑی ریچھ تھا۔ ایک پہاڑی شیر ایک پہاڑی بجو عام طور پر یہ جانور بلی کی قسم کے ہوتے تھے۔ ان کے علاوہ نباتات کے کھانے والے جانور بھی بڑے تنومند اور قوی الجثہ ہوتے تھے۔ اسی زمرے میں وہ عظیم جانور شامل ہے۔ جسے آئرلینڈ کا بارہ سنگھا کہتے ہیں۔ ان میں ایک قسم کا گینڈا بھی تھا۔ جسکے دو سینگ اور بالدار جسم ہوتا تھا۔

Marfat.com

انہی میں وہ بڑا دریائی گھوڑا بھی شمار ہوتا تھا۔ جس کے نمونے آج بھی وادی نیل کی دلدل میں لوٹتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں یہ جانور آج کل کے نمونوں سے بہت زیادہ جسیم اور تند مزاج ہوتا تھا۔

غرض یہ تمام جانور درندے اور چرندے آج کل کے ہم قسم جانوروں سے بہت زیادہ بڑے اور مضبوط ہوتے تھے۔ وہ عظیم الشان سخت[1] جلد والے جانور جو سطح زمین کے گرم خون والے جانوروں میں سب سے زیادہ بڑے تھے۔ کمیابی کے ساتھ ہی کمزور اور پست قد بھی ہوتے گئے۔ اور اب تک ہوتے جاتے ہیں۔ سوائے ان چند قسموں کے جن کو انسان نے رام کر کے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ لیکن یہ قاعدہ صرف وحشیوں پر حاوی ہے۔ پالتو جانوروں میں معاملہ برعکس ہے۔ وہ بلند۔ قدآور۔ دیوزاد گھوڑے جو آج انسان کی خدمتگزاری کر رہے ہیں۔ زمانہ قدیم کے خچر نما وحشی گھوڑوں کی اولاد ہیں۔ آج کل دنیا میں تمام قدیم زمانوں کی نسبت زیادہ قدآور بھیڑیں۔ بکریاں اور کتے پائے جاتے ہیں۔ اور اگر گائے بھینسیں پرانے سانڈوں سے قد میں بڑی نہیں ہوتیں۔ تو کم از کم وزن اور طاقت میں اپنے بزرگوں سے کم بھی نہیں ہوتیں۔ یہ دونوں قانون محقق کو انسانی قدامت کے مسئلے پر بحث کرنے میں بڑی مدد دیتے ہیں۔ انسان اور مذکورہ بالا جانوروں کی ہمسری اور ہمعصری کم از کم طبقہ علما میں مسلم اور یقینی امر ہے۔ اس لئے قدامت انسان کی تاریخ معلوم کرنا اور ان ہمعصر نایاب جانوروں کے زمانے کا سراغ لگانا یکساں نتیجہ خیز ہیں۔ پھر ان جانوروں کا زمانہ گویا کرۂ زمین کی اس زمانے کی عمر معلوم کرتا ہے۔ جس میں یہ جانور رہتے سہتے تھے۔ اگرچہ بعض صورتوں میں جانوروں کا زمانہ بے ان کے پاس کے طبقات زمینی سے لگائے ہوئے بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ لیکن عام طور پر ہم کو ان طبقات زمینی کی تحقیق کرنی پڑتی ہے۔ حاصل کلام

---

[1] (Pachyderm)۔ دودھ پلانے والے جانوروں کی ایک قسم جو اپنی کھال کی سختی کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہوئی۔ قدوقامت میں یہ جانور اپنی مثل نہیں رکھتے۔ چنانچہ ہاتھی۔ گینڈے۔ دریائی گھوڑے وغیرہ سب اسی قسم میں شامل ہیں۔

Marfat.com

یہ ہے کہ اس سوال کا زیادہ تر جواب طبقات الارض سے ملتا ہے۔ اور آثار قدیمہ اور نباتات قدیمہ محض اس کی تائید اور تصدیق کرنے والے اجزا ہیں ٭

باب پنجم

نوعِ انسان کی عمر کی بابت علم انتھروپالوجی کی رائے

اسی طرح رفتہ رفتہ ہم اس علم جدید کی حد تک پہنچتے ہیں۔ جس کو انتھروپولوجی کہتے ہیں۔ اس کے مبحوث فیہ مضامین کا ذکر ہم پہلے باب میں کر چکے ہیں۔ یہ علم اپنی ابتدا میں نباتات قدیمہ کی ایک قسم یعنی نوع انسانی کی بابت بحث کرتا ہے۔ اور آگے چل کر تدرتی طور پر اس کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ علم الاقوام اور تہذیب الاقوام۔ یہاں اس کے ذکر سے ہمارا مطلب صرف یہ دکھلانا ہے کہ یہ علم بھی تھوڑی بہت روشنی قدامت انسانی پر ضرور ڈالتا ہے۔ مثلاً ہماری نوع کے افراد کی طویل العمری خود نوع کی درازی حیات پر دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ افراد اور اُن کی انواع کی مدت حیات میں ایک قریبی اور گہرا تعلق ضرور پایا جاتا ہے۔ یقیناً انسان روے زمین کے نہایت طویل العمر جانوروں میں سے ہے۔ اس لئے نوع انسان کی قدامت اور طوالت دلائل عقلی و نقلی سے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے ٭

اگر علم تشریح وجراحت کے لحاظ سے انسانی ساخت پر غور کیا جاے تو نوع کی بے انتہا قدامت کا سراغ ملتا ہے۔ جسم انسانی میں ایسے بچے ہوئے رگ پٹھے پائے جاتے ہیں۔ جو تاریخی زمانے کی ابتدا سے ہیں۔ مگر جن کا کوئی استعمال نہیں ہوتا۔ لیکن اگر بعض اور حیوانات کو دیکھیں تو معلوم

Marfat.com

ہوتا ہے کہ ان کے جسم میں یہی رگ پٹھے خوب نشو ونما پاکر پوری طرح کام دیتے ہیں۔ اور یہ امر فلسفہ جدید کے ہاتھوں میں اس بات پر ایک قوی دلیل ہو جاتا ہے۔ کہ فی الحقیقت انسان اور تمام حیوانات متحد الاصل ہیں۔ جن میں آہستہ آہستہ اختلاف اوضاع واطوار اور مباینت شکل وصورت پیدا ہو گئی ہے۔ یہاں ہم اس بحث کو چھیڑنا نہیں چاہتے۔ بلکہ صرف یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ کہ خواہ اصل انسانی کی کوئی وجہ قرار دی جاے۔ لیکن یہ پرانے عضلات کے بقیہ رگ پٹھے ضرور اور نہایت نمایاں طور پر انسان کی انتہائے قدامت پر دال ہیں +

مناسب ہے کہ اس جگہ ذرا ٹھہر کر ان بقیہ عضلات اور ان کے نتائج پر غور کریں۔ ہر انسان کی آنکھ کے نچلے حصے میں ایک متحرک پردے کا نشان ملتا ہے۔ جو بالکل اس پردے کی طرح ہوتا ہے۔ جیسا کہ مرغیوں اور بطخوں کی آنکھ میں پایا جاتا ہے۔ اس کا وجود چاہتا ہے کہ اس کا کوئی فائدہ بھی ہو +

مذکورۂ بالا پرندوں میں اس پردے کا کام مردمک چشم کی حفاظت کرنا ہے جسم انسانی میں بھی اس کا اگر کچھ فائدہ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔ مگر موجودہ زمانے میں یہ بالکل بیکار ہے۔ آئندہ زمانے میں اس کا مستعمل ہونا اور بھی زیادہ خلاف قیاس ہے۔ کیونکہ غالباً انسانی ترقی اعضاے انسانی کی محافظت کے لئے اور اسباب مہیا کریگی نہ یہ کہ موجودہ ذرائع کو بھی چھوڑ کر پھر جانوروں کی طرح قدرت کی محتاج ہو جاے۔ اس طرح غور کرنے سے بجز اس کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ پردہ بھی زمانہ ماضی میں اپنا کام دے چکا ہے۔ مگر آہستہ آہستہ انسانی شائستگی۔ اور ترقی اور خود اندرون چشم کی زیادہ موزوں اور محفوظ ہو جانے کی وجہ سے ایسے متحرک پردے کی ضرورت کم ہو گئی۔ یہاں تک کہ یہ پردہ بالکل بیکار ہو گیا۔ اور پھر طبعاً کمزور اور چھوٹا ہوتے ہوتے تقریباً نابود ہو گیا۔ ہمارے خیال میں شاید اس کے علاوہ اور کوئی معقول وجہ انسان میں اس بیکار پردۂ چشم کے نشان اور وجود کی

Marfat.com

نہیں بتائی جا سکتی +

اسی پر ہم اور اسی قسم کے اعضا کے بقیہ نشانوں کو محمول کر سکتے ہیں اور ان کا استعمال اور فائدہ ان حیوانوں کی بناوٹ پر غور کرنے سے قیاس کر سکتے ہیں۔ جن میں وہ اعضا ابھی تک موجود اور مستعمل ہیں۔ مثلاً کان کو ہلانے کے پٹھے کم درجے کے جانوروں کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ لیکن چونکہ انسان اپنے ہاتھ کو اچھی طرح استعمال کر سکتا ہے۔ اس لئے اسے ان کی چنداں ضرورت نہیں۔ مگر ان پٹھوں کا بقیہ ابھی تک جسم انسانی میں موجود ہے۔ اور بعض ایسے آدمی بھی ہیں۔ جو ان کو استعمال کر سکتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کسی قدیم زمانے میں تمام نوع آسانی سے ایسا کر سکتی ہو گی۔ یہی حال اور ایسے اعضا کا بھی سمجھنا چاہیئے۔ جن کے وجود کا آج تک کوئی معقول سبب بیان نہیں کیا گیا۔ مگر یہ کہ ایک زمانے میں ہمارے پرانے بزرگ ان کو پوری طرح استعمال کر سکتے تھے۔ گو اب امتداد زمانہ کے بعد ضروریات زندگی کے تغیر و تبدل اور حالات حیات کے انقلابات کی وجہ سے یہ اعضا غیر ضروری ہو کر چھوٹے اور بیکار ہو گئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جسم انسانی کے بعض پس ماندہ حصے مثلاً مردوں کے پستان ایک ایسے دور دراز کے زمانے کا پتہ دیتے ہیں جبکہ اس نوع میں نر مادہ میں بھی امتیاز نہیں ہوا تھا +

ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ یہاں ان بیانات سے مسئلہ (ارتقا) ایولیوشن کا ثبوت منظور نہیں ہے۔ بلکہ صرف قدامت انسان کے مسئلے کے متعلق علم تشریح انسان قدیمہ کی شہادت حاصل کرنی ہے۔ ہم خود ہی خیال کر سکتے ہیں کہ ایسی عجیب اور حیرت انگیز تبدیلیوں کے لئے کتنا وقت درکار ہو گا۔ ذرا گزشتہ زمانوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں۔ مصر کے قدیمی نقش و نگار ہم کو اب سے ۵ ہزار برس پہلے کے آدمیوں کی صورت دکھاتے ہیں۔ جن کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ جسم انسانی اپنی موجودہ صورت اس سے پہلے ہی اختیار کر چکا تھا۔ اور تمام اسباب بالامتیاز

Marfat.com

پہلے ہی پیدا ہو چکے تھے - کوئی دلیل بھی نہیں ہے - جس سے معلوم ہوگا اہرام مصری کے بنانے والوں کے یہ اعضا آجکل کے لوگوں سے زیادہ کارآمد طاقتور اور مفید ہوتے تھے - گویا اس تفریق اور تمیز کا عمل ۵ ہزار برس سے مدتوں پہلے ہی مکمل ہو چکا تھا - قیاس کیا جا سکتا ہے کہ خود اس عمل میں کتنا وقت لگا ہوگا - اور ہم اس لامحدود زمانے کی بابت کیا کہہ سکتے ہیں جو زن و مرد میں اس تفریق پیدا کرنے کے لئے ضروری ہوگا - جس کی بچی ہوئی نشانیاں ہم سے ۵ ہزار برس پہلے کے مردوں میں بھی ویسی ہی پائی جاتی ہیں - جیسی آج کل کے لوگوں میں ✦

آگے چل کر اس علم کی دو نہایت ضروری شاخیں ہو جاتی ہیں - یعنی علم الاقوام - اور تہذیب الاقوام - یا یوں کہو کہ دونوں علم بڑھتے بڑھتے متحد ہو کر تشریح الانسان میں مل جاتے ہیں - جیسے تشریح الانسان علم حیوانات میں - اور علم حیوانات علم الابدان میں ✦

لیکن حقیقت میں علم الاقوام اور تہذیب الاقوام میں فرق دکھانا ذرا مشکل ہے - بعینہ جیسے جغرافیہ اور طبقات الارض کا فرق باریک اور بعض جگہ بالکل معدوم ہے - فی الواقع علم الاقوام - تہذیب الاقوام اور تشریح انسان اپنے ضمن میں علم اللغات - علم القوانین - علم آثار قدیمہ - جغرافیہ اور تاریخ و قصص کو بھی شامل کر لیتے ہیں - یہاں ہم ان دونوں علموں سے بھی وہی فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جو ہمارے سوالات سے تعلق رکھتا ہے - سب سے پہلی بات جو ہم کو ذہن نشین کرنی چاہیئے - وہ نوع انسان کا مختلف قبیلوں اور قوموں میں منقسم اور متفرق ہو جانا ہے - سیاح جو عموماً ان مختلف انسانی قوموں کو دیکھنے اور ان سے ملنے جلتے ہیں - ان میں متحدہ باتیں دیکھنے کی نسبت اختلاف کی صورتیں زیادہ دیکھتے ہیں - نوع انسان دریاؤں کے کناروں سے پھیلنی شروع ہوئی - اور تمام روے زمین پر پھیل گئی - اور جسمانی - دماغی اور اخلاقی ترقی کے تمام مدارج اس کے مختلف ٹکڑوں کی کم و بیش ترقی سے پُر ہو گئے ✦

Marfat.com

اب سوال یہ ہے کہ کب اور کس وقت یہ قومی خصوصیتیں ظاہر ہونی شروع ہوئیں۔ اس کا جواب دینے سے پہلے کم ازکم اتنا پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اختصاص یک بیک پیدا نہیں ہوئے۔ یعنی وہ فرق اور اختلاف جن سے ایک قوم دوسری قوم سے جدا ہوتی ہے۔ اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے پہچانا جاتا ہے۔ یکبارگی ظاہر نہیں ہوئے۔ بلکہ نہایت آہستہ آہستہ غیر محسوس تغیر و تبدل سے پیدا ہوئے ہیں۔ تاریخ صرف ایک بات یقینی طور پر بتلا سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ اختصاص اور امتیاز تاریخی زمانے کی روشنی سے پہلے ہی پہلے نمایاں ہو چکے تھے۔ اور تب سے اب تک اتنا بھی نہیں ہوا کہ ان میں کوئی معقول زیادتی ہو کر اس تفرقے کو اور زیادہ واضح اور روشن کرتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کل ترقی تہذیب و شائستگی سے وہ گہرے خط و خال جو قوموں کو باہم ممتاز کرتے تھے روز بروز رو بہ کمی ہو کر مٹتے جاتے ہیں۔ اور اس میں کچھ شک نہیں کہ علی العموم قدیم سے قدیم قومیں بھی جن سے ہم آشنا ہیں۔ اپنے موجودہ اخلاف کی نسبت باہمی اختلاف زیادہ اور زیادہ نمایاں رکھتی تھیں ٭

ان باتوں پر تاریخی شہادت لانا بیکار ہے۔ اگر اور کوئی گواہی نہ بھی ہوتی تو صرف مصر اور شام کی یادگاری عمارتیں اقوام انسانی کے پرانے اختلاف اور تفرقے کے لئے کافی ثبوت ہیں۔ مصر کی قدیم سنگی تصویروں میں ہم کو چار مختلف قوموں کے بالکل الگ الگ نمونے نظر آتے ہیں۔ کہ آج تک بھی ان لوگوں کی شکل و شباہت بعینہٖ ویسی ہی ہے اور ان تصویروں کے خط و خال ایسی صفائی اور احتیاط سے بنائے گئے ہیں۔ گویا ان کو انیسویں صدی کے آخری عشرے کی کسی عالم علم الاقوام نے اپنے مضامین کی توضیح کے لئے بنایا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اہرام مصری کی بنا سے پہلے ہی یورپ ایشیا اور افریقہ کی مختلف قومیں اپنی اپنی خصوصیات سے ممتاز ہو چکی تھیں ٭

عقل صحیح ان مسلمہ باتوں سے دو تین نتیجوں میں۔ سے ایک کے ماننے پر

Marfat.com

مجبور ہے۔ یا تو یہ تسلیم کیا جائے کہ انسانی قومیں ایک اصل کی مختلف شاخیں ہیں جو تاریخی معائنے میں آنے سے بہت پہلے پیدا ہو چکی تھیں۔ اور ان کے تمام اختلاف اور امتیاز کے اسباب اس تاریخی زمانے سے قبل کی مدت مدید میں نمایاں ہو گئے تھے۔ یا یہ فرض کیا جائے کہ انسان دنیا میں مختلف جگہ جدا جدا حالات میں الگ الگ اصلوں سے پیدا ہو گئے۔ اور جب یہ لوگ تاریخی زمانے کی روشنی میں ہم کو نظر آئے تو اختلاف احوال اور تفرقہ اصول کی وجہ سے ایک دوسرے سے متمیز و ممتاز۔ اور وہی خصوصیات لئے ہوئے نظر آئے۔ جو آج تک ان میں اسی طرح موجود ہیں۔ ایک تیسرا قیاس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ زمانہ قدیم کے کسی حصّے میں مختلف قوموں کے اجداد دفعتاً اپنی اصل سے شکل و شباہت میں مختلف ہو گئے ہوں۔ جیسے سگے بھائی بہن جو ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہوتے ہیں۔ ایکدوسرے سے صورت شکل میں نہیں ملتے۔ غرض اس قسم کے قیاسات اور بھی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ مگر یہاں اس مسئلے کی متفرق صورتیں دکھلانے کے لئے یہی کافی ہیں +

موجودہ زمانے میں جو اصول طبعیات سے اتنا آگاہ اور عالم امکان میں اسباب و نتائج کا اتنا معتقد ہے۔ یہ کہنا محض غیر ضروری ہے کہ مذکورہ قیاسات میں سے صرف پہلا ہی صحیح اور درست معلوم ہوتا ہے۔ یہاں ہم اقوام انسان کے متحد الاصل یا مختلف الاصل ہونے پر بحث نہیں کرتے۔ لیکن جہاں تک ہم ترقی زندگی کے باقاعدہ اور باترتیب انقلابات سے واقف ہیں۔ وہاں تک ان قومی خصوصیات کی صرف ایک ہی معقول اور قرین قیاس وجہ ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ نہایت قدیم زمانے میں جس کی مدت ہزارہا ہزار سال سے بھی پرے تک پھیلی ہوئی ہے۔ ایک خاص صورت کے آدمی دنیا میں پیدا ہوئے۔ اور آئندہ زمانے کے انقلابات سے۔ لیکن تاریخی زمانے کی ابتدا سے بہت پہلے۔ ابتدائی آدمیوں کی قومیں نہایت آہستہ آہستہ اور بالکل غیر محسوس مدارج سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتی گئیں۔ اور سفر کی وجہ سے طرح طرح کی آب و ہوا

Marfat.com

اور وضع وضع کے مقامات میں رہتے رہتے نئے نئے اوضاع و اطوار اور آور آور خط و خال پاتی گئیں۔ جن لوگوں نے اس قسم کے معاملات پر غور کیا ہے۔ وہ ان انقلابوں کی آہستہ روی۔ اور ان تبدیلیوں کی دھیمی رفتار کو خوب جانتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے غور نہیں کیا وہ آسانی سے اس کا قیاس اور تصوّر کر سکتے ہیں ٭

اس طرح یہ علم قدامت انسان کا اندازہ لگانے کے لئے ایک معیار مہیا کر دیتا ہے۔ اوپر ہم ذکر کر چکے ہیں کہ مصری تصویریں ہم کو کم از کم ۵ ہزار برس پہلے کے صحیح قومی نقشے اور چہرے مہرے دکھاتی ہیں۔ ان کو ان کے موجودہ نمونوں سے ملانے سے ہم کو اس قسم کے انسانی تغیر کی رفتار کا پتہ لگ سکتا ہے۔ یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ وحشیانہ حالت کی نسبت تہذیب کے زمانے میں یہ رفتار زیادہ تیز ہوتی ہے۔ اگرچہ قیاس اس کے برعکس چاہتا تھا۔ چنانچہ مصریوں کی بنائی ہوئی حبشی تصویر اور آج کل کے زندہ نمونے میں گویا کچھ بھی فرق نظر نہیں آتا۔ لیکن آج کل کے قبطی جن پر اتنی مختلف تہذیبوں اور اتنے متفرق تاریخی اثروں نے رنگ ڈالا ہے۔ اپنے پرانے مصری آباؤ اجداد سے خط و خال میں بالکل نہیں ملتے۔ اسی طرح زمانہ حال کے یونانی اور اطالی۔ یونان اور اطالیہ کے قدیم باشندوں سے کئی باتوں میں مختلف ہیں۔ مگر ایشیا کے جنگلوں میں رہنے والے اور امریکہ کے اصلی باشندے کئی ہزار سال میں بھی اپنی پرانی صورت سے نہیں بدلے پر قاعدہ اس زمانے کی مدت کو گھٹانے کی بجائے اور بھی بڑھا دیتا ہے۔ جو ان مختلف اقوام انسانی کو اس قدر متغیر ہونے کے لئے ضروری ہوا ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ وادی مصر میں یقیناً۔ اور وادی اٹک اور وادی فرات میں غالباً اب سے ۵ ہزار سال پہلے تہذیب پوری طرح اشاعت پا چکی تھی۔ اس لئے اس کا اثر قومی خط و خال کے بدلنے میں ضرور بڑا ہوگا۔ ان سب باتوں کو دیکھتے ہوئے اگر ہم نوع انسان کی تمام مختلف اقوام کے ظاہری اختلاف کے لئے اس عرصے سے ۵ گنا وقت قرار دیں تو غالباً کچھ

Marfat.com

مبالغہ نہ ہوگا۔ اور اگر یہ اندازہ بالکل صحیح نہ بھی ہو تو اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ یہ قیاس صحت کے بہت قریب ہے +

انسانی قدامت کے ثبوت کا انحصار صرف اس اختلاف ظاہری پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ ابتدائی قوموں کی تمام سطح زمین پر پھیلانے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ تاریخی زمانے کے اندر بجز چند جزیروں کے عموماً اور کوئی ملک یا کوئی قطعہ زمین غیر آباد نہیں ملا۔ پندرھویں صدی میں جزائر غرب الہند کا کچھ کچھ حصہ ویران تھا۔ اور مجمع الجزائر ایشیا کے چند جزیرے غیر آباد ملے۔ باقی تمام دنیا زمانہ قدیم سے ہی آباد پائی گئی۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہزارہا سال پہلے کے آنے والوں نے بھی اس ملک کو اپنے آپ سے زیادہ پرانی قوموں سے بسا ہوا پایا۔ جب آریا نسلوں کی عظیم الشان لہر وسط ایشیا سے اُٹھی۔ تو انہوں نے بھی اپنے آگے کسی ملک کو غیر آباد نہ پایا۔ غرض جہاں تک تاریخی روشنی ہم کو زمانۂ قدیم کے حالات دکھانے کے لائق ہے۔ وہاں تک صرف یہ تمام روئے زمین کی آبادی ہی ایک ایسی بات ہے۔ جس میں کوئی استثنا نہیں ملتی۔ ابتدائی قوموں کی یہ ابتدائی اور عظیم الشان پراگندگی قدامت انسانی کی ایک زبردست دلیل ہے اور یہ قدامت اور بھی زیادہ قدیم معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم ان نیم وحشی لوگوں کے سفر کی دقتوں اور راستوں کی صعوبتوں کی بابت خیال کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو اپنے نقل مکان کرنے میں کس قدر قدرتی موانع اور مصائب کا سامنا ہوتا ہوگا۔ یہ عام خیال ہے کہ قومیں مل کر سفر کرتی تھیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے۔ اگرچہ بعض بعض اوقات خاص خاص حالتوں میں ابتدائی آدمی مجموعاً اپنے پہلے مسکن کو خیرباد کہکر دفعتہً واحدۃً نئے ملک۔ نئے جزیرے۔ بلکہ نئے برّاعظم تلاش کرنے کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ لیکن ایسا شاذ ہوتا تھا۔ اور فی الواقع بنی آدم کا سطح زمین پر پھیل جانا سفر اور نقل مکان سے نہیں ہوا۔ بلکہ پراگندگی اور فراق سے ہوا ہے۔ یعنی ہماری نوع دنیا میں اس طرح نہیں پھیلی۔ جیسے بعض پرندے تبدیل مقام کرکے دوسری جگہ جا بستے ہیں۔ بلکہ ایسے بڑھی ہے۔

جیسے کوئی بیل کسی درخت کی ڈال ڈال شاخ شاخ پر چھا جاتی ہے۔ مگر ایسے آہستہ آہستہ کہ کوئی نظر اس کو بڑھتے ہوئے دیکھ نہیں سکتی۔ اور کوئی شخص اس کی رفتار کو محسوس نہیں کر سکتا۔ مگر چند دن کے بعد دیکھیں تو بیل زیادہ بڑی اور پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بعینہٖ اسی طرح ابتدائی انسان بھی روے زمین پر پھیلے ہیں۔ ہاں اگر اس طرح پھیلنے والے خاندانوں کے آگے بڑھے ہوے افراد کو کوئی ایسی جگہ مل جاتی تھی جو واقع میں زیادہ موزون اور مناسب ہوتی تھی۔ تو پھر البتہ تمام خاندان کی حرکت اس طرف تیز ہو جاتی تھی۔ یہاں تک کہ وہ کل نیا مقام آباد ہو کر اپنے منافع ان لوگوں کی نذر کر دیتا تھا۔ اس طرح قیاس صحیح ہم کو ابتدائی آدمیوں کی شروع شروع کی پراگندگی اور ترقی کا نقشہ دکھاتا ہے۔ ان کے حدود کا پھیلاؤ بالکل اُس دریا کی طرح ہو گا۔ جس کا پانی بالکل ساکن معلوم ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھ کر یہاں ہم صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ باوجود اس قدرسستاوی کے ان ابتدائی قوموں کو تمام روے زمین پر پھیل جانے کے لئے کتنا وقت ضروری ہوا ہو گا۔ اور اس سے مسئلہ قدامت انسانی پر کیا کچھ اثر پڑیگا۔ مثلاً خیال کرنے کی بات ہے کہ آدمیوں کو اپنی وحشیانہ حالت اور ابتدائی طرز سفر کی وجہ سے بحر الکاہل کے تمام جزائر اور بحر اعظم امریکہ۔ اور آسٹریلیا جیسے دور دراز ملکوں میں پھیل جانے میں کیا کیا دقتیں اور کیسی کیسی آفتیں پڑی ہونگی۔ اور مسافت کے علاوہ خود قدرتی رکاوٹوں اور جغرافی کیفیتوں نے ان کو کتنی دفعہ ناکام اور دل شکستہ لوٹایا ہو گا۔ اور آخر کتنی مدت اور کس قدر زمانے کے بعد ان تمام موانع سے گزر کر انہوں نے اپنی اپنی منزل مقصود کو پایا ہو گا۔ اس کا جواب صدیوں اور قرنوں میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ہزارہا ہزار سال کی ضرورت ہے +

چند اور باتیں بھی ملحوظ خاطر رکھنی چاہئیں۔ جن سے فطرتاً اس انسانی پراگندگی میں تاخیر ہوئی ہو گی۔ اوّل تو یہی کہ یہ کام ابتداے زمانہ تہذیب

Marfat.com

سے مدتوں پہلے تمام ہو چکا تھا۔ یعنی اسی زمانے میں جبکہ ترقی کے کاروبار نے ملکوں کو صاف اور شائستگی کے معمار نے راستوں کو ہموار نہیں کیا تھا۔ اور ابتدائی آدمی ابتدائی حالت میں اس ناہموار اور دشوار گزار دنیا میں بستے تھے آج کل کے آدمی اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ ابتدائی آدمیوں کو ان کی وحشیانہ حالت میں چھوٹے سے دریا کے عبور کرنے میں بھی کیا کیا مشکلیں پیش آئی ہونگی۔ یہ بھی مان لیجئے کہ وہ لوگ تیرنا جانتے تھے۔ مگر چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایک تیز اور چوڑے دریا کے پار اتارنا اُن کے لئے تقریباً محال ہو گا۔ اس میں شک نہیں کہ ناؤ اور کشتی کا استعمال انسان کی ابتدائی حالت ہی میں رائج ہو گیا تھا۔ لیکن بہرحال ایک وقت ضرور تھا۔ جبکہ ابتدائی وحشیوں نے ان چیزوں کے بنانے کی ترکیب ایسے ہی ہوئے ہوئے۔ آہستہ آہستہ۔ رفتہ رفتہ۔ درجہ بدرجہ۔ ٹھہر ٹھہر کر۔ ڈرتے ڈرتے سوچی ہو گی۔ جیسے ترقی کے زمانے والوں نے ریل اور دودی جہازوں کی۔ بلکہ غالباً اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ فی الواقع تاریخی زمانے سے پہلے انسانی ترقی کے نہایت معمولی مدارج بھی ایسی ایسی مشکلات شکوک۔ محنتوں۔ کوششوں اور ناکامیوں کے بعد طے کئے گئے ہیں کہ اُنہوں نے اس ترقی کو بے انتہا اور لامحدود زمانے تک نمایاں نہ ہونے دیا ہو گا۔ قدامت انسان کے تمام تخمینے اور اندازے جبتک کہ ان میں ان تمام باتوں کو مدنظر اور ذہن نشین نہ رکھا جائے اصولاً غلط ہیں۔ پرانے زمانے میں روئے زمین پر ایک بھی عمدہ راستہ نہ تھا۔ قدرت سڑکیں تیار نہیں کرتی۔ پُل نہیں بناتی۔ اسی ضمن میں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ اس تمام پرشکوہ اور جنگجو دنیا میں جس کا خاکہ مصر۔ ہندوستان۔ یونان کارتھیج[1]۔ اور رومنہ الکبرے کی قدیم تاریخ دکھاتی ہے۔ ایک بھی سرنگ یا زمین دوز راستہ نہیں تھا۔ اس زمانے کے لوگوں نے نہریں پُل۔ بندرگاہیں

[1] (Carthage) شمالی افریقہ کا ایک قدیم اور مشہور شہر جہاں اب شہر تونس آباد ہے۔ اس کی جگہ تجارت اور آمدورفت کے لئے نہایت موزوں ہے۔ یہ شہر اہل فونیشیا نے نویں صدی قبل مسیح میں روما کی بنا سے سو سال پیشتر آباد کیا تھا۔

Marfat.com

تہ خانے۔ پانی کے تہ زمین راستے تو سب کچھ بنائے اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ایسے آدمی آج کل کی سی زمین دوز سڑک نہ بنا سکتے۔ مگر یہ کام نہ سکندر[1] اور سیزر[2] کے زمانے میں ہوا۔ نہ جسٹینین[3]۔ شارلیمین[4]۔ ہارون الرشید اور مامون الرشید[5]۔ کے عہد میں ہوا۔ نہ الزبتھ[6]۔ اکبر اور لوئی[7] کے سامنے ہوا۔ یہاں تک کہ نپولین کے وقت میں بھی نہ ہوا۔ بلکہ صرف انیسویں صدی کے معماروں اور دھندسوں نے ہی انسانی آمد و رفت کی تیزی اور آسانی کے لئے زیر زمین راستے بنانے میں کام کیا۔ ہم اس سے پہلے کئی بار اشارہ کر چکے ہیں کہ سمندروں اور نہروں نے ان لوگوں کو بہت دن تک روکے رکھا ہوگا۔ ابتدائی انسان ان کو کس عظمت اور شان کی نظر سے دیکھتے ہونگے۔ اور ان کے سامنے اپنے آپ کو کس قدر

---

[1] سکندر۔ یونان کا مشہور معروف بادشاہ جس نے ۳۳ سال کی عمر ہی میں تمام ایشیائے کوچک ایران۔ توران و ہندوستان اور مصر وغیرہ ملک فتح کر لئے۔ اور جو اگر زیادہ جیتا رہتا تو غالباً تمام دنیا کو مسخر کر لیتا۔ اس کا زمانہ ۳۰۰ سال قبل مسیح کا ہے +

[2] (Julius Caesar) ۱۲ جولائی سنہ ۱۰۰ قبل مسیح میں روما کے ایک بڑے خاندان میں پیدا ہوا۔ اور چونکہ اس کو اس کی ماں کا شکم چاک کر کے نکالا گیا تھا۔ اس لئے اس نام سے مشہور ہوا۔ یہ شخص نہ صرف سلطنت روما کا بلکہ تمام دنیا کے زمانہ قدیم کا سب سے بڑا آدمی گزرا ہے۔ اور یہ امر بے وجہ نہیں کہ اس کا نام اب تک دو ہزار برس بعد بھی تمام دنیا کے ملکوں میں سب سے بڑا لقب ہے۔ جرمنی اور روم اور جیبن کا قیصر اور روس کا زار اسی کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ اگرچہ تاریخ اس شخص کو بہت سے لباسوں میں دکھاتی ہے۔ مگر جہاں تک غور کیا جائے اس کی عظمت و شان دماغ پر زیادہ اثر کرتی جاتی ہے یہ شخص ایسے وقت میں پیدا ہوا جبکہ روما کی سلطنت خود اپنی وسعت کی وجہ سے ٹوٹنے والی تھی مگر اس نے اسے سنبھالا۔ اور ایسا سنبھالا کہ اس آئینی سلطنت کو اپنی پشتینی جاگیر بنا لیا سنہ ۵۸ قبل مسیح کے قریب میں اس نے جنگ فرانس کے متعلق دو مشہور تشریحات (Commentaries) لکھیں جو اب تک اپنی فصاحت اور صحیح تاریخ کی وجہ سے بے نظیر ہیں۔ سنہ ۶۳ میں اسے روما کا اسقف اعظم اور سپہ سالار افواج بنا دیا۔ اس کے بعد سنہ ۶۰ سے سنہ ۴۵ قبل مسیح تک وہ مختلف فتوحات میں مصروف رہا۔ اور اس نے مصر۔ افریقہ۔ فرانس اور انگلستان تک فتح کر ڈالا۔ اور اپنے تمام مخالفین کو زک دی۔ اور آخر وہ شہنشاہ بن گیا۔ مگر اس کے چند ہی دن بعد سنہ ۴۴ قبل مسیح میں وہ سینٹ کے ایک جلسے میں دو فتنہ پرداز مخالفوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ جن کی بابت اٹلی کا نامور شاعر ڈینٹی (Dante) کہتا ہے کہ دنیا میں شیطان نے تین صورتیں اختیار کی ہیں۔ دو صورتیں ان دونوں قاتلوں کی جنہوں نے اپنے ملک اور اپنے بادشاہ کے ساتھ دغا کیا۔ اور ایک اس مکار حواری کی جس نے اپنے آقا حضرت عیسٰیؑ کو یہودیوں کے سپرد کیا +

[3] (Justinian the Great) سلطنت قسطنطنیہ کا سب سے بڑا اور نامور بادشاہ سنہ ۴۸۳ کو پیدا ہوا۔ چند دن

Marfat.com

بے وقعت اور ناچیز خیال کرتے ہونگے۔ اب بھی جبکہ جہازوں اور کشتیوں نے سطح سمندر کو اپنی دائمی آمدورفت سے خشکی کے شارع عام کی طرح آباد کر رکھا ہے۔ انسان اس کی بے انتہا گہرائی سے فطرتاً جان چراکر کونوں میں چھپتا ہے اور کناروں پر چلتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ابتدائی زمانے میں سمندروں بلکہ جھیلوں اور دریاؤں تک کا ناقابل عبور ہونا ایک موروثی خیال تھا۔ جو نسلاً بعد نسلٍ دلوں میں بیٹھتے بیٹھتے مذہبی عقیدت کا ایک جزو بن گیا تھا۔ اور ایسے موروثی خیالات کا جو کچھ روکنے والا اثر نہ صرف انسانی دل و دماغ پر بلکہ انسانی جسم پر ہوتا ہے۔ اس کا اگر کوئی علم کچھ اندازہ کرسکتا ہے تو وہ علم تاریخ ہے۔ مگر یہ بھی صحت کے ساتھ نہیں۔ ہم اکثر پاتے ہیں کہ قومیں آگے بڑھتے بڑھتے یکایک

(بقیہ صفحہ ۸۵) بعد اس کے لاولد چچا جسٹن نے اسے متبنےٰ بنالیا۔ اور یہی اس کی وجہ ترقی ہوئی۔ اوائل عمر ہی میں وہ قسطنطنیہ آیا اور ۵۱۸ء میں جب اس کا چچا تخت نشین ہوا تو جسٹینین گویا تمام سلطنت کا مالک ہوگیا۔ اور ۵۲۷ء میں اپنے چچا کے انتقال کے بعد حاکم بالاستقلال ہوگیا۔ اور ۵۶۵ء تک حکمراں رہا۔ اس کا زمانہ اپنی پرشکوہ فتوحات۔ قانونی انتظام۔ اور امور مذہبی کی اصلاح کے لئے مشہور ہے۔

۵۴ (Charlemagne) یا چارلس اعظم ۷۴۲ء میں قوم فرانک کے بادشاہ کے گھر پیدا ہوا۔ ۷۶۸ء میں تخت نشین ہوا۔ ۸۰۰ء میں شہنشاہ اہل روما ہوا۔ اور ۸۱۲ء میں ۴۴ سال کی کامیاب اور شاندار حکومت کے بعد مرگیا۔ یہ بادشاہ اپنی فتوحات اور شجاعت کے لئے زبان زد آفاق ہے۔ اور یورپ کے قرون وسطےٰ کے اکثر افسانے اسی کے متعلق ہیں۔ اسی نے اپنی قوم کو تمام اقوام جرمن میں سب سے زیادہ طاقتور بنادیا۔ اور گویا یہی تمام مخالفین یونان اور حملہ آوران اسلام کے مقابلے میں پاپاؤں کی سپر بنا رہا۔ اس نے صرف عام فتوحات ہی پر اکتفا نہیں کی۔ بلکہ اپنے تمام مقبوضات کا انتظام بھی نہایت عمدہ طور پر کیا۔ یہ بادشاہ ہارون رشید کا ہمعصر تھا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان دونوں میں باہم مراسلت بھی ہوئی تھی۔

۵۵ ہارون رشید (۷۶۳ و ۸۰۸) خاندان عباسیہ کا پانچواں اور سب سے زیادہ مشہور خلیفہ۔ جو اپنی شان و شوکت کے لحاظ سے تمام شاہان اسلام اور اپنے معاصرین سلاطین عالم میں بے نظیر تھا۔ اور جس کے نام کو تاریخی شہرت کے علاوہ الف لیلہ کے افسانوں نے بھی زبان زد خلائق بنادیا ہے۔

۵۶ مامون الرشید خاندان عباسیہ کا ساتواں خلیفہ جو ہارون رشید کا دوسرا بیٹا تھا۔ اور اپنے بڑے بھائی امین الرشید کے بعد تخت نشین ہوا۔ یہ بادشاہ نہایت ہی علم دوست۔ اور فاضل بادشاہ گزرا ہے۔ اور اس کے زمانے میں اسلامی سلطنت اپنی انتہائے وسعت پر پہنچکر اسکے مرتے ہی روبہ زوال ہوگئی۔ اور خاندان عباسیہ ضعیف ہونے لگا۔

۵۷ (Elizabeth) ملکہ انگلستان۔ جس کے زمانے میں انگریزی بحری طاقت کا عروج ہوا۔ اور سلطنت برطانیہ یورپ کی بڑی سلطنتوں میں شمار ہونے لگی۔ اس کے زمانے میں انگریزی علوم و فنون میں بھی بہت ترقی ہوئی اور مذہبی اصلاحیں بھی بہت ہوئیں۔ یہ ہندوستان کے بادشاہ اکبر کی ہم عصر تھی۔

Marfat.com

کسی ایسے موروثی خیال سے اپنی جگہ ہزارہا سال کے واسطے کھڑی کی کھڑی رہ جاتی ہیں۔ اور وہ خیال ان کے دل و دماغ میں اسی طرح جم جاتا ہے۔ جیسے ان کے خیموں کی میخیں۔ یا ان کے مکانوں کی بنیادیں زمین میں گڑ جاتی ہیں ۔

یہ واقعات اور بیانات ابتدائی قوموں کی پراگندگی کی سست روی کو اچھی طرح نمایاں کر دیتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کس قدر آہستگی سے ایک وادی سے دوسری وادی تک۔ ایک دریا سے دوسرے دریا تک۔ ایک جنگل سے دوسرے جنگل تک۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک۔ اور ایک بحر اعظم سے دوسرے بحر اعظم تک پھیلے ہونگے۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پراگندگی اور اس افتراق کی ابتدا سے انتہا تک کتنا بے انتہا زمانہ اور کتنا بے قیاس وقت خرچ ہوا ہوگا۔ اور ان تمام باتوں سے ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ابتدائے ظہور انسان کے لئے کونسا زمانہ اور اس کی قدامت کے لئے کتنا عرصہ ٹھہرانا چاہیئے۔ اس مسئلے کا ہر ایک پہلو یہی نتیجہ نکالنے پر مجبور کرتا ہے ۔

شاید انسانی خصوصیات میں سب سے زیادہ عجیب نطق ہے۔ گفتگو انسان کے لئے خاص ہے۔ اور علم اللسان علم کی حیثیت سے علم تشریح انسان کا ایک جزو ہے۔ اور نطق کے مسئلے پر بحث کرتا ہے۔ یہاں ہم یہ نہیں چاہتے کہ تاریخ اللسان کی بحث چھیڑیں۔ یا زبانوں کے اختلاف اور ان کے باہمی تعلق اور ربط پر غور کریں۔ بلکہ صرف ان نتائج کی تائید چاہتے ہیں۔ جو ہم نے اور علوم سے اخذ کئے ہیں۔ دنیا میں آدمیوں کے قبیلے قبیلے کی زبان جدا ہے۔ جو قبیلے ایک ہی قوم کے اجزا ہیں اُن کی زبان بھی ایک ہی ہے۔ ہاں صرف لہجے اور محاورے کا فرق ہے۔ اسی فرق کی وضاحت اور ترقی سے انکی زبان اوروں سے الگ ہو جاتی ہے۔ لیکن اس وضاحت اور ترقی کی تکمیل کے لئے ایک نہایت لازمی چیز وقت ہے۔ محض ایک لفظ کے تلفظ کی تبدیلی بھی ایک عرصے کا کام ہے۔ اور اس سے بڑی تبدیلیوں کے لئے تو مدتیں چاہئیں۔ زبان اظہار خیالات کا ایک ذریعہ ہے۔ اور اس کے تغیر بھی انہی قوانین ترقی سے متاثر ہوتے ہیں۔ جو انسانی دل و دماغ پر کارگر ہیں۔ تغیرات لفظی ایسے لوگوں میں جلد ہوتے ہیں۔ جو عقلاً تیز ہوں۔ مگر قواعد

Marfat.com

کی زنجیروں کے پابند نہ ہوں - اس کے برخلاف وحشیوں میں - یا ان لوگوں میں جو پرانی لکیر کے فقیر اور دماغی ترقّی میں سُست ہوں - زبان صدہا سال تک اپنے اصلی رنگ پر قائم رہتی ہے - نوع انسان زبان کے لحاظ سے قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کی گئی ہے - اور بعض زبانوں کے اختلاف نہایت گہرے اور انمٹ ہیں - مثلاً سمیا طیقی نسل کی زبانیں آریا لوگوں کی زبانوں سے اصول میں ہی مختلف اور الگ ہیں - اور تورانی زبانیں ان دونوں سے نرالی اور جُدا ہیں - سمیا طیقی زبانوں کے مادّے ہی آریائی زبانوں میں نامعلوم اور غیر مفہوم ہیں - علماے علم الالسنہ کا قول ہے کہ ان دونوں نسلوں کی زبانوں میں دس سے زیادہ مشترک الفاظ نہیں ملتے - اور غالباً اس اشتراک کی وجہ بھی زبانوں کا باہمی تعلق اور ارتباط نہیں ہے - یہی اختلاف ان دونوں خاندانوں کے قواعد صرف و نحو میں پایا جاتا ہے - ہر ایک کے الفاظ کی ترتیب اور فقروں کی ساخت ہی جدا ہے - اور تفاوت اتنا ہے - گویا دونوں ایکدوسرے کے نقیض اور ضد ہیں - چنانچہ علماے السنہ یورپ جب تک اپنے خیالات کا ڈھانچا اور اپنی معلومات کا ڈھنگ نہ بدل دیں تب تک ان کے لئے عربی یا عبرانی زبانوں کے اصول کو سمجھنا اور اس میں لیاقت پیدا کرنا محال ہے لاطینی اور فرانسیسی زبانوں کا ماہر اگر بفرض ہسپانی زبان سیکھنے لگے تو اس کو ان زبانوں میں اتنی مشابہت اور مشارکت معلوم ہوگی - جیسے کوئی سیّاح ایک ہی شہر میں ذرا اور راستے سے جائے - لیکن عربی یا عبرانی کا تو ملک ہی جدا ہے +

یہاں اس ذکر سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ ناظرین پر یہ بات خوب واضح ہو جائے کہ ان انسانی زبانوں کے بنیادی اور اصولی تغیرات میں کتنا وقت لگا ہوگا - اس کا جواب صرف قیاس پر ہی منحصر ہے - یہ سوال بھی بالکل ایسا ہی ہے - جیسے انسانی قوموں کی پراگندگی کا مسئلہ - اس میں شک نہیں کہ زبانوں میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہے - اگرچہ ابھی تک علم الالسنہ کے علما اتحاد الالسنہ کے مسئلے پر مختلف الآرا ہیں +

Marfat.com

سریانی اور جرمنی کو ہم اصل ثابت کرنا کچھ بھی نہ ہو تو اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا کسی جرمن کو آسٹریلیا کے وحشی کا ہم نسل ثابت کرنا۔ فی الحقیقت ہم صرف اتنا کہنے کے مجاز ہیں کہ ایسا ہونا ممکن ہے۔ کیونکہ علم الاقوام اور علم الالسنہ کی اب تک کی تحقیقات انسان کے متحد الاصل ہونے پر ہی زیادہ زور دیتی ہے +

تاریخی زمانے سے پہلے ہی یہ تمام زبانیں مکمل ہو چکی تھیں۔ اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کا اختلاف آج کل کے اختلاف سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ زبانوں کی گردانیں اور ان کے صیغے پوری طرح قائم ہو گئے تھے۔ سنسکرت اور یونانی اپنے اپنے میلان کی انتہا تک پہنچ گئی تھیں۔ بحیرۂ روم کے کنارے پر سمیاطیقی زبانیں اپنے ثلاثی مادوں میں پابند ہو چکی تھیں۔ غرض یہ سب زبانیں اب سے ۵۔۶ ہزار سال پہلے بھی ایسی ہی مکمل اور مستقل تھیں۔ جیسے آج۔ اور ان کے باہمی اختلاف اور افتراق اس سے مدتوں پہلے واقع ہو چکے تھے +

کچھ شک نہیں یہ مدت بہت بڑی ہو گی۔ واقعات ہم کو یہ کہنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کہ وہ زمانہ جس میں مثلاً عبرانی اور یونانی زبانیں الگ ہوئیں۔ اس تنگ وقت اور مختصر مدت سے کئی گنا زیادہ تھا۔ جو گزشتہ دنوں میں قدامت انسان کے لئے نہ صرف خیال کیا جاتا تھا۔ بلکہ یقینی اور صحیح سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر اس سے بھی آگے چل کر ہم کو السنۂ مشرقی کا اتحاد دیکھنا ہے۔ اس میں بڑے بڑے ناپیدا کنار صحرا اور اونچے اونچے دشوار گزار پہاڑ ہمارے سدِّ راہ ہیں۔ ان سب کو طے کرنے کے بعد پھر مغلیہ زبانوں کو مغربی ایشیا اور یورپ کی زبانوں سے ملانا ہے۔ غرض یہاں بھی وہی صورت ہے۔ جو تمام انسانی قوموں کی یگانگی کے وقت پیش آئی تھی۔ اور اس کے لئے بھی اتنا ہی وقت چاہیئے جتنا اُس کے واسطے ضروری تھا +

Marfat.com

باب ششم

نوع انسان کی عمر کی بابت تاریخ و قصص کی رائے

اس طرح مختلف علوم و فنون کی پیچ در پیچ تحقیقات پر نظر ڈالتے ہوئے ہم تاریخ (تذکروں) اور قصص کی حد تک پہنچتے ہیں۔ اگر ان میں سے پہلی مکمل یا دوسرے معتبر ہوتے تو ہم زیادہ اطمینان سے ان مسئلوں پر بحث کر سکتے تھے۔ مگر ہم مجبور ہیں کہ انہی نامکمل تاریخ اور جھوٹے سچے قصے کہانیوں کی دشوار گزار گھاٹیوں میں سے ہوتے ہوئے راستی کی منزل مقصود کا سراغ لگائیں اور حتے المقدور ابتدائے ظہور انسان کا ٹھیک وقت اور زمانہ معلوم کریں۔ تاریخ صحیح تو اس معاملے میں بالکل ساکت ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا۔ واقع میں اگر مورخ اور علموں سے مدد لئے بغیر تاریخی زمانے سے پہلے کے حالات لکھنا چاہے۔ تو وہ خود اپنے منہ جھوٹا ہوتا ہے۔ اور خود لفظی تناقض اس کی حماقت اور بطالت تمام دنیا کے سامنے کھول دیتا ہے۔ تاریخ اس عقل و فہم کا نتیجہ ہے۔ جو انسان ابتدائی حالت کو چھوڑنے کے بعد ترقی کے ایک خاص درجے پر پہنچکر حاصل کرتا ہے۔ پس ایسے علم سے اس دور کے ابتدائی زمانے کا کیا حال معلوم ہو سکتا ہے۔ جو گویا نوع انسان کا بچپن تھا۔ اور بے خبری کے پردے میں چھپا ہوا تھا۔ اور جس کے ختم ہو جانے کے مدتوں بعد تاریخ کا آغاز ہوا۔

پہلے باب میں ہم نے تاریخ کی جامع اور مانع تعریف کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ نویسی میں ہمیشہ دو مختلف اور علیحدہ علیحدہ پہلو رہے ہیں۔ ایک پرانی طرز ہے۔ ایک نئی۔ پرانی طرز کی تاریخ حالات کا ایک لفظی مرقع

Marfat.com

ہوتی تھی۔ نئی طرز کی تاریخ واقعات کی ایک سادہ تفصیل ہوتی ہے۔ پرانی تاریخ میں صرف انسان اور اُن کے کارناموں کی داستان ہوتی تھی۔ نئی تاریخ انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو پر غور کرتی ہے۔ اور افعال انسانی کو دیکھ کر واقعات۔ ان کے اسباب۔ ان کے نتائج۔ اور تہذیب و تمدن کے اُن معرکتہ الآرا انقلابات پر بحث کرتی ہے۔ جن کا ذرا سا بیرونی اشارہ اُن واقعات سے ملا تھا۔ طرز قدیم کی تاریخوں میں یہ بات نہایت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کہ طرز بیان سنجیدہ۔ اور عبارت پسندیدہ ہو۔ اور انسانی افعال و اقوال حیرت خیز ہوں یا عبرت انگیز۔ ان میں واقعات کی صحت اور حالات کی صداقت کی نسبت تکمیل داستان کا زیادہ خیال ہوتا تھا۔ نئی طرز میں الفاظ اور فقرات خواہ کیسے ہی ہوں۔ اصلی کوشش یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جاے۔ وہ مطابق واقع اور سچ ہو۔ اور ان اسباب و نتائج پر جان توڑ کوشش کی جاے جن کے مجموعے سے وہ عالیشان اور اہم چیز بنتی ہے۔ جسے نوع انسان کہتے ہیں۔ یہ کہنا کیا ضرور ہے کہ یہ طرز حال ہی کی ایجاد ہے۔ اور اس طرز کی اہمیت اور اس کے نتائج کی واقعیت ضرور ہے کہ پرانی تمام تاریخوں کو ان کے درجے سے گرا کر صرف تاریخ نویسی کا سامان اور اسباب قرار دیدے۔

لیکن یہ تاریخ ہمارے موجودہ مسائل کا جواب دینے سے عاجز ہے۔ اس لئے ہم کو جو کچھ اسباب بھی ملیں۔ انہیں کو غنیمت سمجھنا چاہئے۔ اور پرانے زمانے کے تذکرے تو مفید ہونے ہی چاہئیں۔ کیونکہ وہ اس ابتدائی زمانے سے ہماری نسبت زیادہ قریب تھے۔ اس لئے آغاز تہذیب اور نوع انسانی کے ہوش سنبھالنے کی ابتدائی کیفیت سے زیادہ واقف و آگاہ ہونگے۔ کم از کم یہ تذکرے اتنا تو ضرور بتاتے ہیں کہ قدیم زمانے کے سب سے زیادہ عقلمند اور سمجھدار آدمی اس ابتدائی حالت کی بابت کیا جانتے تھے۔ کیا مانتے تھے۔ اور کیا سمجھتے تھے۔ وہ ہم کو بحیرۂ روم کے پاس کی ترقی یافتہ قوموں کے تمدن اور معاشرت کے بھی بہت سے پہلو دکھاتے ہیں۔ اگرچہ یہ امر اُن کے راویوں کے ذہن میں نہ تھا۔ بعض جگہ یہ کوشش بھی کی گئی ہے

کہ ابتدائے انسان کے متعلق پرانی کہانیوں کو تاریخی لباس میں دکھا کر اپنے ہمعصروں کے بہلانے کے لئے اس اہم مسئلے کا جواب مہیا کریں۔ مضمون نگاری کی یہ قسم جسے تاریخ کہا جاتا ہے۔ اہل یونان نے پانچویں صدی قبل مسیح میں ایجاد کی تھی۔ اس زمانے کے بڑے مصنف ہیروڈوٹس۔ تھیوسی ڈائڈیز۔ اور زینوفن ہیں۔ ان کے بعد اور بہت سے آئے۔ مگر سب اپنے قابل عزت بزرگوں سے گھٹے ہوئے۔ جب رومۃ الکبریٰ کا عروج ہوا۔ اور یونان صوبہ بن گیا۔ تو ٹائبر کا کنارہ علوم و فنون کا ملجا و ماوا ہو گیا۔ لیکن ان کی علمی ترقی اپنے یونانی استادوں کے کام سے لگا نہ کھا سکی۔ اور اگرچہ یونان دنیاوی طاقت کے لحاظ سے روما کا خادم بن گیا۔ مگر دماغی ترقی میں ان کا مخدوم ہی رہا۔ اس سرچشمے سے بعد میں وہ تمام نہریں نکلیں جنہوں نے تمام مغربی یورپ اور آگے چل کر نئی دنیا کو سرسبز اور شاداب کیا۔ ہاں اب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ایک حد تک ان قدیم نمونوں کو چھوڑ کر اس سے زیادہ محققانہ طرز تحریر کی بنیاد ڈالی گئی ہے ٭

ممکن ہے کہ چینی اور ہندی کتب قدیم کی تفتیش ہمارے لئے یونان سے زیادہ پرانی تاریخیں مہیا کر دے۔ ابھی اس طرف تحقیق کا میدان مشرقی زبانوں کے عالموں اور محققوں کے سامنے کھلا پڑا ہے۔ لیکن کتب مقدس کی یہ کیفیت نہیں ہے۔ غالباً ان میں سے کوئی بھی تاریخ کے نکتۂ خیال سے نہیں لکھی گئی۔ اور ان میں جو کچھ تاریخی حال ہے بھی وہ اور باتوں میں ملا ہوا۔ اور قصوں کی صورت لئے ہوئے ہے۔ جو تذکرے اور واقعے آج ہم کو ہندی۔ شامی۔ مصر۔ اور بالخصوص عبرانی کتب قدیمہ میں ملتے ہیں۔ وہ سچ واقعات کے قلمبند کرنے اور صحیح حالات کی یادداشت کے لئے نہیں لکھے گئے تھے۔ بلکہ ان کا مدعا یہ تھا۔ کہ اس خاص قوم کے مذہبی اور تمدنی حالات کے اظہار اور قیام کے لئے ایک سانچہ ہوں ٭ بہرحال ہم ابتدائی حالات معلوم کرنے کے لئے ان کو ہی غنیمت سمجھتے ہیں ٭

Marfat.com

اس قسم کی سب سے زیادہ پرانی کتابیں جو آریا نسل کے پاس ہیں وہ برہمنوں کی پرانی مقدس کتابیں ہیں جن کو وید کہتے ہیں۔ یہ کتابیں بھی عبرانی انجیل کی طرح بہت سے حصوں میں منقسم ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً لکھے جاتے رہے۔ اور یوں کل کتاب کی تصنیف بہت بڑے عرصے میں مکمل ہوئی۔ ان میں سے سب سے زیادہ پرانا حصّہ غالباً اکیسویں اور انیسویں صدی قبل مسیح میں لکھا گیا تھا۔ اگرچہ اس کتاب کو منشا کے لحاظ سے ہرگز تاریخی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ مگر پھر بھی اس کے اندر بہت کچھ تاریخی مضامین پائے جاتے ہیں۔ جن کو دیکھکر یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ موجودہ کتابوں میں یہ کتاب سب سے زیادہ پرانی ہے۔ جس سے اب سے ۴ ہزار برس پہلے کے آریا لوگوں کے تمدنی حالات کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔

حمیاطیقی نسلوں میں اس سے بھی پہلے کی تحریریں پائی جاتی ہیں جب یورپ کے مورخوں کا ابوالآباء ہیروڈوٹس مصر میں گیا۔ تو وہاں کی علمی اور تاریخی قدامت نے اس پر وہی اثر کیا جو آج کل کا کوئی محقق یونان کی سب سے زیادہ قدیم دستی تحریر کو دیکھ کر محسوس کرے۔ فی الحقیقت ہمارے پاس سب سے پہلی تاریخی شہادتیں مصر قدیم کی تحریرات ہیں۔ خواہ وہ سنگین چٹانوں پر ہوں یا محلوں اور مقبروں کی دیواروں میں۔ یا کاغذ نما جھلیوں پر ہوں۔ یا درختوں کی چھالوں پر۔ ہاں اگر آیندہ تحقیق سے چین کی تحریرات میں کوئی چیز اور بھی زیادہ پرانی ہاتھ آجائے تو بات اور ہے۔

عبرانی کتب مقدسہ کی تحریر کا ٹھیک وقت ابھی تک معلوم نہیں ہوا۔ لیکن وہ اگر ہومر کی تصنیفوں سے مقدم نہ ہوں تو ہیروڈوٹس کی کتابوں سے تو یقینی پہلے کی ہیں۔ غالباً آٹھویں صدی قبل مسیح میں بنی اسرائیل کے نبیوں اور پیغمبروں نے اپنے زبانی مقولوں کو کتابت میں مرتب کرنا شروع کیا۔ مگر عبرانیوں اور سمیاطیقی قوموں میں فن تحریر اس زمانے سے بہت پہلے رائج ہو چکا تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح کے وسط میں حضرت یوشع کے عہد سلطنت میں ایک قانون کی کتاب دستیاب ہوئی تھی۔ جو غالباً

Marfat.com

قانونِ دوم اور کچھ اور پرانی تحریرات کے اجزا تھے۔ اور انہی کو یاد شاہ اور علمائے مذہب نے اصلاح قوم کیلئے استعمال کیا تھا۔ لیکن بنی اسرائیل کی اکثر کتابوں نے موجودہ صورت یہودیوں کے بابل میں قید ہونے کے بعد اختیار کی تھی۔ مذکورہ بالا تمام تاریخی۔ نیم تاریخی۔ شاعرانہ۔ اور پیغمبرانہ کتابوں کے پرے افسانہ و قصص کی سرحد واقع ہے یہ بات یقینی ہے کہ انسان نے سوچنا اور بولنا لکھنے سے بہت پہلے شروع کیا۔ ایک زمانہ تھا جبکہ اس وقت کے زیادہ شائستہ اور ذہین لوگوں کے تصور ہر قسم کے قصے گھڑنے میں مشاق تھے۔ ابتدائی آدمیوں کے عقیدے۔ امیدیں۔ آرزوئیں تمنائیں مقصد۔ مدعا۔ غایت۔ عرض۔ خواب اور خیال غرض سب کچھ مل کر اپنا زورِ زبانی داستانوں میں خرچ کرتے تھے۔ ایک نسل کی کہانیاں اور گیت دوسری نسل کو ورثے میں ملتے تھے۔ کبھی اسی صورت میں اور کبھی بہت کچھ مسخ ہو کر۔

تاریخ اور قصص کا فرق ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ اور اب پھر ناظرین کے ذہن نشین کرنے کے لئے دُہراتے ہیں۔ تاریخی مضامین کا مدار واقعات مذکورہ کی ہمعصر شہادتوں پر ہے۔ خواہ واقعات کتنے ہی پرانے کیوں نہ ہوں قصوں کا انحصار ان پر ہے جن کے راوی ان قصوں کے مشتملہ واقعات کے وقوع کے وقت اور جگہ سے دور ہوں۔ تاریخ صرف ان لوگوں کے کتابے اور کتابیں معتبر سمجھتی ہے۔ جنہوں نے اس واقعے کو آنکھوں سے دیکھا ہو۔ اور اس بات کو کانوں سے سنا ہو۔ قصے ان تمام واقعات کو بیان کرتے ہیں۔ جو مدتوں تک صرف زبانوں پر رہ کر لکھے گئے ہیں۔ اور جن کی صداقت صدیوں تک صرف قوتِ حافظہ اور طاقتِ نطق پر مبنی رہی ہے۔

صحت واقعات کے لحاظ سے تاریخ کی خوبی دو باتوں پر منحصر ہے۔ اوّل بہتر تو یہ ہے کہ محررِ وقائع چشم دید حالات کو ان کے اثنائے وقوع میں قلمبند کرے۔ جیسے جولیس سیزر کی تشریحات۔ جن میں نہ کسی قصے کا دخل

ہے نہ کسی پرانی دستاویز کا اثر۔ بلکہ جنگ فرانس میں جو کچھ مصنف روزمرہ دیکھتا اور معلوم کرتا تھا۔ وہی لکھ دیتا تھا۔ یا جیسے تُزک تیموری اور تُزک بابری وغیرہ۔ جن سے ہمارے ناظرین زیادہ آشنا ہیں۔ اس قسم کی تحریرات باقی تمام تاریخی کتابوں پر فضیلت اور سبقت رکھتی ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ گو خود مصنّف نے واقعات کو نہ دیکھا ہو۔ مگر اس کی تحریروں کا مدار صرف انہی کتابوں پر ہو جو وقوع واقعہ کے وقت لکھی گئی ہوں۔ اور جن کے لکھنے والوں نے اپنے چشم دید حالات لکھے ہوں ٭

اس تمہید کے بعد اب ہم اپنے اصلی سوالات کی طرف لوٹتے ہیں۔ اور دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ علم اس کی بابت کیا کچھ کہتے ہیں۔ تاریخ تو طبعاً خاموش ہی ہے۔ کسی آدمی نے انسان کو دنیا میں آتے ہوئے نہیں دیکھا ابتدائی آدمی نے خود اپنے حالات کسی کاغذ یا پتھر پر نقش نہیں کئے۔ کوئی یادگار بھی ایسی نہیں ملتی۔ جس سے ابتدائے ظہور انسان کا پتہ چلے۔ اس لئے کسی کی کوشش اس زمانے کی تاریخ لکھنے میں مفید اور بار آور نہیں ہو سکتی۔ اور قیاس صحیح کا بھی یہی مقتضا تھا۔ کوئی شخص اپنی پیدائش کا حال نہیں جانتا۔ کوئی بچہ اپنے دنیا میں آنے کے حالات آیندہ لوگوں کی اطلاع اور دلچسپی کے لئے قلمبند نہیں کرتا جاتا۔ یہ خیال۔ خیال محال ہے۔ بے خبر آدمی اپنی بے خبری کا حال کیا کہیگا۔ ؎

از بے خبری کس چہ خبر باز دہد

ابتدائی آدمی فن تحریر سے ناواقف۔ تاریخی شہرت سے ناآشنا۔ اپنی ضروریات زندگی کی گرد آوری میں سرگرداں۔ اپنی جان آفات ارضی سماوی سے بچانے میں پریشان۔ کیونکر اپنا حال لکھتا۔ اور کس طرح اپنی ابتدائی کیفیت ہم کو بتاتا ٭

اس لئے تاریخ صحیح سے تو چنداں فائدے کی امید نہ رکھنی چاہئے۔ کیونکہ اس کی دونوں صورتیں یہاں بیکار اور لاچار ہیں ۔ ہمارے حضرت آدمؑ کو ہماری دلچسپی کے لئے تاریخیں لکھنے اور مینارے کھڑے

Marfat.com

کرنے کے علاوہ اور ہی بہت کام تھے۔ اس لئے اس تلاش محال میں پڑیں ہی کیوں۔ کوئی آثار قدیمہ کا متلاشی ایسے قدیمی آثار کو تلاش ہی کیوں کرے جو اگر مل جائیں تو خود اس بات کا بہترین ثبوت ہوں کہ وہ قدیمی آثار نہیں ہیں۔ کوئی عالم محقق ایسی ابتدائی یادگار کے پانے کی امید کیوں کرے۔ جس کا وجود خود ہی اس بات کی سب سے اچھی دلیل ہو کہ وہ ابتدائی یادگار نہیں ہے ٭

لیکن گو ہر قسم کی تاریخی کتابیں براہ راست ہمارے سوال کے جواب دینے سے قاصر ہیں۔ مگر بالواسطہ ان سے ایک اہم نتیجہ نکلتا ہے کیونکہ اس قسم کی تحریروں کا اتنے دور دراز حصوں اور ایسی مختلف حالتوں میں رہنے والے لوگوں میں اتنا قدیم وجود خود ہی ایک نتیجہ خیز امر ہے۔ یہ مسلم ہے کہ اس قسم کی تحریرات چینیوں میں حضرت عیسےٰؑ سے ۱۵ سو برس پہلے۔ آریاؤں میں ۲ ہزار برس پہلے۔ اور وادی فرات کے رہنے والوں میں ۲۱ سو برس پہلے موجود تھیں۔ اور مصر کی یادگاریں اب تک کھڑی کہہ رہی ہیں کہ ہمارے بنانے والے حضرت عیسےٰ سے ڈھائی ہزار برس پہلے فن تحریر اور انشا پردازی میں یگانۂ آفاق اور استاد زمانہ تھے۔ بنی اسرائیل کے شاعروں اور نبیوں نے بھی ۸ سو برس پہلے اپنی باتوں کو شاعرانہ اور نیم تاریخانہ رنگ دیا تھا۔ اور یونانیوں میں ۵ سو برس پہلے ہیروڈوٹس نے فن تاریخ نویسی کی ابتدا کی۔ اور اس کے بعد تھیوسی ڈائڈیز نے اس کو مکمل کیا۔ جو حسن ادا اور طرز بیان کے لحاظ سے اب تک بھی بے نظیر ہے ٭

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ نہایت ہی دور دراز کے ملکوں میں قومیت کے لحاظ سے بالکل الگ الگ لوگوں میں اور زبان کی حیثیت سے سرتاپا مختلف زبانوں میں ڈھائی ہزار سے ساڑھے چار ہزار برس تک کی پرانی تاریخی تحریرات پائی جاتی ہیں۔ یہ امر خود ہی قدامت انسانی کی ایک زبردست دلیل ہے۔ فن تحریر انسانی ترقی کا ایک اعلےٰ درجہ ہے۔ اور پھر اس فن کی ایجاد کے بعد بھی قوائے دماغی کو ابتدائی انشا پردازی اور معمولی وقائع نگاری کے قابل بنانا بھی ایک عرصے کا کام ہے۔ فلسفیانہ تاریخ لکھنے کا تو کیا ذکر۔

اس کے بعد پھر ایک زمانہ چاہیئے۔ کہ یہ لیاقت اتنے مختلف آدمی ایسے دور دراز کے ملکوں میں حاصل کر سکیں۔ اگر یہ سچ ہے کہ چین میں یہ فن ہومر اور داؤد کے زمانے سے پہلے رائج تھا۔ اگر یہ سچ ہے کہ اس سے بھی پہلے وادی اٹک کے رشیوں نے تاریخ لکھنا اور شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اگر یہ سچ ہے (جیسا کہ فی الواقع ہے) کہ قوم یونان نے چھٹی صدی قبل مسیح میں اتنی دماغی ترقی کر لی تھی جس کا قابل تعریف نمونہ ہیروڈوٹس کی تاریخ ہے۔ اگر ان سب سے بڑھ کر یہ سچ ہے کہ صدیوں پہلے وادی نیل میں اہرام مصری کے بنانے والے اپنی مقدس تاریخ اور فلسفہ لکھنے میں مشغول تھے۔ تو اندازہ کر لینا چاہیئے کہ ایسی نمایاں اور عالیشان ترقی کے لئے کتنی مدتوں اور کتنے برسوں کی ضرورت ہوئی ہوگی +

اس کے آگے ہم قصّوں پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جس سوال کے جواب میں صحیح تاریخ ساکت ہے۔ اس کے لئے قصّوں نے بیسیوں جواب تیار کر رکھے ہیں۔ ہر قوم اور ہر قبیلے نے ابتدائے انسان کی بابت ایک ایک قصّہ بنا رکھا ہے۔ جو نسلاً بعد نسلٍ مسلّم ہوتا چلا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں یہ قصے قومی مذہب کا ایک جزو بن گئے اور بعد میں تمام مسائل حکمت و فلسفہ پر ان کا اثر پڑا۔ ابتدائی شاعرانہ خیال تاریخی لباس پہن کر صحیح تاریخ ہونے کا مدعی ہو گیا۔ اور ایسا جما کہ اس کا نکالنا دشوار ہوا۔ ابتدائی آدمیوں کا جواب عقلمند آدمیوں کے گرد ایک تاریک حلقہ ہو گیا۔ اور نوع کے بچپن کی بھولی بسری کہانیاں اور مٹی مٹی نشانیاں جوانی کی عقل و تمیز کے لئے ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بن گئیں +

ان قصّوں کی صورتیں مختلف ہیں۔ لیکن عموماً ایک دو باتیں لازمی ہوتی ہیں۔ ان میں سے ایک اکثر خود اس قوم کی قدامت کا دعوےٰ ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قدامت مایۂ فخر و ناز تھی۔ چنانچہ مصری اپنے آپ کو چاند سے بھی پہلے کا کہتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ معمولی صدیں اور قرن بالکل ہیچ تھے۔ ہر قوم اس بات کی مدعی تھی کہ وہی اس ملک کے سب سے پرانے اور قدیم باشندے ہیں۔ پرانے سے

Marfat.com

پُرانے زمانے کے وحشی سے وحشی لوگ بھی یہ جانتے تھے کہ قدامت کا دعوا اگر ثابت ہو جائے تو استحقاق اور فضیلت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس خیال سے لوگ اپنے انتقال مکان کا ذکر بھلا کر اسے چھپانے لگے۔ اور قدیم رہائش پر زور دینے لگے ٭

اگرچہ ہم کو پورا یقین ہے کہ روے زمین انسانی افتراق اور پراگندگی سے آباد ہوئی ہے۔ مگر سب کی سب پُرانی قومیں اس سے انکاری ہیں۔ اور یہی کہتی ہیں کہ ہم ہمیشہ سے اپنے ہی مُلک میں رہتے آئے ہیں۔ اور یہیں کے رہنے والے ہیں ٭

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پُرانے لوگوں میں ان ملکوں کے اصلی باشندے ہونے کا خیال کیونکر پھیل گیا۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر ایک قصے میں ابتداے آفرینش انسان کو زمین سے تعلق دیا ہے۔ پُرانے لوگوں کو یہ خیال بہت پسند تھا کہ وہ مٹی سے بنے ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ ان کی پیدا کرنے والی طاقت نے ان کی ساخت میں مٹی کو بھی لیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم اس لاجواب دلیل سے اس ملک میں اپنی قدامت اور اپنا قدرتی حق ثابت کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ یہ صاف ظاہر ہے کہ ایسا حق نقلِ مکان کرنے والی زیادہ جنگجو قوموں کے مقابلے میں خوب کام آتا ہوگا۔ اس کے علاوہ درخت بھی زمین سے اُگتے ہیں۔ اور شاید ابتدائی آدمیوں کی قواے ظاہری اور باطنی پر سب سے زیادہ گہرا اثر نباتات کی نشوونما نے کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ طبعاً ان کو یہ خیال آیا ہو۔ کہ ہم بھی ان پودوں کی طرح ہی پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن بہرحال قصّے ہمیشہ اور اور صورتیں ہی لیتے رہے۔ پُرانے آدمیوں میں دو قسم کے خیالات تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ پیدا کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ترقّی پاکر پیدا ہو گئے ہیں۔ یہ دونوں خیال غلط ملط ہو گئے۔ انسان بنا تو مٹّی سے ہے۔ مگر بنانے والا ایک قادر ذوالجلال ہے۔ یونانیوں میں ایک روایت یہ تھی کہ آدمی پرومتھیوس کے ہاتھ کا بنایا ہوا مٹی کا کھلونا تھا۔ اور اسی کی سزا میں حاسد دیوی دیوتاؤں نے اسے کوہ قاف کی چوٹی پر زنجیروں میں جکڑ کر قید کر دیا۔ مگر زیادہ مشہور یہ عقیدہ تھا

Marfat.com

کہ دودیوتا ڈیوسیلین اور اس کی بیوی پرّہ ایک سیلاب سے جان بچا کر کوہ انھرس پر پہنچے۔ وہاں زیوس نے حکم دیا کہ اپنی ماں کی ہڈیاں نیچے پھینکدیں۔ ان ہڈیوں سے پتھر مراد ہیں۔ چنانچہ ان دونوں نے ان کو پھینکدیا۔ اور معاً زن و مرد پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی روایت یوں ہے۔ کہ خالق کردگار پرجاپتی بہت سے امتحانی تجربوں کے بعد ایک ایسی نسل پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ جو اپنے آس پاس کے اسباب کے مطابق تھی اور اس لئے زندہ رہ سکی۔ لیکن ہندوستان میں خلقت انسان کا مسئلہ بہت کچھ اول بدل ہوا ہے۔ چنانچہ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ بجائے مٹی سے بننے کے انسان ادنےٰ جانوروں سے ترقی پاکر پیدا ہوا ہے۔ یونان والوں نے اور ان سے پہلے لیبیا اور مصر والوں نے ایک خاص دلدل کو انسانی خلقت کی ابتدائی جگہ ٹھہرایا تھا۔

یہاں ہم تمام قصّوں کو دُہرانا نہیں چاہتے۔ بلکہ ان کی ضروری اور نمایاں خصوصیات کو بیان کرکے ان سے قدامت انسان کے متعلق کچھ نتائج اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مذکورہ خیالات انسانی قوائے دماغی کے بچپن کے ہیں۔ یہ افسانوں کا زمانہ فرد کی زندگی میں طفلی کی حالت کے مانند ہے۔ ہاں فرق یہ ہے کہ ایک جگہ نوع کی طفولیت ہے۔ دوسری جگہ فرد کی۔ مگر دونوں صورتیں ہیں وہی۔ جن میں حواس ظاہری اور قوت تصور عقل اور سوچنے کی طاقت پر غالب اور ور ہوتے ہیں۔ جس زمانے میں یہ افسانے بنائے گئے۔ تب تک نوع کے دل میں کیوں کا سوال نہیں گدگدایا تھا۔ ان کو وجہ آفرینش کا خیال نہ آیا تھا۔ نہ انہوں نے ان مشکلوں اور دقتوں کا لحاظ کیا تھا۔ جو ان کے افسانوں کے ماننے میں عقل صحیح کو پیش آتی ہیں۔ مثلاً یونانیوں سے یہ پوچھنا بالکل بجا ہے۔ کہ وہ مٹی کی صورتیں جن میں پرامتھیوس کے چھونے سے جان پڑ گئی اپنی اس پیدائش کی وضع سے کیونکر آگاہ ہوئیں۔ یا ڈیوسیلین کے سنگی آدمیوں کو کیونکر معلوم ہوا کہ وہ فلاں وقت پتھروں کے پھینکنے سے پیدا ہو گئے۔ لیکن یہ نہایت ہی معمولی

Marfat.com

اور معقول سوال تاریخی زمانے کے عقلمند سے عقلمند یونانی کے دل میں پیدا نہیں ہوئے۔ یہ تمام باتیں بالکل بچپن کی طبیعت سے مشابہ ہیں۔ بچہ کبھی کسی قصے کی نا ممکنات پر بحث نہیں کرتا۔ عقل کے اس درجے میں جس قدر خلافِ عقل کوئی بات ہو۔ اسی قدر زیادہ قابل اعتبار اور لائق اعتماد ہوتی ہے۔ بچپن کی یہ کہانیاں حافظے میں محفوظ ہو کر آئندہ زندگی کے تمام خیالات اور اعتقادات پر اثر ڈالتی ہیں۔ یہی حال ان ابتدائی قصّوں کا بھی ہے۔ جو گویا نوع کے بچپن کے زمانہ میں کہے گئے تھے۔ اور اس طرح جوانی تک میں اپنا رنگ دکھاتے رہے ✦

یہاں ان قصّوں کا اشارہ صرف اتنا ہے کہ انسانی ابتدا کو بہت بڑی مدت ہوئی۔ اس سے زیادہ کے لئے تمام ایسے قصّے محض بیکار اور لایعنی ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ قصے جغرافی اور تاریخی کیفیتوں سے بالکل پہلو بچا جاتے ہیں۔ ان کو وقت اور جگہ کی صحیح تحقیق سے بحث نہیں ہوتی۔ کیونکہ ان کے لئے تحقیق۔ پر محنت مطالعہ سیاحت۔ معلومات ریاضی اور اور بہت سی باتوں کی ضرورت ہے۔ جن کا وجود نوع انسانی کے بچپن میں محال تھا۔ دل جو کچھ خواب و خیال اور تصوّر و تخیل سے وضع کر سکتا تھا۔ وہ پیدا ہو گیا۔ لیکن صحیح تاریخ کے لئے بہت محنت اور جفاکشی کی حاجت ہے۔ جو نوع کی اس حالت میں ممکن نہ تھی ✦

غرض ہمارا اہم نتیجہ ہم کو خود ان قصوں کے نفس مطلب اور ان کے بچّوں کی سی باتوں سے نکالنا چاہیئے۔ یہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ تاریخ جو انسانی دل و دماغ کے عالم شباب کا نتیجہ ہے۔ اب سے کم و بیش ۴ ہزار برس پہلے ترقی پا چکی تھی۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ نوع انسانی کا بچپن جس میں اس کو قصے اور کہانیاں بنا کر دل خوش کرنے کی حاجت تھی۔ اس سے بہت بہت پہلے ہو گا۔ اور اس "بہت بہت پہلے" کی تعین کے لئے اکور علم ہماری مدد کے لئے تیار ہیں ✦

Marfat.com

باب ہفتم

نوع انسان کی عمر کی بابت علم السّنین کی رائے

اب سب کے بعد ہم کو علم السنین کے دلچسپ نتائج دیکھنے ہیں۔ ہم کہہ ہی چکے ہیں کہ یہ علم تاریخ کا ایک جزو ہے۔ ہر واقعے کا ایک وقت ہونا چاہیئے۔ کاروبار انسانی میں اگر وقت کے لحاظ سے تقدم و تاخر کی ترتیب نہ رہے تو ان کی کیفیت کا بیان محال ہو جاے۔ انسانی سوانح میں یہ رکن اتنا ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک علیحدہ علم پیدا ہو گیا۔ جس کا کام وقت کی پیمائش اور تحقیق ہے۔ اس کو انگریزی میں کرونالوجی کہتے ہیں۔ اور ہم نے اس کا نام علم السنین رکھا ہے۔ اس کی ضرورت علماے قدیم نے بھی محسوس کر لی تھی۔ اگرچہ یہ اچھی طرح معلوم نہیں کہ مسائل ہیئت سے سالوں اور صدیوں کا شمار کرنے کی پہلی پہلی کوششیں کب ہوئیں۔ غالباً ہر قوم نے ہوش سنبھالتے ہی وقت کی پیمائش کے لئے تقویمیں بنانے کا خیال کیا ہوگا۔ زمین کی گردش اور اجرام فلکی کے مقام جن پر آج تک سال و ماہ کا قیام ہے۔ ابتدائی لوگوں کے لئے بھی شمار ایام کا ذریعہ بنے ہونگے۔ شمار ایام کی ان امتحانی کوششوں میں عموماً ملک یا قوم کا کوئی مہتم بالشان واقعہ سنوں کی ابتدا کرتا تھا۔ مثلاً انتظام حکومت کا آغاز۔ کسی بڑے شہر کی بنا۔ کسی عالی ہمت بادشاہ کی تخت نشینی۔ کسی پر ہیبت بلا سے نجات۔ کسی عظیم الشان لڑائی میں فتح۔ غرض اس قسم کی کوئی بڑی بات ایک ابتدا ہوتی تھی۔ جس سے اور واقعات کا شمار کیا جاے۔ قدما میں یہ بات طبعی تھی کہ وہ ہر ایک واقعے کے وقت کو کسی گزشتہ معرکتہ الارا واقعے کے

Marfat.com

بُعد سے گنتے تھے +

اس طرح علم السنین کے مختلف سن پیدا ہو گئے۔ تقریباً سب قوموں نے اپنے اپنے سن الگ الگ بنا رکھے تھے۔ خصوصاً وہ قومیں جو آٹھویں صدی قبل مسیح میں برسر عروج تھیں ایجاد سنین کی بڑی خواہشمند اور دل دادہ معلوم ہوتی ہیں۔ قدیمی عبرانیوں کے بزرگوں کے پاس ان کی پُرانی تاریخ میں کوئی سن نہ تھا۔ جس سے وہ اپنے قومی انقلابات کا شمار کرتے۔ اگرچہ مثلاً حضرت ابراہیمؑ کا اپنے ملک سے نکلنا۔ یا حضرت موسےٰؑ کا بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے چلنا شمار ایام کی ابتدا کے لئے بہت عمدہ قومی واقعے تھے +

اہل بابل نے ۷۴۷ء قبل مسیح میں اپنے پرشکوہ بادشاہ بنونسر کی سال تخت نشینی سے اپنی قومی سن کی ابتدا کی۔ جو اُن کی جنوبی سلطنت میں مدتوں تک رائج رہا۔ اس سے کچھ دن پہلے یعنی ۷۷۶ء قبل مسیح میں یونانیوں نے اپنا اولمپی سن جاری کیا تھا۔ جس کی ابتدا کو وہ اولمپس کے تماشوں میں کوریبس کی نمایاں کامیابی تھی۔ ہر اولمپیڈ میں چار سال ہوتے تھے۔ یروکے قول کے مطابق رومنہ الکبرے کی بنا ۷۵۳ء قبل مسیح میں ڈالی گئی۔ اور اہل رومانے اسی سال سے اپنے سن کو شروع کیا۔ اس طرح ان ۲۹ برس کے اندر اندر کے تین عظیم الشان واقعات سے تین قوموں نے اپنے اپنے سن مقرر کر لئے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہ سن جاری بہت دنوں بعد ہوئے۔ یہ تینوں سن برابر رائج رہے۔ یہاں تک کہ آخر کار مسیحیوں نے سلطنت روما میں اتنا زور پکڑ لیا کہ انہوں نے بنائے روما کی جگہ ولادت مسیح کے سال سے اپنا نیا سن شروع کیا +

ہندوستان میں ولادت مسیح سے ۵۷ برس پہلے یہاں کے مشہور مہاراجہ بکرماجیت کا سمت شروع ہوا جو اب تک ہندو اس ملک کے اکثر حصّوں میں استعمال کرتے ہیں +

۷۸ء میں راجہ سالباہن کا سن شروع ہوا۔ یہ بھی دکن میں کہیں کہیں

Marfat.com

رائج ہے۔ بہرحال عیسائیوں کے غلبے کے ساتھ سن عیسوی کو بھی ترقی ہوئی۔ اور اس وقت تمام دنیا میں سب سے زیادہ رواج اسی سن کا ہے۔ سن مسیح کی ابتدا میں عیسائیوں کو یہ تکلیف تھی کہ پرانے بزرگوں کے تہوار ان کو کافروں کے دنوں اور سالوں کے مطابق منانے ہوتے تھے۔ اس سے بچنے کے لئے انہوں نے بھی یہودیوں کی طرح اپنے سن کو ابتدائے آفرینش سے شمار کرنے کا ارادہ کیا۔ اس وقت بنی اسرائیل اتنے عقلمند اور ذی علم ہو گئے تھے کہ کم ازکم برائے نام اپنے سن کی ابتدا ظہور آدم سے کرتے تھے۔ مسیحیوں نے بھی ان کی تقلید چاہی۔ مگر یہ آسان نہ تھی۔ کیونکہ اس وقت توریت کے تین مختلف نسخے تھے۔ جو یکساں صحیح مانے جاتے تھے۔ ایک کلدانی زبان میں۔ ایک عبرانی میں۔ اور ایک یونانی میں۔ لیکن تعین وقت کے لحاظ سے یہ تینوں بالکل مختلف تھے۔ اور کوئی چوتھا نسخہ موجود نہ تھا کہ اس سے ملا کر ان تینوں کی تصحیح کی جاتی +

بہرحال ابتدائی عیسائیوں نے کسی نہ کسی طرح ابتدائے آفرینش کا ایک سن مقرر کر لیا۔ جو قرون وسطی بلکہ زمانہ حال تک مستعمل رہا۔ اور اب بھی بہت سے مدعیان علم و خرد کی کوشش ہے کہ اسی سن سے تمام واقعات کو شمار کریں۔ یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ وہ لوگ جو ایسے سن کے متلاشی تھے۔ ان کے نزدیک آفرینش عالم اور خلقت آدم ایک ہی وقت میں واقع ہوئی۔ یہ بات ان کا دین و ایمان تھی۔ اور اسی پر ان کے تمام تقسیم اوقات کا دار و مدار۔ لیکن چونکہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس لئے توریت کے تینوں نسخوں کا اختلاف اعداد ایک دائمی سرمایہ فساد رہا۔ ڈیبو گنو لرنے لکھا ہے کہ جو لوگ توریت اور انجیل سے ابتدائے آفرینش کا وقت قرار دیتے تھے انہوں نے دوسو سے زیادہ نتائج نکالے تھے۔ اور اگر کوئی محقق آج بھی چاہے کہ ان سے زیادہ اطمینان بخش اور صحیح نتیجہ نکالے تو یہ بات ممکن نہ ہوگی +

بہرحال ان نتائج میں ابتدائے آفرینش کے لئے قریب سے قریب

Marfat.com

وقت ۳۴۸۳ قبل مسیح ہے۔ اور دُور سے دُور ۶۹۸۴ قبل مسیح۔ اس طرح پندرھویں سولھویں اور سترھویں صدیوں کے عالموں کی تعین اوقات میں ساڑھے تین ہزار برس تک کا فرق تھا۔ اگرچہ وہ سب سن ایک ہی استعمال کرتے تھے۔ جو انجیل سے ماخوذ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے بیہودہ اور نامعقول شمار سنین سے آج کل کیا کام چل سکتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح سترھویں صدی کے وسط میں اسقف اعظم جیمس اشر نے انہی اعداد سے ایک متفق علیہ سن مقدس نکالنے کا عزم کیا۔ اور نہایت ہی عجیب بات یہ ہے کہ اس کا نتیجہ مغربی قوموں کے اعلےٰ دادنے سب لوگوں میں سو برس سے بھی زیادہ تک بالکل مسلّم اور مستند مانا گیا۔ حال ہی میں علمی تحقیقات اشری سن کو غلط ثابت کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ مگر اب تک بھی یورپ اور امریکہ کے عوام الناس پر اس کا بے انتہا اثر ہے۔ کیونکہ یہ انجیل مقدس کی تعین اوقات سے ماخوذ ہونے کا مدعی ہے۔ خدا جانے کیونکر اور کس طرح وہ تاریخیں جو اشر نے تیار کی تھیں نئے اور پرانے عہدنامے کے تمام مستند نسخوں کے حاشیوں پر لکھ دی گئیں۔ اور جب ایک دفعہ ان کو وہاں جگہ مل گئی تو پھر اس زمانے کے سیدھے سادے کم علم آدمیوں کے لئے ان کا نکالنا آسان نہ تھا۔ اس طرح اس سن کا رواج عالمگیر ہو گیا۔ تمام اٹھارویں اور نصف انیسویں صدی کے تمام مورخ ابتدائے عالم کے واقعات کو اسی سن سے شمار کرتے رہے انجیل کے تمام نسخوں کے حاشیے پر اب تک بھی وہی تاریخیں بدستور لکھی جاتی ہیں۔ اور عوام یہی جانتے ہیں۔ کہ یہ تاریخیں بھی اسی کی لکھی ہوئی ہیں جس نے خود کتاب انجیل لکھی ہے +

غرض اس طرح موجودہ زمانہ میں ابتدائے عالم اور ظہور آدم کی تاریخ معین ہوئی۔ آدمی یہ لکھا ہوا دیکھکر اپنی آنکھیں ملنے لگتا ہے کہ کائنات ۲۳۔ اکتوبر ۴۰۰۴ء قبل مسیح اتوار کے دن پیدا کی گئی۔ آدمؑ اور حوّا اس کے ۵ دن بعد ۲۸۔ اکتوبر ۴۰۰۴ء قبل مسیح جمعے کے دن پیدا کئے گئے۔ ایسی یقینی اور ٹھیک ٹھیک تاریخ اور وقت پڑھکر اپنے حواس پر شبہ ہوتا ہے۔ کچھ ہنسی آتی ہے اور کچھ حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ ہمارا مضمون بہت سنجیدہ اور متین

ہے۔ مگر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کہ شاید اسقف اعظم اشر ابو البشر کا ہیولیٰ اور خالق کائنات کا صلاح کار تھا۔ خیر۔ باقی تمام تاریخیں بھی ایسے ہی یقین اور دلیری سے معین کی گئی ہیں۔ لیکن اصل یہ ہے کہ ہمارا تعجب بیجا ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اشر کا زمانہ ترقی کا وہ ابتدائی زمانہ تھا۔ جب لوتھر[1] کو مرے کل ۶۰-۷۰ برس ہوئے تھے۔ لوئیس[2] چہاردہم کی جوانی تھی۔ اور امریکہ کی نو آبادیوں کا بچپن۔ ایسے زمانے میں اس سے زیادہ صحیح اور محققانہ باتیں دریافت کرنا مشکل ہی نہ تھا۔ بلکہ ناممکن تھا۔ لیکن جو کچھ بھی ہو اس کا اثر یورپ اور امریکہ کی تحریرات پر اور پھر ان کے ذریعے سے عوام کے دل و دماغ پر اتنا ہوا کہ وہ جزو ایمان بن کر تعصب مذہبی کی پناہ میں آ گیا۔ اور ترقی علوم و فنون جدیدہ کے لئے نہایت ہی مضر اور حارج ثابت ہوا۔ خصوصاً تاریخی واقعات کی تفتیش مدتوں تک محض اس خیال سے رکی رہی کہ وہ انجیل کے مقدس سن کے مخالف نہ ہو جائے۔ لیکن اس مقدس سن کی اصلیت ہم بیان کر ہی چکے ہیں۔ کہ یہ خیالی سن سترھویں صدی کے ایک پادری کی ایجاد تھا۔ جس نے کسی نامعلوم طریقے سے زبردستی اس کو مقدس کتابوں میں گھسا دیا۔ اور توریت کی تحریف کرکے اپنے سن کو اس میں ملا دیا۔ اور بعد میں ملک کی عام جہالت اور نادانی نے اس کو صحیح مان کر علم و تحقیق کا بدل سمجھ لیا۔ لیکن انیسویں صدی کے

[1] لوتھر (Luther) (۱۴۸۳-۱۵۴۶) باشندہ جرمنی و عیسائی مذہب کا ایک بہت بڑا مشہور و معروف مصلح۔ اور عظیم الشان فرقہ پراٹسٹنٹ کا بانی۔ جس نے اپنی عالی ہمتی سے رومن کیتھلک فرقے کا نشہ توڑ دیا۔ اور روما کے پاپاؤں کو نیچا دکھایا +

[2] لوئیس چہاردہم یا لوئیس اعظم (Louis XIV) لوئیس سیزدہم اور این شہزادی آسٹریا کا بیٹا۔ ۱۴ ستمبر ۱۶۳۸ء کو پیدا ہوا۔ ۵ برس کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ ستمبر ۱۶۵۱ء کو بالغ العمر قرار دیا گیا۔ اور ۷ جون ۱۶۵۴ء کو رسم تاج پوشی ادا کی گئی۔ ۱۶۶۱ء میں اپنے وزیر اعظم کارڈنل مزارن کی موت کے بعد اس نے عنان حکومت بالکل اپنے ہاتھ میں لیکر سلطنت شروع کی۔ اور بڑے زور شور سے سلطنت کی۔ آخر یکم ستمبر ۱۷۱۵ء کو انتقال کیا۔ فرانس کا سب سے زبردست اور اپنے زمانے میں یورپ کا سب سے طاقتور بادشاہ تھا۔

کے اخیر میں اس کی قلعی کھل گئی - اور اس کو تمام علوم و فنون کی کتابوں میں سے دیس نکالا ملا +

ان کے علاوہ اور بھی بہت سے سن پیدا ہوئے - کچھ دن جیے اور پھر مر گئے - جن کی تفصیل باعث تطویل ہے - اور براہ راست ہمارے موجودہ سوالوں سے ان کو کچھ علاقہ نہیں ہے +

تحقیقات جدید نے سب سے زیادہ تغیر و تبدل اس آفرینش عالم کے سال میں پیدا کئے ہیں - علم طبقات الارض اور آثار قدیمہ کی ابتدا ہوتے ہی زمانہ قدیم کے شمار ایام میں غلطیاں معلوم ہونے لگیں - دونوں میں سے صرف ایک کا گرنا لازمی تھا - یا تو علما اور محققین خود اپنے حواس اور قوے کی شہادتوں کو باطل سمجھیں - یا پرانے زمانے کی تاریخ کی تعین سنین کو غلط اور جھوٹا تسلیم کریں - اسی اثنا میں علم الالسنہ بھی اپنی شہادت تیار کر لایا - نینوا اور بابل کے کھنڈ ہزارہا سال کی خاموشی اور فراموشی کے پردے سے نکلے اور اشر بینی پال[1] کے کتب خانے میں کی مٹی کی تختیوں نے ہماری دلچسپی اور تعلیم کے لئے اپنی پرانی کہانی سنانی شروع کی - علما نے ان تیر نما حرفوں کو پڑھا اور ان کا ترجمہ کیا - مصر کی قدیم تصویروں نے بولنا شروع کیا - اور اس کے کہنہ میناروں

---

[1] (Assur-bani-Pal) سلطنت بابل اور نینوا کا سب سے بڑا بادشاہ جو ۶۶۷ قبل مسیح میں تخت نشین ہوا - اس کے زمانے میں وہ سلطنت اپنے منتہائے عروج پر تھی - اور اس کی متواتر فتوحات نے دنیا کے زر و مال کا دروازہ اس پر کھول دیا تھا اور یہی اس سلطنت کے زوال کا باعث ہوا - اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اپنے عظم و شان کے لحاظ سے بے مثل تھیں - نینوا کا کتب خانہ اس وقت تک کے کتب خانوں میں سب سے بڑا تھا - اور اس میں تمام دنیا کے علمی ذخیرے جمع کئے گئے تھے - اور قدیم زبانوں کی کتب لغت اور قواعد تیار کی جاتی تھیں - مگر ان تمام محاسن کے باوجود بھی اس کا نام ظلم و ستم اور عیاشی و شہوت پرستی کی وجہ سے داغدار ہے - آخر ۶۲۵ قبل مسیح میں اس کا انتقال ہوا - اور اس کے دم کے ساتھ ہی اہل بابل نے اپنے آپ کو آزاد کر لیا - جس سے نینوا اتنا ضعیف ہو گیا کہ اسکے چند ہی سال بعد اہل بابل کے ہاتھوں اسکا خاتمہ ہو گیا

[2] (Arrow headed or Cuneiform letters) ابتداءً یہ کلدانیوں کی ایجاد تھے - بابل میں مٹی کی تختیوں پر ان کی کتابت کی جاتی تھی - نویں صدی قبل مسیح میں چند قبائل آرمینیا نے اپنے بعض حروف انہی سے مستعار لئے - اس کے بعد علاقہ میڈیا کے تورانی باشندوں نے بھی یہی کیا - دارا کے زمانے میں خود ایرانیوں نے اپنے چالیس تیر نما حروف تہجی اسی ماخذ سے لئے - قیاس کیا جاتا ہے کہ اس طرز تحریر کا وقت ایجاد تین ہزار سال قبل مسیح کے قریب ہے +

Marfat.com

نے اپنے خزانے کھولے۔ آدمیوں کی نظر صاف ہوئی۔ بصیرت بڑھی۔ اور گزشتہ زمانے کی عظمت کے سامنے موجودہ تعین اوقات کی نمایاں تنگی اور غلطی واضح ہوتی چلی۔ تحقیقات سے ثابت ہوا کہ ہندی اور چینی تاریخیں حضرت مسیح سے بائیس سو برس پہلے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ سرجان گارڈنر ولکنسن نے ثابت کیا کہ مصریوں کا چوتھا خاندان چھبیسویں صدی قبل مسیح میں شروع ہوا۔ ایک اور محقق نے وہاں کے پہلے خاندان کی ابتدا کا سال ۲۸۹۲ قبل مسیح ٹھہرایا۔ فرانس کے نہایت مشہور اور فاضل مصری محقق میریئیٹ[۱] نے مینیتھو[۲] کی تاریخ اور مصر کے کتبوں سے ثابت کیا کہ مینیز[۳] کا زمانہ ۵۰۰۴ قبل مسیح تک پھیلا ہوا ہے۔ بروسس کے قول کے مطابق کلدانیوں کا زمانہ مصریوں سے بھی زیادہ قدیم ہے۔ اور محقق رولنسن نے قدیم بابل کے پہلے خاندان سلاطین کے لئے ۲۲۸۶ قبل مسیح قرار دیا ہے۔ غرض ہر طرف نہایت ہوشیار اور محتاط محققوں نے انسانی ترقی کے دائرے کو اتنا پھیلا ہوا ثابت کیا ہے کہ خواہ مخواہ تقویم پارینہ بیکار کہنا پڑتا ہے۔

اس تمام تحقیقات کا نتیجہ یہ ہے کہ زمانہ قدیم کی بہت سی قومیں جو ایک دوسرے سے بالکل الگ الگ اور دور دور رہتی تھیں اب سے ۴ ہزار سے لے کر ۷ ہزار برس سے پہلے معاشرت و تمدن۔ قانون و قواعد فلسفہ اور تاریخ اور

---

[۱] (M. Mariette) (۱۸۲۱ء-۱۸۸۱ء) ایک فرنچ فاضل اور محقق آثار قدیمۂ مصر۔ اس نے نہایت مشقت اور جانفشانی سے مصر کے عجائب خانے بلاق میں آثار قدیمہ کے ایسے عجائبات جمع کئے جو دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اسکی علمی کوششوں نے اسے تمام دنیا میں مقبول خلائق بنا دیا۔ اور اس کو پاشا کا خطاب ملنے کے علاوہ تمام دول یورپ نے اپنے نہایت معزز خطابوں سے سرفراز کیا۔ آخر کثرت کار نے اس کو بیکار کر دیا۔ اور ۱۸۸۱ء میں قاہرہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اور وہ اپنے بنائے ہوئے عجائب خانے کے سامنے ایک قدیم مصری تابوت میں دفن ہوا۔

[۲] (Manetho) مصر قدیم کا ایک پجاری جس نے بطلیموس ثانی سنہ ۔ مصر کے زمانے میں قدیم مصری افسانوں اور داستانوں سے ایک تاریخ جمع کی جو اکثر اغلاط اور مبالغوں سے مبرا ہے۔ اور جس کی تصدیق جا بجا مصری کتبوں نے کی ہے۔ یہ تاریخ نہایت قدیم ہے۔ اور اکثر مصری معلومات کا ماخذ ہے۔

[۳] (Menes) موجودہ تحقیقات کے لحاظ سے مصر کا پہلا تاریخی پادشاہ جس نے شہر میمفس آباد کیا۔

Marfat.com

اور علوم و فنون کے تمام اصول قائم کرکے اپنی ترقی کے جھنڈے گاڑ چکی تھیں اس کے ساتھ ہی ہم کو ان شہادتوں کا بھی ذکر کر دینا چاہیئے۔ جو امریکہ کے قدیم باشندوں کی یادگاروں میں سے ملی ہیں۔ وسط امریکہ کے کھنڈر۔ اور کوہ انڈیز کی چوٹیوں پر سنگین محل اور معبد ہر ایک غور کرنے والے آدمی کے دل میں انسانی قدامت کو اور بھی زیادہ جانشین اور مستحکم کر دیتے ہیں +

خلاصہ مناسب ہے کہ ناظرین کو تمام شہادتیں از سر نو یاد دلانے کے لئے ہم بالاختصار مذکورۂ بالا بحث کو دُہرائیں۔ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ علم ہیئت کے لحاظ سے زمین کی انتہائے سردی اب سے کم و بیش ۵۰ ہزار سال پہلے کم ہونے لگی تھی۔ اور اسی وقت سے برفانی دریاؤں میں طغیانی شروع ہوئی تھی۔ ان تمام باتوں سے انسانی ابتدا کا وقت اب سے کم و بیش ۳۵ ہزار سال پہلے معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ علم طبقات الارض کی شہادت تھی۔ اگرچہ براہ راست ابھی تک اس سے انسانی ابتدا کا زمانہ بالکل اتنا ہی قدیم ثابت نہیں ہوتا جتنا کہ علم ہیئت کے لحاظ سے ہم نے کہا ہے۔ مگر اس سے کچھ بہت کم بھی نہیں ہے۔ اور ہر قسم کی غلطیوں اور ہر قسم کے ذاتی تعصبوں کے حق چھوڑنے کے لئے دس ہزار سال کم کر دینا نہایت کافی ہوگا۔ اس سے ابتدائے انسان کا زمانہ کم و بیش ۲۵ ہزار برس پہلے ثابت ہوتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس تخفیف سے علم ہیئت کی غلطی معلوم نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف یہ ہے کہ طبقات الارض کی تحقیقات انسان کی ابتدا کو اتنی قدیم ثابت نہیں کر سکی۔ بلکہ صرف اس کی حد ادنےٰ دکھا سکی ہے۔ اس علم کی تحقیقات پر اس جواب کی اصل بنا ہے باقی تمام علوم و فنون صرف اس کی تائید یا تاکید کرنے والے ہیں اور بس۔ چنانچہ گو آثار قدیمہ کی تحقیقات تعین اوقات کے لئے طبقات الارض پر منحصر ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ دونوں کے نتائج بالکل متفق ہیں۔ اور اس سے بھی انسانی قدامت کسی طرح ۲۵ ہزار سال سے کم معلوم نہیں ہوتی۔ یہی حال نباتات قدیمہ اور تشریح الانسان

کا بھی ہے ۔

علم الاقوام اور تہذیب الاقوام سے ان نتائج کی تصدیق ہوتی ہے۔ اور تاریخ وقصص وغیرہ بالواسطہ ان کے مؤید ہیں ۔

گزشتہ صفحات میں ہم نے انسان کی ابتدائی حالت کی بابت وہ تمام قیاسات بیان کر دیئے ہیں۔ جو نوع انسان کی موجودہ علمی حالت سے نکلنے ممکن ہیں۔ اگرچہ ابھی بہت سی باتیں مشکوک ہیں۔ بہت سی شہادتیں نامکمل ہیں۔ قیاس اور تخمینے میں بہت سی غلطیوں کا امکان ہے۔ یہ سب کچھ ہے۔ مگر پھر بھی تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد ہم اتنا ضرور پورے اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ انسان سطح زمین پر اب سے ۲۰ ہزار برس پہلے ضرور ضرور موجود تھا۔ ہاں ناظرین کو اتنا اور بتا دینا چاہیئے کہ یہاں ابتدائی انسان سے ہماری مراد وہ جاندار ہیں۔ جو کچھ کچھ عقل و تمیز رکھتے تھے۔ سیدھے کھڑے ہو کر چلتے پھرتے تھے۔ تہذیب اور شائستگی کی نہانی قابلیت رکھتے تھے۔ مگر اور سب باتوں میں اعلےٰ درجے کے جانوروں سے بالکل مشابہ تھے بجز اس کے کہ اپنے ادنےٰ آلات کو گھڑ بھی سکتے تھے۔ اور آگ بھی جلا سکتے تھے ۔

باب ہشتم

جنت کی تلاش

ظہور انسان کے وقت کی تفتیش کے بعد ہم کو یہ دیکھنا ہے۔ کہ یہ ظہور ہوا کس جگہ۔ کیونکہ ہماری زمین کی تاریخ میں ایک وقت تھا۔ جبکہ یہاں ہماری نوع کا وجود نہ تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ کسی نہ کسی طرح یہاں ہمارے بزرگ پیدا ہوئے۔ اور ان سے نوع بڑھی۔ اور پھلی پھولی۔ اس لئے ضرور

Marfat.com

ہے کہ ان کے ابتدائے ظہور کے لئے کوئی جگہ بھی ہو جہاں سے پھیل کر نوع انسان نے تمام روئے زمین کو آباد کیا۔ تحقیق۔ قیاس اور محض من گھڑت فسانوں نے اس سوال کو حل کرنا چاہا ہے۔ مگر ہم موجودہ ترقی کے بعد بھی اس کا درست جواب دینے کا دعوےٰ نہیں کر سکتے یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ سوال ایک اَور سوال کے ساتھ وابستہ ہے۔ جس پر ہم اس کے بعد غور کرینگے۔ وہ سوال نوع انسان کی اصل کا اتحاد یا اختلاف ہے۔ پہلی صورت میں ہم کو صرف ایک ہی جگہ ابتدائی آدمیوں کے لئے ڈھونڈھنی چاہئے۔ اور اگر دوسری صورت کو درست مان لیں تو پھر بہت سے مقام تلاش کرنے چاہئیں۔ جو بڑی بڑی مختلف نسلوں کے لئے موزوں اور مناسب ہوں +

موجودہ زمانے کے علما میں ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔ جنھوں نے تمام امور پر غور کر کے آخر انسان کے مختلف الاصل ہونے کو تسلیم کر لیا ہے ان کے نزدیک نوع انسان مختلف جگہوں میں مختلف وقت پیدا ہوئی اور بڑھی۔ مثلاً افریقہ اور آسٹریلیا کے حبشیوں کا سرچشمہ الگ ہے۔ ایشیائی مغلوں اور تاتاریوں کا الگ۔ مجمع الجزائر والوں کا الگ۔ شمالی ایشیا کے خانہ بدوشوں کا الگ۔ آریاؤں کا الگ۔ امریکہ کے اصلی باشندوں کا الگ۔ ان مختلف مقامات سے آدمیوں کی الگ الگ نسلوں کی بیلیں پھوٹیں۔ اور تمام سطح زمین پر چھا گئیں +

یہاں ہم ان دونوں مخالف مسئلوں کے حسن و قبح پر بحث نہیں کرتے۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اختلاف اصل کی صورت میں ہمارے اس موجودہ سوال کی دلچسپی بالکل کم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ نوع انسان ایک سے زیادہ جگہوں سے بڑھی ہے۔ تو پھر اس کی ابتدائی جا ہائے رہائش دس ہوں یا سو (آب چو از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست) حقیقت میں پھر ہم کو یہ مان لینا ہوتا ہے کہ مختلف انقلابات کے بعد ساری سطح زمین انسانی رہائش کے قابل ہو گئی۔ اور مختلف جگہوں میں مختلف نسلوں کے آدمی پیدا ہو گئے۔ ہم یہاں صرف اتحاد اصل کے اصول کو مان کر ابتدائے ظہور انسان کی جگہ

تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ اصول واقعات کے زیادہ مطابق ہے اس اصول کے مانتے ہی ہمارے موجودہ سوال کی اہمیت اور دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے +

اس بارے میں اقوام مغرب کا عقیدہ عبرانی کتب مقدس سے لیا گیا ہے۔ جو پہلے بنی اسرائیل کے اصول مذہبی کی بنا تھیں۔ اور بعد میں تمام مسیحیان عالم کے دین وایمان کا ماخذ بنیں۔ ان کتابوں میں خلقت آدم کی جو طرز اور جو جگہ لکھی ہوئی ہے۔ وہ ان عظیم مذہبی اصولوں کا جزو ہے۔ جنہوں نے اقوام مغرب کی تہذیب پر اتنا گہرا اثر ڈالا ہے۔ یہاں اس ذکر کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ اس ابتدائے آفرینش آدم کا منظر "عدن کے ایک مشرقی باغ" میں دکھایا گیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ "عدن میں سے ایک دریا بہتا ہے جو اس باغ کو سیراب کرتا ہے۔ اور پھر چار ٹکڑوں میں پھٹ جاتا ہے۔ پہلے ٹکڑے کا نام پائسن ہے۔ جو تمام سرزمین ہیویلیہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور جہاں عمدہ سونا نکلتا ہے۔ وہاں لعل اور زمرد بھی ہیں۔ دوسرے دریا کا نام گائی ہن ہے۔ وہ تمام ملک حبش میں پھیلا ہوا ہے۔ تیسرے دریا کا نام ہیڈیکل ہے۔ اور یہ شام کے مشرق میں بہتا ہے۔ چوتھا فرات ہے" یہ گویا توریت کے انسانی ابتدا کے منظر کی حد بندی ہے +

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ عدن ہے کہاں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس جگہ کو موجودہ جغرافیے کے لحاظ سے کسی نقشے پر دکھا سکیں۔ گزشتہ زمانے کے بہت سے علما نے اس کی بحث کوشش کی ہے۔ پہلی قابل لحاظ بات تو یہ ہے کہ حال کے جغرافیے میں ان چاروں دریاؤں میں سے صرف ایک یعنی فرات پایا جاتا ہے۔ باقیوں کے یا تو نام بدل گئے ہیں۔ یا وہ معدوم ہو گئے۔ یا وہ تھے ہی محض افسانہ۔ دریائے فرات کے تمام کنارے کو منبع سے دہانے تک چھان ڈالا ہے۔ یہ دریا آرمینیا کی پہاڑیوں میں سے نکلتا ہے۔ لیکن وہاں نہ دریائے پائسن کا پتہ ملتا ہے۔ نہ ملک ہیویلیہ کا سراغ چلتا ہے۔ دوسرے دریا گائی ہن کا بھی کچھ ٹھکانہ نہیں ہے۔ اور اگر ملک حبش سے وہی ملک مراد ہے جو اب اس نام سے مشہور ہے تو کوئی دریا آرمینیا سے نکل کر اس کے گرد جا ہی کیونکر

Marfat.com

سکتا ہے۔ تیسرے دریا ہیڈیکل کا بھی کچھ نشان نہیں ملتا۔ ہاں اگر اسے سمجھ لیں تو خیر۔ مگر وہ شام کے مشرق میں نہیں ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اگر توریت کے فرات کو یہی دریائے فرات مان لیں تو باقی تینوں دریاؤں کا کچھ حال نہیں کھلتا۔ یہ البتہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید یہ تینوں دریا کسی انقلاب ارضی کی وجہ سے نابود ہو گئے ہیں +

اس ضمن میں ہم کو یہ بیان کر دینا چاہئے۔ کہ عدن کے متعلق جو قصہ توریت کے باب پیدائش میں مذکور ہے۔ وہی قصہ ایک نہ ایک صورت میں تمام سمیا یعنی قوموں میں زبان زد تھا۔ زمانہ قدیم کے شامی۔ کلدانی۔ عربی۔ اور اسماعیلی اور ان کی اولاد۔ اور خود عبرانی۔ غرض سب کے سب اس قصے کو جانتے اور مانتے آئے تھے۔ اگرچہ اس کے بعض بعض حصّوں میں اتنا ہی فرق پیدا ہو گیا تھا۔ جتنا حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں۔ اور اس قصے کی ابتدا اس دور دراز کے زمانے میں ہوئی تھی۔ جب عبرانی عبرانی نہ ہوئے تھے اور کلدانی کلدانی نہ بنے تھے +

اگر ہم اس مسئلے پر موجودہ جغرافیے کی روشنی میں بحث کریں تو سب سے زیادہ مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہم توریت والے دریائے فرات کو اس نام کے موجودہ دریا سے مختلف اور جدا خیال کریں۔ مگر اس کا فوری نتیجہ یہ ہے کہ ہم کو عدن کی تلاش میں کوہستان ارمن کو چھوڑ کر اور کہیں توریت کی مذکورہ جغرافی کیفیت کو ڈھونڈھنا ہوگا۔ اور پھر زمین و آسمان۔ اور قیاسات کا میدان سامنے کھلا پڑا ہے +

جنہوں نے اس مضمون پر پہلے کبھی غور نہیں کیا ان کو مقام عدن کے متعلق مختلف زمانوں کے فاضلوں کی عجیب و غریب اور بے معنی ولایعنی رائیں سن کر ضرور حیرت ہوگی۔ بعض بزرگواروں نے تو اس کو روئے زمین سے اُٹھا کر تیسرے یا چوتھے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ بعض اور فاضل اس کو چاند کے مدار یا طریق القمر میں خیال کرتے تھے۔ چند آدمیوں کا یہ قیاس تھا کہ عدن خود چاند ہی میں ہے۔ کچھ لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ اس کا وجود کرۂ باد

کے طبقۂ اعلیٰ میں ثابت کر دکھائیں۔ بعض محقق جن کے دماغ اس بلند پروازیٔ خیال سے خالی تھے۔ عدن کی اصلی جگہ اس زمین کے اندر بتلاتے تھے۔ کچھ لوگ اس کی جگہ قطب شمالی جانتے تھے کچھ لوگ اس کی تلاش میں خطِ استوا کی خاک چھانتے تھے۔ کبھی یہ جنت تاتار اور چین میں تجویز کی گئی۔ کبھی وادی گنگا اور لنکا میں سمجھی گئی۔ لیکن اکثر فاضل آرمن ہی میں سرگرداں رہے جنہوں نے لفظ فرات کی صحت استعمال میں کلام کیا۔ وہ عدن کی تلاش میں صحرائے افریقہ میں پہنچے۔ عراق عجم۔ شام۔ پارس۔ عرب۔ بابل عراق عرب اور فلسطین بھی اس اعزاز کے مستحق قرار دیئے گئے۔ حال میں بعض لوگ یورپ کی حمایت میں بھی اٹھے۔ اور تھوڑی بہت طبیعی تحقیقات لیکر اُٹھے۔ کیونکہ یہ بات مسلم ہے۔ کہ انسان کی سب سے زیادہ پُرانی یادگاریں اب تک وسطی اور غربی یورپ ہی میں پائی گئی ہیں +

اس اختلاف کو دیکھ کر حال کے مورخ کی ہمت نہیں پڑتی۔ اور قدم نہیں اٹھتا۔ سچ مچ اپنے آغاز کے ابتدائی مقام کو تلاش کرنے کے لئے تو دل چاہتا ہے۔ مگر اس جنت یا عدن کا سراغ لگانا جس کا ذکر کتاب پیدائش کے دوسرے باب میں تحریر ہے۔ کار دشوار اور خیال محال ہے۔ موجودہ جغرافیہ روے زمین کے کسی مقام کی طرف اشارہ نہیں کرتا۔ عدن کے متعلق اتنی مختلف باتیں بیان کی گئی ہیں کہ ان سب کو ایک جگہ دکھانا اس کے متلاشی کے لئے ممکن نہیں۔ ہاں جو کوئی پہلے ہی سے کسی مقام کو عدن تسلیم کئے ہوئے ہے۔ اس کو کسی ثبوت اور دلیل ہی کی حاجت نہیں۔ کیونکہ اس کا مدعا پہلے ہی اس کے دل میں ثبت اور اس کے ذہن میں ثابت ہو چکا ہے۔ مگر جو محقق خالی الذہن ہو کر سچے دل سے ایسے مقام کو ڈھونڈھنے نکلتا ہے۔ اس کو کرۂ زمین کے گرد پھر کر بھی اسی طرح ناکام اور بے نیل مرام واپس آنا پڑتا ہے +

اس مسئلے کی تفتیش کے لئے اثبات کی بجائے تردید زیادہ مناسب ہے یعنی ہر ایک جگہ جو مقام عدن نہیں ہو سکتی۔ اُسے نکال دینا چاہیئے چنانچہ

ہم یقینی دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں۔ کہ مذکورہ بالا جگہوں میں سے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ مثلاً کوہستان آرمینیا کی طرف اکثر نظر دوڑتی ہے۔ لیکن چونکہ اس کا کوئی دریا وسط افریقہ کے پاس سے نہیں گزر سکتا۔ اسلئے عدن کا پہلو ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح اور ایسے مقامات کو بھی تاویلوں اور توجیہوں سے ثابت کرنے کی بجائے رد کر دینا چاہیئے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی ایسا قیاس قائم ہو سکے جس کے ماننے میں کوئی ناقابل تردید مشکلات حائل نہ ہوں۔ اور ساتھ ہی وہ قیاس تمام علوم طبیعی کی موجودہ تحقیقات کے مطابق ہو۔ تو کم سے کم محض امتحانی طور پر ہی اس قیاس کو ظہور انسانی کی ابتدائی جگہ کے مسئلے کا جواب مان لینا چاہیئے۔

اب ہم ان مجوزہ مقامات پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ غالباً ان جگہوں پر تو بحث کرنا ہی عبث ہے۔ جو روئے زمین پر ہی نہیں ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ آدمی کسی دوسرے کُرے میں پیدا ہوا تھا۔ تو اس کا ہم کیا جواب دے سکتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے توہمات کی غلطی ثابت کرنا اپنے آپ کو احمق اور مسخرہ بنانا ہے۔ وہ نوع انسان کے بچپن کے خیالات تھے۔ بچے اب تک بھی جنت کو چاند میں جانتے ہیں۔ تقاضائے سن سے ان کو یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ حضرت آدمؑ کسی اور جگہ آسمان پر پیدا ہوئے تھے۔ پھر آسمان جھک کر زمین سے آ لگا۔ اور آخر ان کی نافرمانی اور سرکشی کی وجہ سے ان کو اس دنیا میں چھوڑ کر پھر واپس اپنی جگہ چلا گیا۔ یوں ہماری دنیا آباد ہو گئی۔ یہ سب کچھ بہت دلکش اور دلچسپ سہی۔ مگر اس کی وجہ سے جوانی کی پوری طاقتیں اپنے خیالات کے اظہار سے کیوں رکی رہیں۔ انسانی بہبودی اور خوشحالی کا دارومدار ان بچپن کی باتوں پر کیوں سمجھا جائے۔ دنیا و مافیہا کے کاروبار کا انحصار ان ابتدائی کہانیوں پر کیوں رکھا جائے۔ کیا نوع انسان کا آغاز اور انجام اور عالم کون و مکان کا انتظام بچوں کا کھیل ونڈا ہے۔ کہ محض بچپن کے دل خوش کن خیالات کے مٹ جانے سے مٹ جائے۔ کیا زمین و زماں کی خلقت اور ثوابت و سیارات کی حرکت صرف کہانی ہے۔ کہ لفظوں کے الٹ پلٹ ہو جانے سے الٹ پلٹ جائے۔ حقیقت میں ہم تصور نہیں کر سکتے

کہ کوئی ذیعقل فرد بشر اس کو تسلیم کرے کہ ہماری ابتدا کی جگہ اس معمولی مادی اور حقیقی سطح زمین پر نہ تھی۔ بلکہ کسی اور کرے میں واقع تھی +

اس کے بعد ہم کو تحقیقات علمی کی روشنی اور قیاس صحیح کی رہنمائی سے اس بھول بھلیاں میں اپنے پہلے گھر کا کھوج لگانا چاہیئے۔ قدیم دنیا کی جغرافی کیفیت پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہت سے مقامات میں ہماری ابتدا نہیں ہوسکتی تھی۔ شمالی اور مرتفع حصاے زمین نہ صرف آغاز کے لئے۔ بلکہ ہماری رہائش وقیام کے لئے بھی موزوں نہ تھے۔ کیونکہ جب نئی اور پرانی دنیا میں انسان نے دریاؤں کی تہ اور غاروں کی خاک میں اپنے آثار چھوڑنے شروع کئے۔ وہ وہی زمانہ تھا۔ جب ہماری دنیا نے سردی کی کمی کے بعد اپنے برفانی لحاف سے سر نکالنا شروع کیا تھا۔ اس لئے آج کل کے سرد مقامات کا اُس زمانے میں یخ پوش اور ناقابل رہائش ہونا بدیہی ہے۔ اور یہ قیاس بجا معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں کرۂ شمالی میں پچاس درجے عرض بلد سے اوپر کا کُل حصّہ برف میں چھپا ہوا تھا۔ اس لئے ہم کو عموماً جنوب میں یا شمال کے خاص خاص مناسب مقامات میں اپنے ابتدائی وطن کو ڈھونڈنا چاہیئے۔ اس طرح کے چند قواعد و قوانین سے اتنا فائدہ ضرور ہوتا ہے کہ ہماری تلاش کے لئے مقامات کا دائرہ تنگ ہوتا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی اتنا وسیع ہے۔ کہ دنیا کے تمام براعظموں کے بڑے بڑے آباد ٹکڑوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور اگر اس تلاش میں ہم کو طبقات الارض اور جغرافیے سے زیادہ مفید اور مناسب معاون اور مددگار نہ ملتے تو غالباً ہم بھی اپنے آبائی وطن سے ایسے ہی بے خبر رہتے۔ جیسے ہمارے بزرگ رہے تھے۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہے*

علم الاقوام۔ تہذیب الاقوام۔ علم الالسنہ۔ تاریخ اور قصص ہمارے لئے نہایت ہی مفید اور معتبر شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ قوموں کے ابتدائی تفرقے اور خاندانوں کے شروع شروع کی مہاجرت کے جغرافیے بعض اور علوم طبیعی کی مدد سے ہم کو اپنے جائے افتراق تک لے جاتے ہیں۔ اور تردیداً انہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ کس کس جگہ سے یہ نہریں نکلیں۔ اس طرح ان علموں کے دھندلکے میں آہستہ آہستہ تاریخ اور قصص سے پتہ پوچھتے۔ اور قیاس صحیح سے سراغ لگاتے

لگاتے ہم اس قطعہ زمین تک پہنچتے ہیں۔ جو ہمارے بزرگوں کا اصلی وطن تھا۔

باب نہم

اصلی وطن

مہاجرت اقوام کا ذکر یہاں قبل از وقت ہوگا۔ وہ کتاب کے ایک دوسرے جزو کے لئے خاص ہے۔ یہاں ضمناً یہ دیکھنا مقصود ہے کہ علم الاقوام ہمارا اصلی وطن کہاں بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر سمیا طیقی نسل ہی کو لیجئے فلسطین میں رہنے والے بنی اسرائیل وہاں کے اصلی باشندے نہ تھے۔ بلکہ مصر سے بھاگ کر آئے تھے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ مصر بھی ان کا اصلی ملک نہ تھا۔ کیونکہ وہ کنعان کے رہنے والے تھے۔ جہاں وہ وادی فرات کے نچلے حصّے سے آکر آباد ہوئے تھے۔ بنی اسرائیل کے قصوں اور تاریخوں میں اس نقل مکان کا پورا اور درست ذکر ہے۔ اور اس سے سمیا طیقی لوگوں کے آنے کی جگہ یا کم از کم اس جگہ کی سمت کا تو اشارہ ملتا ہے۔ ابتدائی زمانہ ان ابتدائی قوموں کے انتقال مکان کی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ یونانیوں کا ایشیا کی طرف سے آنا ایسا ہی یقینی ہے۔ جیسا وندال[۱] کا شمال کی طرف سے اترنا۔ طالب علم کو اس مضمون پر سرسری طور پر غور کرنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ابتدائی افتراق اقوام بھی اور تمام دنیائی کاروبار کی طرح قواعد اور آئین کا پابند تھا۔ جن سے مختلف ملکوں کو آباد

[۱] وندال یورپ کی ایک خانہ بدوش اور صحرا نشین قوم جو پہلے جرمنی کے شمال میں آکر آباد ہوئے۔ دوسری صدی مسیحی میں انہوں نے بوہیمیا میں سکونت اختیار کی۔ اور ایک صدی بعد انہوں نے سلطنت روما پر دست درازی شروع کی۔ انہوں نے چوتھی صدی کے وسط میں عیسائیت اختیار کر لی۔ پانچویں صدی کی ابتدا میں فرانس اور سپین لیا۔ سنہ ۴۳۰ء میں افریقہ کو فتح کیا۔ سنہ ۴۳۹ء میں کارتھیج لیا۔ اور ۴۵۵ء میں روما کو فتح کر کے اس کی تمام دولت منقولہ کارتھیج لے گئے۔ وندال آریا نسل کی ایک شاخ اور قوم ٹیوٹن کے لوگ تھے۔ اور اب یورپ کے اکثر حصے میں یہی آباد ہیں۔

Marfat.com

کرنے والوں کا اصلی ماخذ۔ ان کی ترقی کی سمت اور ان کی قومی خصوصیات کا پتہ لگتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ ان ابتدائی لوگوں کی مختلف پہلوؤں میں پراگندگی ایسی ہی بے ترتیب تھی۔ جیسے بادل کے ٹکڑے متلوّن مزاج ہواؤں کے جھونکوں سے اِدھر اُدھر دوڑتے نظر آتے ہیں۔ یہ قطعی بات ہے کہ نوع انسان کی ہر ایک حرکت ابتدا سے باقاعدہ رہی ہے +

ان ابتدائی قومی تفرقوں کی غایت و غرض بعض جگہ نمایاں ہے۔ اور بعض جگہ نامعلوم۔ لیکن انسان خواہ وحشی ہوں یا شائستہ ہمیشہ کسی منشا کو مدِ نظر رکھکر کام کرتے ہیں۔ محض فضول اور بیکار کچھ نہیں کرتے۔ مثلاً اہل ہنود کے بزرگوں کا دریائے اٹک کے منبع کی طرف سے اس کے ساتھ ساتھ دہانے کی طرف بڑھنا محض اتفاق پر محمول نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ وہ لوگ ایک غایت اور غرض ملحوظ رکھتے تھے اور اسی کے لئے وہ اس ملک میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ جہاں ان کے اخلاف آج تک موجود ہیں۔ سفید قوموں کا امریکہ میں بحر ظلمات کے کنارے سے بحر الکاہل کی طرف بڑھنا اتفاقیہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ وہ قانون قدرت کے مطابق تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان محض دست و پابستہ کلیں ہی نہیں۔ بلکہ وہ صاحبان فہم و تمیز ہیں۔ اور یہ عقل و تمیز ان عام اسباب و نتائج سے لی گئی ہے۔ جو دنیا و ما فیہا کو اپنے محیط سائے میں لئے ایک خاص منزل مقصود کی طرف جا رہے ہیں +

علم الاقوام کی تحقیق اور تاریخی قصوں کی مدد سے ہم کو اس عظیم الشان سلسلے کے سینکڑوں ڈورے ملتے ہیں۔ جس نے ابتدائی قوموں کو مغربی ایشیا۔ ساحلی افریقہ اور تمام یورپ میں پھیلا دیا۔ ان ڈوروں سے سراغ لینے اثبات اور تردید کے ذریعے سے ہم تمام ابتدائی قوموں کے نقطہ مقام تک پہنچنے کی امید رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس مسئلے پر غور کیجئے جس کے حامی یورپ کو نوع انسان کا اصلی وطن ٹھہراتے ہیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ تحقیقات آثار قدیمہ اس مسئلہ میں ایک حد تک ان کی رفیق ہے۔ یہ درست ہے کہ سب سے پرانے انسانی بقیے وادی سوم میں پائے گئے ہیں۔ مگر صرف یہ

دلیل اس اہم سوال کے جواب کے لئے محض ناکافی ہے کیونکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اب تک افریقہ اور ایشیا میں۔ یورپ میں دستیاب شدہ انسانی آثار سے پرانے بقیے نہیں ملے۔ مگر یہ یاد رہے کہ خود علم آثار قدیمہ یورپ میں پیدا ہوا ہے۔ اور یہیں بڑھا ہے۔ اس لئے غالباً ایشیا اور افریقہ کے قدیمی خزانے کس پرسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ یہ کہ ہر قسم کے معلومہ تاریخی اور دیگر واقعات اس مسئلے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ تاریخی زمانے کی ابتدا سے یورپ کی تمام قومیں اپنے آپ کو مشرقی الاصل خیال کرتی ہیں۔ ان کی ابتدائی حرکت بحیرۂ خزر اور جھیل بورال سے دریائے ڈینوب اور رہائن کی طرف تھی۔ یہ بھی قابل لحاظ بات ہے کہ تاریخی زمانے میں بھی قوموں کی آمد ہمیشہ مشرق سے مغرب کی طرف رہی ہے اور اس کے برعکس کبھی بھی نہیں ہوا کہ بحر ظلمات اور بحیرۂ روم کے کناروں والے پھر اپنے مخزن کی طرف چلے ہوں۔ اور یورپ والوں کی تمام طاقت اور تدبیر اس مشرقی دراندازی کے روکنے میں ناکام رہی۔ غرض آریا نسل کے تمام افسانے اور تاریخ قدیم کی تمام شہادتیں یہی ثابت کرتی ہیں۔ کہ یورپ اور مغرب کی تمام بڑی بڑی قوموں کا اصلی وطن ایشیا تھا۔ اس کے علاوہ مغربی ایشیا کی قوموں میں بجز ایک استثنا کے کوئی بھی ایسی دلیل نہیں۔ جس سے معلوم ہو کہ وہ قومیں بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی زمانے میں بھی یورپ سے آئی ہوں۔ بلکہ تاریخ اور افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایشیائے مغرب کی قومیں مثلاً ترکمان وغیرہ خود اہل یورپ کی طرح اور بھی دور دراز کے مشرقی حصے سے آئی ہیں۔ غرض اس قسم کی تمام بحث اور ان تمام علموں کی چھان بین سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ کہ یورپ اور ایشیا کے عربی حصے کے تمام باشندے تاریخی زمانے کی ابتدا سے ہزاروں برس پہلے دور مشرق سے آئے تھے۔ اس بارے میں علم الالسنہ کی شہادت بھی قابل غور ہے۔ گزشتہ صدی کے آخری حصے میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی تھی کہ یونانی اور سنسکرت ایک ہی شاخ کی دو ٹہنیاں ہیں۔ اور اس کا بدیہی نتیجہ یہ ہے کہ قدیم ہندی اور یونانی بھی ایک ہی خاندان کے دو بھائی

Marfat.com

ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ یا تو یونانی مشرق سے مغرب کی طرف گئے یا قدیم ہندو یورپ سے ایشیا میں آئے۔ مگر یہ موخرالذکر مسئلہ بالکل بے بنیاد اور کمزور خیال کیا جاتا ہے۔ اور علمائے علم الاقوام اس کو بالکل ناممکن جانتے ہیں۔ اس میں کچھ بھی شبہ نہیں کہ یورپ اور ہندوستان والوں کے بزرگ وسط ایشیا سے اٹھے اور مدتوں تک آوارہ و سرگرداں پھرنے کے بعد لڑ بھڑ کر ان دور دور کے ممالک پر قبضہ کر بیٹھے۔ جہاں تاریخی زمانے میں ان کی اولاد بڑی بڑی نامی قومیں بن کر حکمراں نظر آتی ہیں ٭

یہ بھی یقینی ہے کہ اس مغربی پھیلاؤ کے وقت یہ لوگ اپنے باپ دادا کی حاصل کردہ علم و زبان۔ آئین و قوانین رسم و رواج۔ عادات رزم و بزم اور عزم بالجزم اپنے ساتھ لائے تھے ٭

اسی طرح یہ بھی دکھایا جا سکتا ہے کہ ابتدائی لوگ وسط افریقہ سے بھی مغربی ایشیا میں نہیں آئے۔ کیونکہ اس مسئلے میں تاریخ۔ افسانے۔ علم اللسان۔ اور علم الاقوام متفقاً اس کے مخالف ہیں۔ ہاں خود افریقہ کے غربی حصے۔ شرقی ملکوں کے باشندوں نے آگے بڑھ کر آباد کئے ہیں۔ اور ایام قدیم میں وہ آباد اور بڑے بڑے شہر جو بحیرۂ روم کے جنوبی ساحل پر بستے تھے۔ انہی مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے آدمیوں کے آباد کردہ تھے۔ ان میں سب سے زیادہ پرانا مصر ہے۔ کارتھیج اس کے سامنے کا بچہ تھا۔ افریقہ کے سب سے زیادہ مغربی حصے میں کہیں کہیں اس انسانی سیلاب کی لہر کو پہاڑوں یا سمندروں کے قدرتی موانع نے پھر تھوڑی دور تک مشرق کی طرف لوٹا دیا ہے۔ اس کی مثالیں یورپ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ مگر اس علم کے تمام جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ محض استثنائیں ہیں اور خود قاعدہ کی کلیت پر دال ہیں۔ اگر مغربی ایشیا کی اقوام میں ہم کو کوئی ایسی سیاہ فام قوم ملے۔ جس کی طرز و وضع۔ مذہب اور زبان وسط افریقہ کے حبشیوں سے ملتی ہو تو یہ شبہ کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاید کسی زمانے میں افریقہ کے لوگ بحیرۂ قازم سے گزر کر خلیج فارس کی طرف بڑھے ہوں۔ مگر ایسی شہادت نایاب ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف ہر ایک تحقیق سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایشیا والے ہی ساحل افریقہ پر

Marfat.com

خط استوا تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ یہاں بھی نوع انسانی خلیج فارس سے بحیرۂ قلزم اور ملک حبش کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔ چنانچہ اب سے ۸ - ۱۰ ہزار برس پیشتر مصریوں کے بزرگ ادھر سے ادھر بڑھ کر وادی نیل میں جا کر آباد ہو گئے۔ اور مدتوں کی ترقیوں کے بعد ان مشہور خاندانوں کے بانی ہوئے۔ جو تاریخی زمانے سے کچھ پہلے کے دھندلکے میں ایسے نظر آتے ہیں۔ جیسے طلوع آفتاب سے پہلے دور کی اونچی اونچی چوٹیاں ٭

ان کو چھوڑ کر اگر قوم مغول کی طرف نظر کریں تو وہاں بھی یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ اس قوم کے اصلی آدمی اندرون ملک میں ساحل بحر سے دور آباد ہیں۔ سمندر کے کنارے اور جزیروں کے رہنے والے نو پیدا شدہ خاندان ہیں۔ جاپانی چینیوں سے زیادہ نو عمر ہیں۔ اور مجمع الجزائر کے باشندے قوم مغول سے بہت پیچھے کے ہیں۔ اس لئے یہ بات مان لینی پڑتی ہے کہ مشرقی ایشیا والوں کے پھیلنے کا سرچشمہ وسط ایشیا تھا۔ جہاں سے وہ بحر الکاہل کے کناروں کی طرف چلے۔ مگر ان کے پھیلاؤ کی طاقت نے ان کو ساحل بحر پر بھی رہنے نہ دیا بلکہ ان کی عظیم الشان لہر براعظم سے دور دور تک کے جزیروں تک پہنچی ٭

اگر سیاہان افریقہ کو علم الاقوام اور علم الالسنہ کے نکتہ خیال سے دیکھیں تو ان سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ لوگ صرف وسط اور جنوبی افریقہ۔ آسٹریلیا اور میلنشیا میں پائے جاتے ہیں۔ افریقہ میں تفرقۂ قومی کے لحاظ سے یہ لوگ مشرق سے وسط اور مغرب کی طرف جزائر کیپ ورڈ کی جانب میں پھیلے ہیں۔ ان حبشیوں کی تقسیم بھی اس مسئلے کی مخالف ہے۔ جس میں یورپ کو جلے آغاز قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ ان حبشیوں اور آسٹریلیا وغیرہ کے اصلی باشندوں اور اہالی یورپ کے کسی طبقے میں کوئی تعلق جسمانی یا دماغی نہیں پایا جاتا۔ اس بنا پر میں ایشیا کا بھی یہی حال ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے منتہائے جنوب کے باشندوں کے علاوہ۔ (یہ لوگ حبشیوں سے بہت ملتے جلتے ہیں) باقی تمام اقوام ایشیا سیاہان افریقہ سے ہر بات میں بالکل الگ ہیں۔ اس تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ حبشیوں کا سرچشمہ وسط افریقہ کے سوا اور کسی براعظم میں قرار نہیں پا سکتا

ہاں وسط افریقہ ہی ایک ایسی جگہ ہے۔ جہاں سے تمام مختلف ملکوں کے حبشی آسانی سے اپنی موجودہ جگہوں میں پھیل سکتے ہیں۔ اور جس سے ہمارے مسلمہ اصول اور تحقیقات کی مخالفت بھی نہیں ہوتی۔ اگرچہ اس میں بھی بعض سخت مشکلیں ہیں۔ کیونکہ ان لوگوں کو مشرقی افریقہ سے آسٹریلیا اور میلنیشیا تک جانے میں بحر ہند کے ہزارہا میل لمبے سمندر کو عبور کرنا پڑا ہوگا۔ اور یہ بات ان کی موجودہ ترقی کی حالت دیکھکر بالکل خلاف قیاس اور بعید از عقل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن خیر اگر ہم حبشی نسلوں کو بے انتہا قدیم ماں کران کی پراگندگی کے لئے مشرقی افریقہ کا کوئی ٹکڑا مان بھی لیں۔ تو مشرقی ایشیا کی قوم مغل اور مغربی ایشیا اور یورپ کی سرخ رنگ قوموں کو بھی ان حبشیوں سے ماخوذ کرنا بالکل ناممکن ہے۔ اور بجز اس کے کچھ چارہ نہیں رہتا کہ ہم نوع انسان کو مختلف الاصل مانیں۔ اور سرخ اور سیاہ نسلوں کو شروع ہی سے الگ الگ ماں باپ کی اولاد جانیں۔ کیونکہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی اولاد بتانا زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے ؛

اسی قسم کی دلائل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا نوع انسانی کا سرچشمہ ہونا محال ہے۔ ہم کو امریکہ کے سفید و سیاہ رنگ باشندوں کی تاریخ ورود اچھی طرح معلوم ہے۔ اگرچہ تمام براعظم امریکہ میں وہاں کے رہنے والوں کی قدامت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یورپ ایشیا اور افریقہ کے لوگ امریکہ سے نکل کر روے زمین پر پراگندہ ہوئے۔ بالکل ناممکن اور خلاف واقع ہے۔ امریکہ کے قدیم باشندوں کے تمام رسم ورواج۔ طرز و انداز۔ صورت و سیرت غرض ہر ایک خصوصیت نسل مغول سے ملتی ہے۔ اور قرین قیاس ہے کہ غالباً یہ لوگ یا تو ایشیا کے شمال مشرقی گوشے سے نکل کر شمالی امریکہ میں پہنچے ہونگے یا مجمع الجزائر میں سے جزیرہ جزیرہ ہوتے ہوئے جنوبی امریکہ میں آئے ہونگے۔ لیکن ان کو ماخذ مان کر ان کی اولاد کو سمندر کے بیچوں بیچ میں سے ان عظیم الشان اور آباد براعظموں میں پہنچانا تمام تحقیقات علوم موجودہ کے برخلاف اور ہر ایک

Marfat.com

قیاس صحیح کے برعکس ہے +

موجودہ بحث میں ہمارا سب سے بڑا سہارا ابتدائی اقوام کے آنے کی سمت معلوم کرنا ہے۔ لیکن عموماً محقق کو اس وجہ تحقیری میں تقسیم اقوام کے خطوط باہم مختلط اور گڈ مڈ نظر آتے ہیں۔ اور بعض جگہ بالکل ایک دوسرے کے مخالف اور نقیض بن جاتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ انسانی کاموں میں سے کوئی بھی پورا متناسب اور بالکل باترتیب نہیں ہوتا۔ آثار حیات اپنی خاص ترتیب اور اپنے الگ قاعدے کے پابند ہیں۔ مگر وہ ترتیب بے قیدی ہے۔ اور وہ قاعدہ گوناگونی۔ جاندار اور بالخصوص عقلمند اجسام کی حرکات و سکنات کے قواعد بے جان اور محض مادی اشیا کے حکمراں مرتب و یکساں قاعدوں سے بہت زیادہ پیچیدہ اور دشوار ہیں۔ لیکن اس بحث میں محقق کو ان بے قاعدگیوں اور بے ترتیبیوں سے بھی عمدہ مدد مل سکتی ہے +

اس سوال میں سب سے زیادہ نمایاں یہ بات ہے کہ نوع انسان عموماً مشرق سے مغرب کی طرف بڑھتی معلوم ہوتی ہے گویا تمام آدمی طبعاً آفتاب کی تقلید کرتے ہیں۔ سارا یورپ اور بحیرۂ روم کا کل ساحل اسی اصول کے مطابق آباد ہوا ہے۔ امریکہ پر نظر ڈالیں تو اصلی باشندوں کو چھوڑ کر وہاں بھی یہی قانون قدرت حاوی ہے۔ لیکن اس سے یہ بھی نہ سمجھنا چاہئے کہ تمام قومی حرکتیں اسی قاعدے کے موافق ہوتی ہیں۔ عالم نباتات میں دیکھیں تو اگرچہ عموماً بیلیں شاخوں سے بائیں سے دائیں طرف چڑھتی ہیں۔ مگر کچھ بیلیں اس کے برخلاف دائیں سے بائیں طرف بھی چڑھتی ہیں۔ اسی طرح علم الاقوام کا ماہر جب مذکورۂ بالا سراغوں پر غور کرتے کرتے یورپ اور مغربی ایشیا سے اصلی وطن کو ڈھونڈتا آتا ہے۔ تو وہ آخر کار ایک ایسی جگہ پہنچتا ہے۔ جہاں یہ آثار گویا زمین کے اندر دفن ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ اور نئے نشان زمین میں سے نکل کر مشرق کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ شمال سے جنوب تک جس جگہ اس معاملے پر غور کیا جائے آخر یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ یعنی وہ اس سے آگے آریا نسل کا کھوج نہیں لگا سکتا۔ پس طبعی اور ضروری بات ہے کہ اس سرزمین کا جہاں سے انسانی اقوام کے آثار قدم مشرق اور مغرب

Marfat.com

دونوں جانبوں میں بڑھے ہیں۔ نہایت غور و خوض سے امتحان کریں +
اگر کوئی شخص خلیج عمان کے شمالی کنارے پر کھڑا ہو کر نوازنہ مبلا کی سیدھ میں ایشیا پر نظر ڈالے تو گویا وہ سرزمین اس کے پیش نظر ہو گی۔ جسے گویا انسانی اقوام کا آبشار کہنا چاہیئے یعنی جہاں سے نوع انسان چاروں طرف پراگندہ ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ یقیناً یہ بات لفظاً صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس سرزمین میں بھی بہت سے ایسے ہی اینچ پیچ ہیں۔ جیسے دریاؤں اور ندیوں میں ہوتے ہیں۔ کہ وہ شروع شروع میں بہت سے ہیر پھیر کھاتی ہوئی بڑھتی ہیں یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے ان کا حجم و عظم بھی بڑھ جاتا ہے۔ اور پھر وہ ایک سمت خاص میں بہتی معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال ایشیا کا یہ حصہ جو گرینج سے ۵۰ اور ۶۰ درجہائے طول بلد کے درمیان میں واقع ہے۔ نہ صرف اہل یورپ کا بلکہ ایرانیوں اور ہندوؤں کا اور ان سے بھی زیادہ وسیع اور متفرق نسل مغول کا سرچشمہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ایشیا مجمع الجزائر اور امریکہ تک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ قطعہ زمین دریائے یورال اور بحیرہ خزر کے کنارے سے شمالاً جنوباً۔ نصف فارس۔ خلیج فارس اور بحیرۂ عرب تک حاوی ہے۔ جہاں تک علم الاقوام کی تحقیقات کی گئی ہے۔ یہی ثابت ہوتا ہے کہ تمام ابنائے نوع ابتدائے مہاجرت میں اسی قطعے سے مشرق یا مغرب کی طرف پراگندہ ہوئے ہیں۔ قوم مغول یہیں سے نکل کر بحیرۂ چین و جاپان اور بحیرۂ اوکھوٹسک کی طرف بڑھی۔ اور اہالی یورپ اسی جگہ سے مشرق کی طرف پھیلے۔ اسی طرح سمیا طیقی اور حمیا طیقی نسلیں اسی جگہ سے پراگندہ ہوئیں اس سے بھی آگے چلیں تو ہم کو پہلے ہی پہلے حبشیوں کی نسل افریقہ کے مشرقی ساحل اور ہندوستان کے جنوبی حصے میں ملتی ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے اور موخرالذکر مشرق کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ جس سے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ نسل بھی اس سرزمین سے چلی ہے۔ جہاں سے سرخ اور بھوری نسلیں نکلی تھیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر یہ کہنا کچھ غلط یا مبالغہ نہیں کہ گرینج سے ۵۰ اور ۶۵ درجہ طول بلد کے درمیانی حصہ بر و بحر میں سے تمام انسانی نسلوں نے خروج کیا ہے۔ مگر اس بحث میں ابھی تک یہ سوال تصفیہ طلب

ہے کہ اس قطعہ زمین کا کونسا حصہ ہمارا پہلا وطن تھا۔ اس پر بحث کرتے وقت اس کے شمالی حصے کو تو نکال ہی دینا چاہیئے۔ یہ بات بالکل صاف اور یقینی ہے کہ بحیرۂ خزر کے شمالی جانب کے حصے مع ان کے جو دریائے یورال اور وولگا سے سیراب ہوتے ہیں۔ اپنی شدید سردی کی وجہ سے مدتوں تک ویران پڑے رہے۔ اور ان کے رہنے والے نسبتاً زمانۂ جدید ہی میں بڑی تکلیفیں اور مشکلیں جھیلنے کے بعد اُن میں آباد ہوئے ہیں۔ اس بحث میں ہر ایک بات اسی پر دال ہے کہ کرغیز۔ قلموق۔ کاسک اور روسی مغل اس ملک کے پرانے رہنے والے نہیں ہیں۔ آگے چل کر ہم یہ بھی دیکھینگے کہ انسان اپنی ابتدائی اور وحشیانہ حالت میں بحیرۂ خزر اور بحیرۂ سفید کے درمیانی حصّوں کی سی سخت سردی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ ایسے ملک تب آباد ہوئے جب زمانے کی تادیب نے انسان کو حفاظت جسمانی کے طریقے سکھا کر محفوظ کر دیا تھا۔ اور پشتہا پشت تک آس پاس کے سرد ملکوں میں رہنے نے سردی سہنے کا خوگر بنا دیا تھا۔ اس لئے ہم اس قطعہ زمین میں سے ماورائے قاف اور بالائے خزر حصوں کو نکالے دیتے ہیں۔ یہ بات اس کی مؤید ہے کہ سیاہ اور بھوری نسلوں کا اس سرد حصۂ زمین سے پھیلنا ممکن ہے۔ کیونکہ حبشیوں۔ اسٹریلیا اور پاپوا والوں کا شمالی عرض بلد کے پچاسویں طبقے کے اوپر سے پھیلنا۔ ہر قسم کی معلومہ تحقیقات اور ہر طرح کے قیاس صحیح کے مخالف ہے۔ مزید براں یہ کہ مذکورۂ بالا قومیں ہر قسم کی قابلیت دماغی و اخلاقی میں اہالیٔ شمال سے اتنی پیچھے ہیں کہ یا تو ہم یہ خیال کریں کہ یہ قومیں قانون ترقی عالم کے برعکس شمال کے اعلےٰ طبقے کے جانداروں سے ادنےٰ درجے کے جانوروں کی حالت اختیار کر رہی ہیں۔ یا سرے سے ان کا شمال سے آنا ہی غلط سمجھیں۔

ان خیالات سے ہم شمال سے جنوب کی طرف اُتر کر بحیرۂ خزر اور بحیرۂ عرب کے درمیانی ملک پر نظر ڈالتے ہیں ہم کہہ چکے ہیں کہ آریا نسل کا کھوج یہیں لگتا ہے۔ اور یہیں ان کی قوائے نے اپنا عروج دکھایا ہے۔ یہاں کے موسمی تغیرات کی سختی انسانی تادیب اور تہذیب کے لئے سب سے اچھا انتظام

Marfat.com

ہیں۔ یہی جگہ ہے جہاں سے آریا نسل کا سراغ مشرق اور مغرب دونوں طرف چلتا ہے۔ اور اگر فی الواقع ان کا وطن یہی ہے تو ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ گویا صرف آریا نسل کے لحاظ سے بحیرۂ فارس اور کوہ قاف کا درمیانی حصہ انسان کا اصلی وطن ہے۔ لیکن اگر نظر کو وسیع کر کے اور نسلوں کو بھی لیں تو اس میں عقدہائے لاینحل پیش آتے ہیں۔ اس حصے میں قوم مغول کا نام ونشان تک نہیں ہے۔ بحیرۂ خزر اور بحیرۂ اسود کے آس پاس یہ لوگ بکثرت ہیں۔ مگر ایران میں قسم کھانے کو بھی نہیں ملتے۔ بعینہ یہی حال حبشیوں کا بھی ہے۔ یہ نسل کہیں بیسویں درجہ عرض بلد کے اوپر نہیں ملتی۔ شاید کوئی معترض ممالک متحدہ امریکہ کی مثال پیش کرے جہاں کے اصلی باشندے بہت شمال کی طرف چڑھ گئے ہیں۔ یہ سچ ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ہم صرف قومی مہاجرت اور پراگندگی کو لے رہے ہیں۔ اور امریکہ میں ان کے انتقال مکان کی وجہ یہ نہیں ہے۔ بلکہ سفید رنگ اقوام کی دراندازی اور دست درازی ہے۔ اس لئے حبشیوں کا ماخذ آریاؤں کے ساتھ ملک باختر قرار دینا ناممکن ہے۔ حبشی ترقی کے میدان میں بھی سفید قوموں سے کوسوں پیچھے ہیں۔ ان کی ساخت جسمانی۔ لیاقت دماغی۔ مسائل اخلاقی ابھی اسی پرانی حالت میں ہیں۔ ضروری ہے کہ یا تو انہوں نے ترقی معکوس کی ہو۔ یا یہ اپنے وطن موجودہ کے قریب ہی خط استوا کے آس پاس سے بڑھے ہوں۔ مگر ترقی معکوس قانون قدرت کے خلاف ہے۔ ان تمام بحثوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سطح زمین پر کوئی ایسی ایک جگہ نہیں جہاں سے تمام موجودہ نسلیں اپنے موجودہ مقامات میں پھیل سکیں۔ سرخ۔ سیاہ اور بھوری نسلوں کا وطن یکجا ہونا معلوم نہیں ہوتا۔ موجودہ علمی حالت کے لحاظ سے یہ [illegible] فی الحقیقت محال ہے۔ یعنی گو یہ ممکن ہے کہ اہل آسٹریلیا اور اہل حبش ایشیا کے کسی ٹکڑے سے نکلے ہوں۔ مگر یہ بات اتنی خلاف قیاس اور ناقابل قبول معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسے ناممکن کہدیں تو بیجا نہ ہو۔ پھر کیا؟ اگر آریا نسل افریقہ یا آسٹریلیا سے نہیں آئی۔ اگر قوم مغول افریقہ اور وسط ایران سے نہیں پھیلی

اور اگر حبشی نسل ایشیا میں پیدا نہیں ہوئی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مختلف اقوام کا متحدہ وطن ملنا ناممکن ہے۔ ہرگز نہیں۔ ابھی ایک صورت باقی ہے جس کے تسلیم کر لینے سے یہ سب مشکلیں مٹ جاتی ہیں۔ اور مجملاً وہ یہ ہے کہ خشکی اور تری کی موجودہ اور قدیم تقسیم یکساں نہیں ہے۔ کئی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں بحیرۂ عرب اور بحر ہند کا شمالی ٹکڑا جزیرۂ مدی غاسکر سے مشرق کی طرف آسٹریلیا اور جزیرہ نمائے ملایا تک برابر خشک تھا۔ جو آہستہ آہستہ سمندر میں چھپ گیا۔ اگر یہ خیال صرف ابنائے آدم کی مختلف اقوام کے متحدہ وطن پیدا کرنے کیلئے پیش کیا جاتا تو قطعی مہمل اور لغو تھا۔ مگر اس سطح آب میں چھپے ہوئے براعظم کے وجود کو بہت سی دلیلوں نے قرین قیاس ہی نہیں بلکہ بالکل یقینی کر دیا ہے۔ اور ان دلیلوں کو ہمارے موجودہ سوال یا علم الاقوام سے کچھ بھی علاقہ نہیں ۔

اول تو جغرافیہ بحری میں بحر ہند کے اکثر مقامات کی تھوڑی گہرائی مشہور ہے۔ خط استوا سے ۳۰ درجے جنوب تک اور مدی غاسکر سے ۸۰ درجے طول بلد تک اس سمندر کا پانی بہت ہی کم ہے۔ اگر ہم جزیرۂ ماریشس پر کھڑے ہوں تو ہمارے چاروں طرف بہت کم گہرا پانی ہے۔ اس کے ادھر اُدھر بھی بحر الکاہل کی سی گہرائی نایاب ہے۔ اگر کسی بحری حرکت کی وجہ سے یہ سمندر کچھ اتر جائے تو افریقہ اور جزیرہ نمائے ملایا کے درمیان ایک آسٹریلیا سے بھی بڑا براعظم نکل آئے۔ اور یہ بحری حرکت کچھ عجب نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی ایسی حرکتیں بارہا ہو چکی ہیں۔ اور ہم جانتے ہیں کہ اب بھی وہ اپنا کام کر رہی ہیں۔ گو آہستہ آہستہ کئی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ براعظم کسی زمانے میں موجود تھا۔ مثلاً بحر ہند کے دونوں کناروں کے درختوں اور جانوروں کی مشابہت ہی اس بات کی گواہ ہے۔ جزیرۂ مدی غاسکر اور جزیرہ نمائے ملایا کے تمام پرندے ایک ہی قسم کے ہیں۔ بعض قسم کے ناریل کے درخت جو سنگاپور۔ نیوگنی۔ آسٹریلیا اور مجمع الجزائر کے مغربی جزیروں میں پلے جلتے ہیں۔ یہ درخت بیج وغیرہ کے ذریعہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں لے جائے جا سکتے۔

Marfat.com

اور علم نباتات کے ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اگر یہ تمام علاقے آپس میں ملے ہوئے نہ ہوتے تو ان درختوں کا اتنی متفرق جگہ پایا جانا ناممکن تھا۔

علم طبقات الارض کی تحقیقات اس بات کی تائید کرتی ہے کہ پہلے یہ جگہ سطح سمندر کے اوپر تھی جہاں اب بحر ہند موجیں مارتا ہے۔ بعد میں یا تو یہ زمین نیچے دھس گئی یا سمندر اوپر چڑھ گیا۔ جس سے یہ حصّۂ زمین سطح سمندر بن گئی۔ ایک اور قابل غور بات یہ ہے کہ آخر نوع انسان کسی جگہ سے ضرور پھیلی۔ خواہ وہ جگہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ مگر ہو گی ضرور۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ وہ جگہ ایسی ہو جہاں سے تمام موجودہ نسلیں پھیل سکیں۔ اور تمام موجودہ شرائط پوری ہو جائیں۔ اگر کوئی ایسی جگہ مل جائے خواہ خشکی میں ہو یا تری میں جس کی طرف تمام مختلف علوم و فنون کی تحقیقات اشارہ کرتی ہو تو خود یہی بات اس کے لئے ایک زبردست دلیل بن جاتی ہے۔ یہ تمام دلیلیں مل کر ہم کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ کہ نوع انسان کا اصلی وطن وہ سرزمین ہے۔ جو اب بحر ہند میں چھپ گئی ہے۔ اور جسے علمائے **لیموریا** نام دیا ہے۔ یہ مانتے ہی سارا سوال حل ہونے لگتا ہے۔ اور ابتدائی اقوام کی پراگندگی کے راستے نظر آنے لگتے ہیں۔ حبشی مغرب کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اور تاریخی زمانے کی ابتدا میں افریقہ کے ساحل مشرقی پر ملتے ہیں۔ انہی کی ایک دوسری شاخ مشرق کی طرح جاکر آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ اور جنوبی دکن کو آباد کرتی ہے یہیں سے قوم مغول بلوچستان اور مغربی ہندوستان کی طرف بڑھتی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ تاریخی زمانے میں سب سے پہلے ان کے آثار انہی حصّوں میں ملتے ہیں۔ انہی کے ساتھ ساتھ ایک اور قوم بھی بڑھتی ہے جو بلوچستان کے قرب میں ان سے الگ ہو کر آیندہ سرخ یا سفید نسلوں کی ماں بنی۔ یہاں ہم نے یہ باتیں تحقیقات علمی کی حیثیت سے بیان نہیں کیں۔ بلکہ ان کی باہمی مناسبت اور موزونیت دکھلانے کے لئے گوش گزار کی ہیں۔ تاہم یہ صرف من گھڑت کہانیاں۔ اور خلاف واقعہ افسانے نہیں ہیں۔ ان کی تائید میں بہت سی سائینس کی دلیلیں دیجا سکتی ہیں۔ مثلاً یہی کہ انسان طبعاً منطقۂ حارّہ کا باشندہ ہے۔ اس کی تمام اصلی عادات و ضروریات اسی کی متقاضی ہیں۔

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ انہی گرم سیر طبقوں میں یہ تقریباً اپنی اصلی ابتدائی حالت پر قائم رہا ہے۔ اور ملکوں کی ترقی اس بات کی دلیل ہے کہ وہاں کے حالات وہاں کے باشندوں کی اصلی عادات کے مطابق نہ تھے۔ اس لئے ان لوگوں کو قدرتی اسباب کے مقابلے میں اپنی ذاتی کوششوں اور ترقیوں سے کام لینا پڑا۔ لیکن خط استوا کے آس پاس رہنے والے اب تک سب سے زیادہ وحشی اور ابتدائی حالت میں ہیں۔ یعنی ان ملکوں کی قدرتی کیفیات ان کی اصلی خو بو کے مطابق ہیں۔ اور ان کو انسانی صنعت سے مطلق کام لینے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس کے برخلاف وہ لوگ جو اس اپنے اصلی وطن سے نکلے۔ اور شمال کی طرف چلے۔ ان کو شمالی ملکوں کے سخت اور بدلتے ہوئے موسموں نے بہت جلد ان کے برہنہ اور نرم جسم کی مصنوعی حفاظت کے طریقے سکھا دئے۔ ان کے قوائے کھلنے لگے اور طاقتیں بڑھنے لگیں۔ اور جلد ہی اُنہوں نے عقل اور صنعت سے قدرت کا مقابلہ کرنا سیکھ لیا۔ یہیں سے ترقی کا میدان شروع ہوا اور آج اس کا فرق ایک جرمن اور ایک حبشی کی حالتوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔

غرض یہاں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ابتدا منطقہ حارّہ میں ہوئی۔ اور اس کی ترقی دوریِ وطن سے علم ہئیت کے لحاظ سے بھی غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ابتدائی زمانے میں شدت سرما کی وجہ سے اس گرم منطقے کے سوا اور کہیں انسان کا ٹھکانا نہ ہوگا۔ یہ بات اچھی طرح مدنظر رکھنی چاہیئے کہ ابتدائی آدمیوں کی رہائش کے لئے مناسب جگہ۔ اور آیندہ نسلوں کی ترقی کے لئے موزوں مقام ایک دوسرے سے بالکل مختلف بلکہ باہم ضد ہیں۔ غالباً اوپر کے فقروں سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوگئی ہوگی۔ انہی قیاسات سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ہمارا اصلی وطن ملک لیموریا تھا۔ مگر اس کو بالکل قطعی اور یقینی کہنا بجا نہیں ہے۔ شاید آیندہ تحقیقات اور معلومات سے کوئی اور جگہ اس بھی زیادہ موزوں نکل آئے اگرچہ ہمارے ان قیاسات کے بالکل بدل جانے کا چنداں اندیشہ نہیں۔ علوم طبیعی

Marfat.com

کا یہ اصول ہے کہ جو مسئلہ چند مختلف اور بظاہر متضاد کیفیات کو قرین قیاس طور پر حل کر دے اور اس میں کوئی خاص اعتراض بھی نہ ہو تو اسے کم از کم امتحاناً تسلیم کر لیتے ہیں۔ گو اس میں کسی قدر شک کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ ہمارے اس مسئلے کا بھی یہی حال ہے +

اس کی تائید میں ایک اور قابل ذکر شہادت ہے۔ جو اعلےٰ درجہ کے جانوروں کی قدرتی تقسیم سے حاصل کی گئی ہے۔ اگر ہم بیمور یا کے گرد ایک دائرہ کھینچ دیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ علم حیوانات کے لحاظ سے یہ دائرہ انتہائے علو پر واقع ہے۔ تمام روے زمین کے حیوانات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں ہم اس دائرے کے پاس آتے جاتے ہیں۔ جانوروں کی قسمیں اعلےٰ ہوتی جاتی ہیں۔ خواہ ہم کسی سمت سے اس حصّے کی طرف چلیں۔ تقسیم حیوانات کی ترتیب اسی کی طرف بلند ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ گویا تمام جانداروں کا بہترین نمونہ اور آثار حیات کی خوشترین مثال اس سرزمین پر ہے۔ یہ ترتیب گویا پکار پکار کر کہتی ہے کہ اس سرزمین کے سوا اور کسی جگہ انسان کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔ ورنہ ہم کو یہ ماننا پڑیگا کہ وہ قانون قدرت جو نہایت ہی ادنےٰ ذی روح چیزوں سے نہایت ہی اعلےٰ جانوروں تک ایک خاص ترتیب اور انتظام سے آرہا تھا۔ یہاں تک آکر یکایک ٹوٹ گیا۔ کیونکہ انسان اس جگہ پیدا نہیں ہؤا جہاں اس قانون کے مطابق اس کو اشرف الحیوانات کی حیثیت سے پیدا ہونا چاہیئے تھا +

شاید ان نتائج کو علم حیوانات کے چند مسائل و اصول سے واضح کرنا بیجا نہ ہو۔ آسٹریلیا تھیلی دار جانوروں کا گھر ہے۔ اور یہ گرم خون والے جانوروں میں سب سے ادنےٰ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ قسم اور ملکوں میں بھی پائی جاتی ہے مگر یہ بالکل یقینی ہے کہ وہ ملک ان کا اصل گھر نہیں ہیں۔ بلکہ گویا وہ قسمیں مختلف خطوط ہیں جو آسٹریلیا میں آکر مل جاتے ہیں اور اسے مرکز بنا دیتے ہیں۔ اس کے بعد جنوبی امریکہ پوپلے جانوروں کا وطن ہے۔ جو ترقی میں ان سے ایک زینہ اوپر ہیں۔ شمالی امریکہ کے اصلی جانور گیاہ خوار چرندے ہیں۔ جو ترقی میں تیسرے

درجے کے ہیں۔ منطقۂ حارّہ کے مشرقی کرہ کے حصّے عظیم الشان درندوں کا بن ہیں۔ جو چرندوں سے ایک زینہ اور اوپر ہیں۔ تھیلی دار جانوروں کی طرح یہ سب جانور بھی اکثر ملکوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی کثرت اور گوناگونی مذکورہ خاص خاص ممالک کو ان کا اصلی مرکز قرار دینے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لئے گویا ترقّی حیوانی کے لحاظ سے آسٹریلیا سب سے نیچے اور مشرق کا منطقۂ حارہ سب سے اوپر ہے +

جب ہم انسان سے اتر کر سب سے اعلےٰ درجے کے جانوروں پر غور کرتے ہیں تو یہ دلیل اور بھی زبردست ہو جاتی ہے۔ وضاحت دلیل کے لئے علماے حیوانات نے روے زمین کے مختلف ٹکڑے کئے ہیں اور ان کے الگ الگ نام رکھے ہیں۔ تاکہ تقسیم حیوانات کا مسئلہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔ پہلے ٹکڑے میں تمام یورپ۔ ہندوستان۔ جزیرہ نماے ملایا اور جنوبی عرب کو چھوڑ کر تمام ایشیا اور خط سرطان کے اوپر کا تمام افریقہ شامل ہے اور اس کا نام طبقۂ منجمد قدیمہ رکھا ہے +

باقی افریقہ۔ جزیرۂ مدی غاسکر اور آور آس پاس کے جزیرے دوسرے ٹکڑے میں ہیں۔ جس کا نام طبقۂ حبش قرار دیا ہے +

ہندوستان۔ عرب جنوبی۔ اور جزیرہ نماے ملایا طبقۂ مشرقی کہلاتے ہیں +

آسٹریلیا۔ نیوزیلینڈ اور مجمع الجزائر کو طبقۂ آسٹریلیا کہتے ہیں +

جنوبی امریکہ اور جزائر غرب الہند اور میکسکو کے منطقہ معتدلہ کے ٹکڑے کو طبقۂ حارّہ جدیدہ ٹھہرایا ہے +

اور باقی کی شمالی امریکہ نے طبقۂ منجمدہ جدیدہ نام پایا ہے +

ذیل میں امریکہ کے مشہور فاضل ونشل کا تیار کردہ نقشہ دکھایا جاتا ہے۔ جس سے اعلےٰ طبقۂ حیوانات کی تقسیم واضح کی گئی ہے +

Marfat.com

مندرجہ ذیل قسم کے حیوانات کی تعداد مذکورۂ بالا طبقات میں حسب ذیل ہے

نام جانور	طبقہ اوّل	طبقہ دوم	طبقہ سوم	طبقہ چہارم	طبقہ پنجم	طبقہ ششم
بن مانس	..	۲	۱۰	..	..	..
بندر	۱	۱۱	۲۸	..	..	..
بے بون	۴	۴۲	۲۳	۲	..	..
لیمور	..	۵۰	۵	۱	..	..
میزان	۵	۱۰۵	۶۶	۳	..	..
درندگان	۶۵	۹۰	۹۵	..	۴۸	۴۳
میزان کل	۷۰	۱۹۵	۱۶۱	۳	۴۸	۴۳

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ملک لیموریا جس کو ہم نے انسان کا قدرتی وطن مانا ہے مذکورہ بالا طبقات جنوب و مشرق کے درمیان میں واقع تھا۔ اوپر کے نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبقہ اعلےٰ کے حیوان ان دو طبقوں میں کس قدر کثرت سے پائے جاتے ہیں اور گویا انسان سے دوسرے درجے کے جانور یہاں کے سوا کہیں بھی نہیں ملتے۔ درندوں کے لحاظ سے بھی یہ دونوں طبقے دنیا کے اور طبقوں سے دوگنی قسمیں رکھتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عموماً اعلےٰ طبقے کے جانور اور خصوصاً بن مانس کے قسم کے بندر صرف بحر ہند کے آس پاس ہی پائے جاتے ہیں۔ اور نتیجہ ظاہر ہے کہ بحر ہند کی تنگ موج زمین جو کسی زمانے میں منطقہ حارّہ کا ایک بڑا عظم تھی۔ آثار حیات کے معراج کمال اور اقسام حیوانات کے انتہائے عروج کے لئے کس قدر موزوں اور مناسب ہے۔

ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں کہ ان مقاموں میں نوع انسان کی پست اور وحشیانہ حالت اس امر کی اور بھی تائید اور تاکید کرتی ہے۔ اور ہر قسم کے بن مانس اس حصّہ کی طرف ترقی کرتے ہوئے آتے ہیں۔ اور اقوام انسان اس کے پاس آتے ہوئے اور بھی گرتی جاتی ہیں۔ اور جوں جوں دور ہٹتی ہیں اسی قدر بڑھتی ہیں۔ سب سے کم درجے کے آدمی دیکھنے ہوں تو پاپوا اور آسٹریلیا میں تلاش کرنے چاہئیں۔ ان سے آگے افریقہ میں۔ ان سے اوپر جنوبی امریکہ کے اصلی باشندے۔ پھر شمالی امریکہ کے وحشی۔ اور اوپر مجمع الجزائر اور ایشیا

کے شمال مشرق کے رہنے والے۔ ان کے بعد تمام مہذب آدمی ۔ اس کی وجہ ضمناً ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ قرینِ قیاس یہی بھی ہے کہ انسانی ابتدا اعلیٰ جانوروں کی انتہا سے ملحق ہونی چاہیئے تھی۔ جہاں اور حیوانات اپنے اعلےٰ سے اعلےٰ درجہ پر پہنچتے ہیں۔ وہاں سے انسان کی ادنےٰ سے ادنےٰ حالت شروع ہونی مناسب تھی جیسے ایک صدی کی سب سے پہلی تاریخ اس سے پہلی صدی کے سب سے آخری دن کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ گویا بھوربا کی تہ آب سرزمین سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ بن مانس پالپا کے نہایت ہی ادنےٰ انسان کے ساتھ دست بداماں ہے۔

وقت ابتدا کی طرح جائے آغاز میں بھی ابھی تک بہت کچھ شک وشبہ کی گنجائش ہے۔ ان مسائل پر بحث کرنے والے کو یاد رکھنا چاہیئے کہ تمام علوم کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ یقینی اور احتمالی۔ انسانی علم کا کچھ حصہ بالکل معین اور مدلل ہے۔ اور کچھ حصہ قیاسی وعقلی۔ انسان کی ہر قسم کی ابتدائی حالت کے متعلق تمام مسائل میں بہت کچھ شک وشبہ بلکہ غلطیوں تک کا شائبہ ہے۔ مگر اس سے ہماری اس تحقیقات کی قدر وقیمت کچھ کم نہیں ہو جاتی۔ اور اگر ہم اس کو بفرض عملی طور پر ثابت کر سکتے تو اس کی جاہ ومنزلت میں کچھ بیشی نہ ہو سکتی شاید انسانی طبیعت اپنی ابتدا کے بارے میں زیادہ یقینی اور قطعی باتیں سن کر زیادہ مطمئن ومحظوظ ہوتی۔ مگر ہمارے خزانۂ دماغی کی ترقی میں علوم یقینی بھی معلومات قیاسی سے کچھ بہت زیادہ مفید نہیں ہوتے۔ کیونکہ ایسے علوم اگرچہ استقامت عقل اور استعانت ذہن کے لیئے نہایت عمدہ ہیں۔ مگر ساتھ ہی تمام قوائے دماغی محض ایک الجبری مساوات اور حسابی گر بن جاتے ہیں اور قوت متصوّرہ اور متخیّلہ اگر بالکل بیکار نہیں تو کمزور تو ضرور ہی ہو جاتی ہے حالانکہ صداقت کی تلاش اور حسن کا مدار انہی پر ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ ہمارے اپنے اور کائنات کے متعلقہ خیالات میں شک وشبہ کی آمیزش اور قیاس اور احتمال کی گنجائش نہ رہے۔ ورنہ مصوّروں کے خیال اور شاعروں کے مضمون ہمارے جواہر دماغی کو جلا دینے سے دست بردار ہو جائینگے۔

Marfat.com

الجزءُ الثانی

باب دہم

کیفیّت آغاز۔ حکم قضا یا ترقّی کا مقتضا

ہم حتے الامکان انسان کی پیدائش کے ابتدا سے زمان ومکان پر اچھی طرح بحث کر چکے ہیں۔ اب ہم کو اس اہم سوال پر غور کرنا ہے کہ اس کی ابتدا کس طرح اور کن طریقوں سے ہوئی۔ گزشتہ بحثوں کی طرح یہاں بھی یہ دقّت موجود ہے کہ انسان خود اس کی بابت کچھ نہیں جانتا۔ اور یہ بے خبری افراد۔ اقوام۔ انواع سب میں یکساں پائی جاتی ہے۔ کسی کو اپنی پیدائش کی کیفیت کی خبر نہیں ہوتی۔ ہوش آتا ہے۔ مگر اس سے پہلے کی حالت حافظے کی حد سے پرے اور ادراک کے دائرے سے باہر ہے۔ ایک خود ساختہ خیال کے سوا کچھ نہیں ایک اور بڑی دقّت تعصب نے پیدا کر دی ہے۔ ہر فرقے اور ہر قوم میں ابتدائے آفرینش انسان کی داستان باستان عقائد قومی کا عنوان اور خیالات فلسفی وہندسی کی جان رہی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی ملکی وقومی آئین وقوانین کا بھی جزو ہو جاتی ہے۔ مگر خواہ کہیں ہو اور کسی صورت میں ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ہر حال میں مسائل صداقت کی تحقیق میں حائل ہوتی ہے۔ اب تک شائستہ سے شائستہ اقوام بھی یہی سمجھتی ہیں کہ آغاز نوع کی وہ پرانی کہانی جو باپ نے دادا اور دادا نے پردادا کی زبانی سنی سنائی ہمارے کانوں تک پہنچائی ہے۔ ہماری روحانی ترقی اور بہبودی کے لئے ضروری اور لازمی ہے۔ اس دلیل کو نظر انداز کر کے ہم بلا تامل کیفیّت آغاز کے مختلف بیانوں اور مخالف داستانوں کی

چھان بین کرتے ہیں - اس مضمون پر دو عام عقیدے ہیں +

اوّل یہ کہ دنیا و ما فیہا ہر قسم کے حیوانات اور سب طرح کے نباتات ایک حکیم و قدیر علیم وخبیر ذات والا صفات کے حکم قضا تو ام سے دفعتہً واحدۃً پیدا ہوگئے اس تمام کارخانے کے پیدا کرنے میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا - اور ہر طرح کے جانور صورت وسیرت میں مکمل - منّت والدین سے بے نیاز اور اپنے نئے مکان سے ناآشنا بلا واسطہ غیرے دنیا میں موجود ہوگئے +

دوم - یہ کہ دنیا اور اس کی تمام زندہ چیزیں اس عمل کا نتیجہ ہیں - جسے ترقی یا نشو ونما کہتے ہیں - اور یہ تمام حیوانات اور نباتات جن سے اب سطح بر و بحر بھری پڑی ہے - چند ابتدائی جرم یا صرف ایک ہی ایسے جاندار بیج سے بڑھے ہیں - جس میں نشو ونما - تغیر و تبدل اور گرد ولواح سے مناسب ہو جانے کی قابلیت تھی - اور یہ ابتدائی جرم اب سے لاانتہا مدت پہلے موجود تھے - اور یہ ترقی یا نشو ونما کا زمانہ غیر محدود مدت تک پھیلا ہوا ہے - اور اگرچہ اس کا کام نہایت سُست اور آہستہ تھا - مگر ابقاے بہترین کے عمل سے رفتہ رفتہ اس کی صورتیں زیادہ پھلتی پھولتی رہیں - اور آخر کار بڑھتے بڑھتے آجکل کی مختلف اقسام کے مکمل نمونے پیدا ہوگئے +

مسئلہ ارتقا اور ابقاے بہترین کی مفصل تعریف آگے آئیگی +

ان دونوں مخالف عقیدوں کے متعلق ہمیں کئی باتیں کہنی ہیں - اول تو یہ کہ گزشتہ نصف صدی کے تمام علما اور حکما اس معرکتہ الآرا مسئلے پر سب سے زیادہ غور کرتے رہے ہیں - اور اکثر مختلف الآرا رہے ہیں - دوسرے یہ کہ عموماً علماے مذہب اور طبقہ مقلدین نے پہلے عقیدے کی حمایت کی ہے - اور فلاسفہ اور فضلاے طبعیات نے دوسرے گمان کو ترجیح دی ہے - تیسرے اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ ان دونوں مسئلوں کا مابہ الامتیاز خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے - اور ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان دونوں کا اصلی فرق طرز عمل کی بابت ہے - ارتقا کے مسئلے نے ابتداے حیات کی توضیح وتشریح کرنے کا نہ پہلے کبھی دعوے کیا ہے - نہ اب

کرتا ہے۔ اس کی تحقیقات صرف اس طرز عمل کے معلوم کرنے تک ہے جس نے چند ابتدائی جرموں سے موجودہ عالم حیوانات و نباتات کی گوناگونی اور بوقلمونی پیدا کر دی۔ اس اہم بات کے نظر انداز کر دینے سے دونوں فریقوں میں مخالفت بڑھی ہے۔ ورنہ کم از کم روح کا وجود دونوں میں مسلّم اور یکساں مقبول ہے۔ گویا دونوں کا اصل فرق یہ ہے کہ پہلا فرقہ آثار حیات کی مختلف صورتوں کے ابتدائی نمونوں کے یکبارگی پیدا ہو جانے پر زور دیتا ہے۔ اور فلاسفہ جدید روح کے وجود کو مان کر چند ابتدائی اجرام سے موجودہ ترقی یافتہ اجسام کی تکمیل کے لئے بہت بڑے زمانے اور لا محدود مدت کی ضرورت ثابت کرتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ ان دونوں مسئلوں کے تسمیے میں سخت غلط فہمی ہوتی ہے ایک کو مسئلۂ خلقت کائنات کہتے ہیں۔ دوسرے کو مسئلہ ارتقا کہتے ہیں۔ گویا ایک فرقہ نشو و نما کا بالکل انکار کرتا ہے۔ اور دوسرا طبقہ خلقت کو مطلق نہیں مانتا۔ حالانکہ موجودہ خیالات کے لحاظ سے یہ دونوں باتیں سراسر غلط ہیں۔ کیونکہ مسئلہ خلقت والے بھی یہ مانتے ہیں کہ آثار حیات میں ایک حد تک نشو و نما کو بھی دخل ہے۔ گو زیادہ زور اسی پر دیتے ہیں کہ دنیا یکبارگی پیدا کی گئی۔ اس کے برخلاف فلاسفہ جدید خلقت کو آفرینش عالم کے مسئلے سے خارج نہیں کرتے۔ بلکہ بحث ہی روح کے وجود کو مسلّم مان کر کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ چند ابتدائی اجرام حیات کو موجود فرض کر لیں تو پھر باقی تمام اشیا اُنہی سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مسئلے میں ابتدائی خلقت کو ماننا ناگزیر ہے۔ ہم کہہ ہی چکے ہیں کہ اصلی اختلاف طرز عمل میں ہے۔ کہ آیا یہ تمام ذی حیات اشیا اپنی اسی حالت میں اور اسی قابلیت کے ساتھ کسی توانا ذات کے حکم سے یکدم موجود ہو گئیں۔ یا صرف چند ابتدائی جاندار جرثوں سے بڑھتے بڑھتے اور بدلتے بدلتے روے زمین پر یہ رنگا رنگی پیدا ہو گئی۔ آخر میں یہ بات بھی کہہ دینی چاہئے کہ طبقۂ علما میں ارتقا کا مسئلہ روز بروز ترقی پر ہے۔ اور طرز عمل کی بابت اس کے جوابات اور تحقیقات زیادہ تسلی بخش اور اطمینان دہ ہیں۔ کچھ دن پہلے لوگ زمین کو بھی یکبارگی پیدا شدہ

Marfat.com

مانتے تھے۔ اور اس خیال نے مدتوں تک علم طبقات الارض کی ترقی کو دبائے رکھا۔ اس کی تحقیقات کی بھی ایسی ہی مخالفت کی جاتی تھی۔ جیسے مسئلہ دوران زمین کی۔ اس علم کو بھی میدان خیال میں قدم قدم زمین پر لڑنا پڑا۔ اور چپہ چپہ جگہ کے لئے جان لڑانی پڑی۔ آخر خدا خدا کر کے سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں ثبوتوں کے بعد اس نے منوالیا کہ طبقات زمین لاانتہا مدت میں نہایت ہی آہستہ آہستہ بنے ہیں۔ اور خود ان کی اور ان کے آثار محفورہ منجمدہ کی تاریخ اب سے کروڑہا کروڑ برس پہلے تک پھیلی ہوئی ہے۔ غرض دقت پڑی۔ محنت اٹھائی۔ مصیبت سہی۔ خوب کشمکش رہی۔ مگر آخر شان الہی کے نئے نشان کے سامنے اگلے عقیدوں کو سر تسلیم جھکانا پڑا۔ اور رنگا رنگئ صنعت نامتناہی کی نئی نیرنگی نے پرانے رنگ کو بیرنگ کر دیا ✤

مگر یہ فتح نئی لڑائی کے لئے پیش خیمہ تھی۔ علم حیوانات ونباتات نے طبقات الارض کی تحقیقات کو لے کر یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ سطح زمین کے موجودہ درخت اور جانور زمانۂ قدیم کے درختوں اور جانوروں کی ترقی کردہ صورتیں ہیں۔ اور وہ خود ان اسلاف کے اخلاف تھے جن کی پتھرائی ہوئی صورتیں زمین کے طبقوں میں سے دبی دبائی ملی تھیں۔ عقیدۂ قدیم نے اس کا مقابلہ بھی بڑی سختی اور تندی سے کیا۔ کیونکہ اس کے مطابق تمام موجودہ حیوانات ونباتات صرف چھ ہزار سال ہوئے دنیا میں آئے تھے۔ اور ان سے پہلے کوئی ان کے مشابہ چیز یہاں موجود نہ تھی۔ اور اس کے بعد ان کی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ اس پرانے عقیدے کو ہاتھ سے دینا۔ گویا دین وایمان سے ہاتھ دھونا۔ اور دین ودنیا دونوں کو ہاتھ سے کھونا تھا۔ اس لئے گو اس کے ماننے والے شہادت نہ لا سکتے تھے مگر شہادت کے لئے تیار تھے۔ اُدھر وہ علوم بھی گڑے مردے اکھیڑ کر اپنی دلیلوں کی فوج کو دریا موج اور اپنی شہادتوں کے لشکر کو محشر حشر بنا کر آمادۂ پیکار تھے ✤

آخر انہی کا پلہ وزن رہا۔ اور یکبارگی اور ناگہانی آفرینش کے دعویداروں کی چشم ثبات علوم طبعی کے ثبوت عینی کے سامنے جھک گئی۔ مگر یہ بھی ابھی تک

Marfat.com

اور قول کے سچے تھے۔ میدان ہارا مگر دل نہ ہارا۔ اگرچہ مخالف دلیلوں کے پرے کے پرے انسانی دل و دماغ کے تمام درے روکے پڑے ہیں۔ مگر ان کی حد سے پرے پرے اور اُن کی زد سے باہر باہر یہ بھی برابر شبخون مارے جاتے ہیں ٭

مزیدے برآں یہ کہ انسان کو اس قاعدے سے مستثنےٰ ٹھہرایا ہے۔ یعنی اگرچہ اور جانوروں اور درختوں کو ان سے کم درجے کے قدیمی حیوانات و نباتات کی پودمان لیتے ہیں۔ مگر خود انسان کو بلاواسطہ پیشیں یکبارگی پیدا کردہ قرار دیتے ہیں۔ اور اب تمام زور دلائل اسی پر خرچ کیا جاتا ہے۔ نئے فرقے نے ان کو اس تنگ قلعے میں گھیرا ہے۔ مگر چونکہ خود اس کو بھی یہ خوف تھا کہ مبادا سچ مچ پرانے عقیدوں کی تردید سے اخلاقی اور تمدنی حالت میں فتور آجائے اس لئے کچھ تو اس عقیدے کی جان بخشی کرنے کے خیال سے اور کچھ خود اپنے نوگرفتہ مفبوضات کو مضبوط کرنے کے لئے ابھی یہیں قیام ہے ٭

یہ حالت دونوں فریقوں کی گزشتہ صدی کے وسط میں تھی۔ بعض زیادہ تیز دو محققین نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ کوئی وجہ نہیں کہ اور جانوروں کے ساتھ انسان پر معلومہ قوانین قدرت نہ پھیلائے جائیں۔ اگرچہ اس زمانے کے بھی بعض محقق صداقت کے بہت قریب آگئے تھے۔ مگر چونکہ امتحان اور آزمائش کی کمی نے تمام واقعات ان پر ظاہر نہ کئے تھے۔ اس لئے یہ کام ان کے بعد کی نسل کے ایک نہایت پرمغز اور عالی دماغ محقق کے لئے باقی رہ گیا۔ جس نے ارتقا کے مسئلے کو مکمل کر دیا۔ جو آج تمام ذیحیات اشیا کی ابتدا اور آفرینش کی طرز عمل کی تشریح و توضیح کرتا ہے ٭

یہاں ہم کو اس نئے مسئلے کے تمام اصول بیان کرنے نہیں ہیں۔ بلکہ طرز آفرینش کے متعلق مختلف فرقوں کی رائیں دکھانی ہیں۔ ہاں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ یہ نیا مسئلہ عقلاً اوروں سے بہتر و برتر ہے۔ شاید مختلف مذہبوں کے عقیدوں کی تفصیل معاملے کو زیادہ واضح کر دے ٭

خلقت یکبارگی کے ماننے والے گو خود مختلف الآرا ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر

Marfat.com

کا اعتقاد یہ ہے کہ دنیا نیست سے ہست کی گئی ہے۔ یعنی دنیا اور مختلف اشیائے دنیا کی صورت ہی نہیں بلکہ اُن کا مادہ بھی حکم قضا سے وجود میں آیا۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ مادہ موجود تھا۔ اور خلقت کا کام صرف اس مادہ کو مرتب اور متشکل کرنا تھا۔ مگر حقیقت میں یہ خیال تحقیقات جدید کا نتیجہ ہے۔ اصلی نہیں ہے۔ مسلمانوں اور مسیحیوں نے کتاب پیدائش کے ابتدائی بابوں کو لفظاً لفظاً صحیح تسلیم کیا ہے۔ ان میں خلقت کائنات کی مدت ۶ دن ٹھہرائی ہے۔ ہر دن ایک نئی چیز کی پیدائش کا دن ہے۔ اور ثوابت و سیارات کی ابتدا بھی انہی دنوں میں ہے۔ کیونکہ اسی ضمن میں مرقوم ہے کہ "خدا نے دو بڑی روشنیاں بنائیں ان میں سے بڑی نے نیتر بن پیدا کئے۔ بڑا دن کے لئے اور چھوٹا رات کے لئے اس نے ستارے بھی بنائے" اور آخر میں چھٹے دن انسان کی پیدائش سے تمام کام کا اختتام ہوتا ہے۔ اصل عبرانی کتاب میں یوم کا لفظ آیا ہے۔ جس سے عموماً یہی دن مراد ہوتا ہے۔ جو عرف عام میں مشہور ہے۔ عبرانیوں کا یہی مسئلہ مسلّم چلا آتا تھا کہ یکایک علم طبقات الارض کی ترقی نے انسانی دماغ میں زلزلہ ڈال دیا۔ اور پیش پا افتادہ واقعات کے سامنے اس مذکورہ اعتقاد کو لفظاً صحیح ماننا ناممکن ہو گیا۔ اس لئے علمائے مذہب نے یوم کے معنی کھینچ تان کر "زمانہ" نہایت مدت ٹھہرائے۔ اور عبرانی زبان میں اس کی ایسی مثالیں نکالیں جہاں یہ لفظ انہی مجازی معنوں میں بولا گیا ہے۔ اور کتاب پیدائش کے الفاظ کی اس طرح تاویل کر کے اسے ایک حد تک علوم عقلی کے مطابق کر دیا۔ مگر صرف زمین اور اور اجرام سماوی کے لئے کیونکہ ذیحیات مخلوق اور انسان کی پیدائش کے بارے میں عقیدوں کا دار و مدار پھر اسی کتاب پیدائش کے انہی ابتدائی بابوں پر رہا۔ جہاں بیان کیا گیا ہے کہ "خدا نے انسان کو چھٹے دن اپنی صورت پر تمام سطح بر و بحر پر حکمرانی کے لئے پیدا کیا۔ اور آدمؑ نام رکھا" آدمؑ کے بعد حوّاؑ کی پیدائش کا حال بھی وہیں درج ہے۔ کہ ایک دن جب آدمؑ سو رہے تھے تو اُن کی بائیں پسلی سے حضرت حوّاؑ کا ظہور ہوا +

یہ بیان سمیاطیقی قوموں میں بہت پرانا ہے۔ اور اس میں مادے کی پیدائش

کا کچھ ذکر نہیں ہے۔ بلکہ صرف صورت آدم میں روح پھونکنے کا بیان ہے۔ اس سے ملتا جلتا بیان کلدانی دفینوں میں سے بھی ملا ہے۔ اور بابل کے نہایت ہی پرانے کتبے بھی اس ابتدائی ہیولے کا ذکر کرتے ہیں جس سے انسان پیدا ہونے والا تھا۔ اور اس میں اور عبرانی بیان میں بڑا فرق یہ ہے کہ وہ (عبرانی) خالق کو اس ہیولے سے الگ اور اس پر حکمران مانتے ہیں۔ جس نے اس ہیولے کو صورت دے کر اس سے رنگارنگ کی مخلوق پیدا کی۔ باقی باتوں میں یہ بیان باہم بہت کچھ متفق ہیں۔ ایک فرق اور بھی ہے اور وہ یہ کہ عموماً کلدانی اور بابلی لوگ رب الانواع کی پرستش کرتے تھے۔ مگر عبرانی لوگ وحدت الوجود کے قائل تھے۔ مگر اس میں بھی ایک موافقت کا نکتہ ہے اور وہ یہ کہ لفظ الوہیم یا آل اِلَہ جو عبرانی کتابوں میں مستعمل ہے۔ حقیقت میں جمع ہے۔ مگر کہتے ہیں کہ یہ جمع صرف عزت اور عظمت کے لئے ہے۔ یہ فرق بھی ہے کہ بعد میں عبرانی لوگ خدا کو خالق مادہ بھی کہنے لگے۔ اگرچہ ابتداً وہ اسے صرف خالق الاشیا سمجھتے تھے۔ مگر اہل بابل اور کلدانی خدا کو بھی مادہ کا ایک جزو اور محض اس کا صورت نگار خیال کرتے تھے۔ قدما کے عقائد میں مصریوں کا مذہب بھی سب سے پرانا ہونے کے لحاظ سے خصوصاً قابل ذکر ہے۔ مصری بھی بہت سے دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ ان کے ہاں خالق کا نام توٹھ تھا "جس نے دنیا کو تاریک سے منور کیا۔" اس سے معلوم ہوتا ہے وہ بھی سامی نسلوں کی طرح ابتدائی ہیولے اور پریشانی کے قائل تھے۔ ایک دیوتا کا نام را تھا جسے خالق الاشیا جانتے تھے۔ سورج کا دیوتا اور جان پیدا کرنے والا وہی سمجھا جاتا تھا۔ دنیا کی روزانہ حیات و ممات کا مالک پٹاہ کے نام سے موسوم تھا۔ ان کے دیوتاؤں کا مفصل ذکر خود اہل مصر کی تاریخ میں آئیگا۔ یہاں مثال کے واسطے اتنا حال کافی ہے۔

آریا نسلوں اور سمیا طیقی خاندانوں کے اعتقادات میں کوئی مشابہت یافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آریا لوگ ابتدا ہی سے کائنات کو اور نظر سے دیکھتے تھے۔ صرف ایک مشابہت کی مثال

Marfat.com

پائی گئی ہے۔ اور وہ قدیم ایرانیوں کے عقائد میں ہے۔ جو کتاب زندا وستا میں مذکور ہیں۔ وہاں بھی تمام اشیا کا خالق ہرمزد کو مانا ہے۔ جس کی زبان سے نکلتے ہی ہر ایک شے پیدا ہونے لگتی ہے۔ مگر کلدانیوں کی طرح ان کے نزدیک بھی مادہ پہلے سے موجود تھا۔ ہرمزد صرف صورتیں بنانے والا تھا۔ سنخش رستم کے مشہور تیرنما حروف کے کتبے میں ہرمزد کی شان میں لکھا ہے۔ "وہ سب سے بڑا خداؤں کا خدا جس نے زمین و آسمان بنایا اور انسان کو پیدا کیا" یہاں یہ بات بھی مدنظر رکھنی چاہیئے کہ زندا وستا زرتشت کے مذہب کی کتاب ہے۔ اور زرتشت خود ارمینیا کی طرف کا فلسفی تھا۔ ممکن ہے کہ اس نے یہ خیال سمیا طیقی نسلوں سے ہی لیا اور ایران میں آکر رواج دیا ہو۔ یہ کتابیں خود ایرانیوں کے ذاتی عقائد کی بابت خاموش ہیں۔ اس لئے غالباً یہ مشابہت کی مثال بھی محض خیال ہی خیال ہے۔ +

آریا قومیں ابتداً ہی بہت سے دیوتاؤں کی قائل ہوگئی تھیں ہندوستان اور یونان میں جتنے خاندان تھے اتنے ہی معبود۔ اور ان دیوتاؤں کے جمگھٹے میں احسن الخالقین یا سب سے بڑے دیوتا کا پتہ بھی نہیں ملتا۔ یونانی رب الانواع کو پوجتے تھے۔ اور علت العلل یا خالق مطلق پر چنداں بحث نہیں کرتے تھے (جیسے آج کل اہل ہند اپنے ڈیٹیوں اور ڈپٹی کمشنروں کو نذریں دکھائیں۔ مگر شہنشاہ کا نام تک بھی نہ جانتے ہوں) اور مادے کو ہمیشہ موجود مانتے تھے۔ قدیم ہندی عقائد میں کہیں کہیں توحید کی جھلک نظر آتی ہے۔ ویدکی ایک سب سے بڑی دعا کے کچھ حصے مثالاً درج کئے جاتے ہیں۔ — سب سے پہلے سنہری بچہ پیدا ہوا۔ وہ تمام موجودات کا یکتا مالک تھا۔ اس نے آسمان اور زمین کو مرتب کیا۔ وہ معبود کون ہے جس کو ہم اپنی نذریں چڑھائیں؟ وہ جو اپنی طاقت سے پانی کے بادلوں کے اوپر دیکھتا ہے۔ وہ بادل جو طاقت دیتے ہیں۔ اور قربانی کو روشن کرتے ہیں۔ وہی خدا سب معبودوں پر قادر ہے۔ وہ کون معبود ہے جس کے آگے ہم اپنی قربانی دیں؟ وہ ہمیں فارت نہ کر دے۔ وہ جس نے زمین کو پیدا کیا۔ یا وہ پاک معبود جس نے آسمان کو

Marfat.com

بنایا۔ اسی نے چمکدار اور ہولناک سمندر بنایا۔ وہ کون معبود ہے جس کے آگے ہم اپنی قربانی دیں"۔ ہندوؤں نے اس معبود کا نام اندر رکھا ہے۔ مگر ان کے یہاں بھی نیست سے ہست کرنے کا مسئلہ نہیں پایا جاتا۔ تمام آریا قومیں مادے کو موجود مان لیتی ہیں۔ گویا ان کے ابتدائی فلاسفہ اور حکمانے حال کے خیال کے مطابق مادے اور طاقت دو غیر فانی جزوں میں سے ایک کو تسلیم کر رکھا تھا۔ اور اس مادے کے لئے عقلمند پیدا کرنے والی طاقتوں کو مختلف معبودوں کی صورت میں ظاہر کرتے تھے۔ الغرض یہ فرق بہت نمایاں ہے کہ آریا نسلیں شروع ہی سے زیادہ مادہ پرست اور ارتقا کی قائل تھیں۔ اور سمیا طیقی نسلیں عموماً زیادہ خدا پرست اور دنیا کی یکبارگی پیدائش کی معتقد تھیں۔ عموماً تمام لوگ ان مسائل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس لئے اس سے زیادہ ان کی توضیح کی ضرورت نہیں۔ اس لئے دوسرے اور نو پیدا شدہ مسئلے کی طرف چلنا چاہئے +

علوم طبیعی کی ترقّی اور طبقات ارض کی بناوٹ کے علم کے بعد ان مسئلوں میں شک و شبہے پیدا ہونے لگے اور تحقیقات کے ساتھ ساتھ یہ یقین بھی بڑھتا گیا کہ قوانین قدرت اپنے کام میں بالکل یکساں رہے ہیں۔ اور دنیا کی اشیا ہمیشہ سے اسی طرح پیدا ہوتی اور نشوونما پاتی چلی آئی ہیں۔ اور کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی۔ جس سے ان قوانین میں کوئی رخنہ پڑے۔ یا ان چیزوں کی پیدائش میں کوئی استثنا ہو۔ یہ خیالات اسی طرح پیدا ہوتے اور بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ مختلف لوگوں کی مختلف کوششوں کے بعد آخر انیسویں صدی کے وسط میں رابرٹ چارلس ڈارون نے ارتقا کے مسئلے کو مکمل اور مرتب کر دیا۔ اور مغربی قوموں میں پہلے طبقہ علما اور پھر رفتہ رفتہ عوام الناس تک اس بات کو ماننے لگے کہ آج کل کے طرح طرح کے کل زندہ اجسام انتخاب قدرت اور ابقائے بہترین کے ذریعے سے صرف چند ابتدائی اور سادہ جرموں کے ارتقا اور با ہمی تغیّر و تبدل کا نتیجہ ہیں۔ اس مسئلے کی ترقّی اور کامیابی خود انسانی دماغ کے ارتقا کی ایک مثال

ہے۔ چونکہ مسئلہ نہایت اہم اور عجیب ہے۔ اور ناظرین اس سے چنداں واقف بھی نہیں ہیں۔ اس لئے کچھ تفصیل نازیبا نہیں ہے +

یہ خیال کچھ نیا نہیں ہے۔ ارسطو بھی اسے استعمال کرتا ہے۔ اور یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ ہر زمین اور ہر زماں میں مختلف فلاسفہ اس کے دلدادہ رہے ہیں۔ مشہور عالم تشریح ہاروے (۱۵۷۸-۱۶۵۷) جس نے دورانِ خون کا مسئلہ دریافت کیا تھا۔ اس بات کا قائل تھا کہ اعلےٰ طبقۂ حیوانات کے نئے عضو و جوارح یکایک اس حصہ بدن پر بڑھ جانے یا اس جانور کے جسم کے پھیل جانے سے پیدا نہیں ہو جاتے۔ بلکہ نہایت آہستہ آہستہ کسی ذرا سے بقیے کے تغیر و تبدل اور ضرورت استعمال کی وجہ سے نشو و نما پانے سے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد اور بہت سے محققین اس پر غور کرتے رہے۔ یہاں تک کہ ڈارون اور ولیس نے اس کو پورا رواج دے دیا۔ اور اب یہ مسئلہ اتنا عام ہو گیا ہے کہ اہل مغرب میں سے ہر ایک پڑھا لکھا شخص اس سے واقف و آگاہ ہے۔ اور علمائے تشریح الانسان نے تو اپنی تمام تعلیم کی بنیاد ہی اسی پر رکھی ہے۔ اور اس میں شک بھی نہیں کہ یہ مسئلہ جانداروں کی پیدائش اور انکی دگرگونی کی نہایت پسندیدہ توضیح کرتا ہے +

باب یازدہم

نئے مسئلے کی ابتدا

مسئلہ ارتقا کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ان چند باتوں کو پہلے ہی بیان کر دینا ضروری ہے۔ جو اس کی تعلیم کا جزو نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے مخالفوں نے اسے بدنام کرنے کے لئے اس کے سر لگا دی ہیں۔ اور ان کو اپنے مقصد میں کامیابی بھی بہت ہوئی ہے۔ کیونکہ ان کی وجہ سے اس مسئلے میں بہت

Marfat.com

غلط فہمی پھیل گئی ہے۔ لوگ اس کو شروع سے ہی نہایت گمراہ کن سمجھنے لگے۔ اور بہتوں کو یہ خیال ہوگیا کہ یہ مسئلہ کسی بد باطن شخص نے عمداً و قصداً انسان کی موجودہ دماغی اور اخلاقی حالت کو متذبذب اور متزلزل کرنے کے لئے گھڑا ہے۔ دماغ انسانی کی ترقی کی تاریخ میں یہ بات قابل افسوس ہے کہ جس کسی نے اس کو ترقی دینے کے لئے پرانے خیالات سے خلاف ورزی یا مسلم عقائد میں نکتہ چینی کی۔ سب لوگ اسی کی دشمنی پر آمادہ ہو گئے من صنف فقد استہدف پرانا قول ہے اور بہت درست۔ یہ سچا ہے کہ اس مسئلے سے آفرینش انسان کے قدیم عقائد میں خلل پڑا۔ مگر ویسے یہ مسئلہ نہایت ہی حلیم اور نرم پیرایہ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ اور اس کا مدعا صرف ایک قسم کی نئی تحقیقات کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا تھا۔ کسی خاص فرقے سے لڑائی مول لینا نہیں تھا۔ عقائد مذہبی یا علم الٰہیات کی بحث سے اس کو کچھ علاقہ ہی نہیں۔ اس کا کام صرف قدرتی واقعات پر غور کر کے ان سے طبعی نتائج اخذ کرنا ہے۔ اور اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ دنیا کی تمام ذی حیات اشیا کی پیدائش اور نشوونما کو ایک قانون کے تحت میں پرو کر بظاہر مختلف اور مخالف واقعات کو منتظم اور مرتب کر دیتا ہے۔ اب ہم ان غلط فہمیوں کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے مدتوں تک ساری دنیا کو اس کے خون کا پیاسا بنائے رکھا۔ اور اب بھی اس کے دبانے میں اپنا کام کر رہی ہیں۔ اول اور سب سے بڑی غلط فہمی عوام کا یہ خیال ہے کہ یہ مسئلہ ابتدائے روح کے حل کرنے کا مدعی ہے۔ اور عالم امکان کے تمام موجودہ آثار حیات کی تشریح معلومہ قوانین قدرت کے مطابق کر کے زندگی کو محض مادی قرار دیتا ہے۔ یہ خیال بالکل غلط اور محض بہتان ہے۔ اگرچہ بعض نہایت ادنےٰ درجے کے کیڑوں کی زندگی کے خود بخود پیدا ہو جانے کا شبہ ہوتا ہے۔ مگر ابھی تک تمام تحقیقات سے یہی نتیجہ نکلا ہے کہ جان کی ابتدا جان ہی سے ہوتی ہے۔ یہ مسئلہ ارتقا روح کو موجود تسلیم کرتا ہے۔ اور اس کے بعد جانداروں کے ظاہری اختلاف اور گوناگونی کو عقل کے مطابق سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کا تعلق صرف ان چیزوں سے ہے جو جان اور جسم کے ملنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر اس کو اس سے مطلب

Marfat.com

نہیں کہ یہ دونوں چیزیں خود کیونکر پیدا ہوئیں اور کہاں سے آئیں۔ یا ان کی غرض کیا ہوگی اور یہ کہاں جائینگی؟ علم الغایات کی بحث اس سے الگ ہے۔ مختصراً یہ کہ علت العلل سے اسے مطلق سروکار نہیں۔ اور واجب الوجود کی ہستی سے اسے کچھ بھی انکار نہیں۔ اس لئے حقیقت میں عوام الناس کے اصلی عقائد پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ یہ غلط فہمی کچھ نافہمی سے اور کچھ جان بوجھکر اس کی دشمنی سے پھیلائی گئی ہے۔ (امید ہے کہ ہمارے ناظرین اس کو اچھی طرح ذہن نشین رکھکر اس قسم کی غلط فہمی سے بچ جائینگے۔) اور اگر اس بات پر اچھی طرح سے غور کیا جائے تو غالباً فریقین کی دشمنی بالکل مٹ جائے ورنہ کم تو ضرور ہی ہو جائے۔ اور حال میں ایسا ہوا بھی ہے۔ اگرچہ ایک لحاظ سے نیا فرقہ اپنی روزافزوں فتوحات پر ناز کرنے کا مجاز ہے۔ مگر دوسری حیثیت سے پرانا عقیدہ اب تک بھی بزرگی کا بجا دعوے کر سکتا ہے۔ کیونکہ سائنس روح کی بابت کچھ بھی نہیں جانتی۔ اور ذات واجب الوجود اور ہستی روح جیسی دو نہایت ہی ضروری اور اہم چیزوں کے لئے علوم طبعیات عقائد مذہبی کے محتاج اور دست نگر ہیں۔ حالانکہ یہی دونوں چیزیں تمام کائنات کی جان اور تمام مخلوقات کی روح رواں ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو سائنس اور سائنس کی مبحوث فیہ چیزوں کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ یہی ہیں۔ جو فطرت کے تمام آئین کی بانی اور قدرت کے سارے قوانین سے بالا ہیں ✤

دوسری غلط فہمی جو اس کی قبولیت میں حائل ہوئی ہے یہ ہے کہ عوام نے سمجھا کہ یہ مسئلہ انسان کو ادنےٰ اور دوسری قسم کے جانوروں کی نسل بناتا ہے۔ ڈارون اور ولیس کی تحریرات کے بہت دن بعد تک یہی خیال عام رہا کہ ان لوگوں کے نزدیک آدمی بندروں اور لنگوروں کی اولاد ہیں۔ ابنائے عصر کی نازک دماغی اس کا اتنا تحمل نہ کر سکی کہ اس بات پر تامل تو کرتی۔ اور بے دیکھے بھالے یہ مسئلہ حقارت سے رد کر دیا گیا۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ یہ قول مسئلہ ارتقا سے مختلف ہی نہیں ہے۔ بلکہ بالکل اس کے

مخالف ہے۔ مگر "آفریں دل کو مرے یہ جو ڈٹا سو ڈٹا" کسی حریف کی زبان سے نکلنا تھا کہ لوگوں کے دلوں پر پتھر کی لکیر ہو گیا۔ اور دل لگی بازوں کو ایک کرشمہ ہاتھ آیا۔ یہ سچ ہے کہ اس مسئلے کے مطابق انسان کم درجے کے جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اور وہ جاندار خود اپنے سے کم درجے کے جانداروں کے نشو و نما یافتہ نمونے تھے۔ و علے ہذا القیاس۔ مگر یہ جاندار تھے انسان کی ہی قسم کے۔ غیر قسم کے ہرگز نہ تھے۔ اسی طرح سے بندر وغیرہ تمام مختلف جانور اور درخت پہلے زیادہ سادہ اور کم درجے کے تھے۔ جن کے پتھرائے ہوئے نمونے ہماری تعلیم کے لئے اب تک زمین کے طبقوں میں امانت رکھے ہوئے ملتے ہیں۔ لیکن ایک الگ قسم کے جانوروں سے دوسری علیحدہ قسم کا پیدا ہو جانا اس مسئلے کی بالکل ضد ہے۔ اور اس کو ٹھیک طور پر سمجھنے کے لئے ان دونوں صورتوں میں پورا امتیاز کرنا لازمی ہے۔ مسئلہ ارتقا کا یہ اصول کہ حیوانات نقل مکان کرنے کے بعد اپنے ابنائے وطن کی صورت سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو بالکل ناممکن قرار دیتا ہے کہ ان جانوروں کے توالد و تناسل سے جو پہلے ہی مختلف ہیں ایک نئی اور اعلے قسم کے جانور پیدا ہو جائیں۔ فی الواقع سب جانتے ہیں کہ قدرت نے دوغلوں کو بانجھ اور عقیم بنا کر ہمیشہ کے لئے اس قسم کے توالد و تناسل کو روک دیا ہے۔ اور ایک سے دوسری قسم کے جانوروں کے پیدا ہونے کو دائمی طور پر ناممکن کر دیا ہے +

یہ اصول بہت عام ہے۔ صرف مسئلہ ارتقا ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ مثلاً علم الالسنہ ہی کو لیجئے۔ اس میں بھی مدتوں تک یہی غلط فہمی رہی علما تک یہی سمجھتے رہے کہ ایک زبان دوسری زبان سے نکلی [illegible] تک یہی کہا گیا کہ لاطینی یونانی سے نکلی ہے۔ پھر یہ خیال ہوا کہ لاطینی اور یونانی دونوں سنسکرت سے نکلی ہیں۔ کبھی سمجھتے تھے کہ عربی عبرانی کی شاخ ہے۔ کبھی کہتے تھے کہ عبرانی کلدانی سے ماخوذ ہے۔ غرض تمام مسئلہ اور [illegible] بحث کو خلط ملط اور گڈمڈ کر رکھا تھا۔ لیکن یہ کسی فلسفی کو خیال نہ آتا تھا کہ ممکن

Marfat.com

ہے کہ کوئی تاریخی زمانے سے پہلے کی زبان ہو جس سے تمام آریائی زبانیں آہستہ آہستہ بدلتے بدلتے اس قدر مختلف ہوکر موجودہ صورتوں میں آگئی ہوں۔ بہرحال آخرکار یہ خیال آیا اور علم الالسنہ کی صحیح اور مضبوط بنیاد پڑی۔ اب مبتدی بھی جانتے ہیں کہ کوئی زبان کسی موجودہ زبان سے نہیں نکلی۔ بلکہ سب آپس میں چھوٹے بڑے بھائی بہن ہیں۔ جو آخر میں جاکر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا آپس میں ایک دوسرے سے ماخوذ ہونا ناممکن ہے۔

بعینہٖ یہی کیفیت مسئلہ ارتقا کی ہے۔ عوام ہی نہیں بلکہ علما تک بھی اسی غلطی میں پڑ گئے تھے۔ جن کی بڑی مشکل سے اصلاح ہو سکی۔ اس مسئلے کی بحث کے متعلق سینکڑوں کتابیں ہیں کہ ہر ایک کے صفحے انہیں مذکورہ دونوں غلطیوں سے بھرے پڑے ہیں۔ یہاں ہم پھر ایک دفعہ تاکید کرتے ہیں کہ مسئلہ ارتقا روح کے وجود کو مان کر اپنی بحث شروع کرتا ہے۔ اور مختلف قسم کے جانوروں کے توالد و تناسل سے نئی قسموں کے پیدا ہو جانے سے بالکل انکار کرتا ہے۔ ان دونوں باتوں کو خارج کر کے اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ مسئلہ کہتا کیا ہے؟ مگر اس تشریح سے پہلے اگر ہم اس کی ابتدا کے زمانے کے حالات اور خیالات کا مختصر سا ذکر کر دیں تو زیادہ مناسب ہے کیونکہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں۔ کہ ارتقا کا مسئلہ خود انسانی خیالات کے ارتقا کی ایک مثال ہے۔ اور اس کی توضیح کے لئے اس سے پہلے کے حالات جن سے یہ پیدا ہوا ہے لکھنے ضروری ہیں۔

قانون قدرت طرز عمل کے اس نئے مسئلے کے دریافت کرنے والوں کو ان کے پیدا ہونے سے مدتوں پہلے اس کام کے قابل بنا رہے تھے۔ آخر وقت آگیا کہ پرانے عقائد نئے خیالات کو جگہ دیں۔ سب سے پہلے ڈسکارٹیز نے یہ خیال ظاہر کیا کہ مادی دنیا کی جاندار اور بے جان اشیا کل کے پرزوں کی طرح مختلف قاعدوں کی پابند ہیں۔ اور ان قاعدوں کے جان لینے سے نظام کائنات سمجھ میں آسکتا ہے۔ تاریکی اور جہالت کا زمانہ ختم ہو ہی چکا تھا۔ خوردبین کی ایجاد اور زیادہ گہرے کیمیائی امتحانوں سے جانوروں کے جسم کی

ساخت اور رگ پٹھوں کی بناوٹ پر زیادہ روشنی پڑی۔ اور ان سے یہ معلوم ہؤا کہ ہر جاندار کے اپنے ابتدائی جرم یا بیج سے انتہائی جسم تک ترقی کرنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ جب اس داستان کی چھان بین ہوئی تو یہ معلوم ہؤا کہ ہر درخت اور ہر جانور کی زندگی کی داستان بالکل یکساں ہے۔ اس حقیقت سے ان عظیم الشان اور وسیع قانونوں کا نشان ملا۔ جن کا پہلے سان گمان بھی نہ تھا۔ تحقیقات کرتے کرتے یہ بھی پتہ لگا کہ فرد اور نوع کی زندگی میں بھی ایک گونہ لگاؤ اور مشابہت ہے۔ غرض یہ بات ایک حاوی قانون کا سراغ دیتی تھی۔ اس کے بعد یہ دریافت ہؤا کہ نہایت ہی مختلف طبیعتوں اور ناموافق عادتوں کے حیوانات میں بھی جسم کا ڈھانچہ اور نظام بالکل ایک ہی ڈھنگ کا ہے۔ اور جو کچھ فرق ہے بھی وہ ایسا ہے کہ اس کا محض اختلاف عادات اور انقلاب حالات سے پیدا ہو جانا ممکن ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض جانوروں کے جسموں میں ایسے حصے یا عضو ہیں جو ان کی موجودہ حالت میں غیر ضروری اور بیکار ہیں۔ اور اسی لئے گھٹ گھٹ کر محض برائے نام رہ گئے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ایک زمانہ تھا جب یہ جانور اس طرح کی زندگی بسر کرتے تھے۔ جس میں وہ خاص عضو کارآمد تھا۔ یہ بھی آزمایا گیا کہ جانوروں کی عادتیں یا ان کے رہنے کی جگہ بدل دینے سے ان کی صورت بھی بدلنے لگتی ہے۔ اور آخر الامر ان مختلف تجربوں کی اثنا میں علم طبقات الارض۔ نے آثار محفورۂ متحجرہ کی جماعت بندی کا کام مکمل کر کے ان کو بالکل مرتب کر دیا۔ جس سے ایک اعلےٰ قسم کے جانوروں کا اسی قسم کے زیادہ سادہ ساخت اور ادنےٰ درجے کے جانوروں کی ترقی یافتہ صورت ہونا عملاً ثابت ہو گیا۔ اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ دنیا میں آثار حیات کی تاریخی زمانے سے پہلے کی تاریخ انقلاب۔ تغیر و تبدل اور ارتقا کی ایک داستان تھی +

یہ سب اصول و مسائل تمام اٹھارویں صدی میں متحقق ہوتے رہے۔ اور آخر انیسویں صدی کے وسط میں ان پر اتنا کافی غور و خوض ہو چکا تھا۔ کہ ان سے عام اور حاوی قانون نکالنا ممکن بلکہ واجب اور مناسب معلوم ہؤا

Marfat.com

علم تشریح اور علم الابدان کے متعلق قدما کی ناواقفیت تعجب انگیز ہے۔ زمانۂ قدیم کے بڑے بڑے فلاسفہ اور حکما بھی جسم انسان کی ساخت سے محض ناآشنا تھے۔ اگرچہ یہ جسم ہی تمام قوائے باطنی کا مرکز اور تمام حواس ظاہری کا ماخذ ہے۔ اور قیاس چاہتا ہے کہ تمام اشیائے کائنات میں سب سے پہلے اسی ضروری اور کام کی چیز کی چھان بین کی جائے۔ یونان کے حکما اور علما۔ روما کے مدبّر اور مفنّن۔ علم ہیئت کے بانی بوڑھے کلدانی۔ اور توریت اور زبور لانے والے بنی اسرائیل کے بزرگ۔ وہ پرانے شاعر جو ویدوں کے بھجن گایا کرتے تھے۔ وہ قدیم پجاری جو اوسرس اور اسس کے اسرار بتایا کرتے تھے سب کے سب جسم حیوانی کے نہایت سیدھے سادے انتظام سے بھی ناواقف تھے۔ انسان کا جسم ایک راز تھا۔ اور اس کی بابت اکثر رائیں خام تھیں اور بعض سراپا غلط ٭

قدما کی اس ناواقفیّت کا بھید سمجھ میں نہیں آتا۔ نہایت معمولی حادثوں اور انقلابوں سے وہ لوگ بہت کچھ سیکھ سکتے تھے۔ یہ سن کر تعجب ہوتا ہے۔ کہ باوجود اپنے اتنے علم و فضل کے بھی ہمارے بزرگ ہضم غذا یا دوران خون جیسی معمولی بات سے بھی آگاہ نہ تھے۔ یہ تاریکی قرون وسطےٰ میں بھی بحال رہی۔ بلکہ بیہودہ توہّمات اور جاہلانہ ضعیف الاعتقادی "سمند ناز پہ ایک اور تازیانہ ہوا" چونکہ یہ اہم مسئلہ ارتقا جو تمام دنیا کے اختلاف انواع و اقسام اور تمام حیوانات کی گوناگونی اور بوقلمونی کے اسباب بواعث بیان کرنیکا دعوےٰ رکھتا ہے۔ اصل میں ان انقلابات کو دیکھکر وضع کیا گیا ہے جو ہر ایک جاندار چیز کی ابتدا سے انتہا تک پائے جاتے ہیں۔ اس لئے توضیح کے واسطے ہم زندگی حیوان کی مختصر کیفیّت بیان کرتے ہیں ٭

ہر ایک ذیحیات چیز ایک نہایت ہی چھوٹے سے مادی ذرے سے بنتی ہے۔ سائنس کی باریک سے باریک آزمائش اور نازک سے نازک امتحان بھی اس ذرے اور آیندہ بننے والی چیز میں کوئی مشابہت یا لگاؤ تک نہیں پاتے۔ یہ زندہ ذرہ جو نشو و نما پانے سے ایک نہایت ہی پیچیدہ

جسم بننے والا ہے جرم کہلاتا ہے۔ اور اپنی ابتدائی حالت میں زندہ مادے کا محض ایک ذرا سا بیج ہوتا ہے جس میں بڑھنے اور پھیلنے اور آخر میں ایک خاص جیتا جاگتا جسم بن جانے کی پوشیدہ قابلیت ودیعت رکھی گئی ہے۔ حقیقت میں یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں کہ یہ جرم زندہ بھی ہوتا ہے یا نہیں شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہو کہ اس میں حیات کی بھی صرف قابلیت ہے۔ واقع میں جاندار نہیں ہے۔ بہر حال جرم اور محض بے جان مادے کے ایک بیج میں عمدہ سے عمدہ خوردبین۔ اور نازک سے نازک کیمیائی امتحان بھی کوئی فرق نہیں دکھا سکتے۔ شاید یہ رائے زیادہ صحیح ہو کہ ہر جرم جو نشو و نما کی قابلیت رکھتا ہے۔ وہ خود کسی نشو و نما یافتہ جاندار چیز کا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "جان جان سے ہی پیدا ہوتی ہے" کیونکہ جب تک یہ ایک صفت نہ ہو تب تک مادے کا کوئی بیج جرم سے خواہ کتنا ہی مشابہ کیوں نہ ہو۔ نشو و نما نہیں پا سکتا +

سائنس نے بہت سی مختلف چیزوں کے اجرام کی بڑے غور سے آزمائش کی ہے۔ اور ان کی ماہیت کو نہایت احتیاط سے دریافت کیا ہے۔ زندہ بیج ایک کیمیائی مرکب سے پر ہوتا ہے۔ جسے پروٹین کہتے ہیں کیمیائی امتحان کرنے پر اس میں آکسیجن ہائڈروجن۔ کاربن اور نائٹروجن کے اجزا اور ذرا ذرا سی گندھک اور فاسفورس بہت سے پانی میں تیرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ مرکب صرف جاندار اشیا میں ہی پایا جاتا ہے۔ عام طور پر ان سے الگ نہیں ملتا۔ اس سے بھی یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ "اَلْحَیَاتُ بِالْحَیَات جان جان سے پیدا ہوتی ہے"۔ بہر حال یہ ہے وہ جرم جس سے جاندار پیدا ہوتے ہیں۔ اس سے جانوروں کی ہستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ اور اس کے آگے اس جانور کی پیدائش کی داستان طرح طرح کے عملوں یا رنگ رنگ کی تبدیلیوں اور وضع وضع کے انقلابوں کی یا یوں کہیئے کہ ارتقا کی داستان ہے۔ سب سے پہلی تبدیلی محض بڑھنا ہے۔ جرم کی جسامت بڑھنے لگتی ہے۔ اور یہی اس کی زندگی کی پہلی علامت ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

مادے کا ذرہ حقیقت میں جرم ہے۔ یہ بڑھنے کی طاقت بھی جرم کی ذاتی ہوتی ہے خیر کچھ عرصے تک یہ بڑھنا یکساں جاری رہتا ہے۔ یعنی جسامت کے سوا اور کسی کیفیت میں فرق نہیں آتا۔ ترقی کا دوسرا زینہ یہ ہے کہ اس بیج کے بیچوں بیچ میں ایک طرح کی تناوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے اس کی تقسیم سی ہونے لگتی ہے۔ اور آخر میں ایک کی جگہ دو بیج پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر چونکہ تقسیم کامل نہیں ہوتی اس لئے دونوں بیج الگ الگ نہیں ہوتے (جیسے کوئی ربڑ کے پھکنے کو بیچ میں سے ڈھیلے ڈورے سے باندھ دے اور پھر پھلا دے تو بعینہٖ یہی کیفیت پیدا ہو گی) یہ دونوں نو پیدا شدہ ٹکڑے اصل بیج کی صورت اور حالت اختیار کر لیتے ہیں۔ اور بالکل الگ الگ نہ ہونے کی وجہ سے درمیانی مادہ دونوں میں مشترک رہتا ہے۔ آخر ان دونوں پر پھر وہی حالت طاری ہوتی ہے۔ جو اصل بیج پر ہوئی تھی۔ دونوں کے بیچ میں تناؤ ہوتی ہے۔ اور اسی قسم کی ادھوری تقسیم سے دو ٹکڑوں کے چار ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اور پھر چار کے آٹھ اور آٹھ کے سولہ۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ مگر ان میں سے ہر ایک ٹکڑا ہر طرح اپنے اصل بیج کی تمام کیفیات قائم رکھتا ہے۔ آخر اس سے مکمل بیج بن جاتا ہے۔ جو ابتدائی جرم اور انتہائی جسم کے درمیان میں پہلا زینہ ہے +

یہاں خواہ مخواہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ جرم بڑھتا کیونکر ہے۔ اور اس زیادتیٔ حجم کا مادہ کہاں سے آتا ہے یقیناً عالم نیستی سے تو نہیں آتا۔ بیج میں خوراک لینے کی طاقت ہے۔ اس کے جاندار ہونے کا مطلب ہی یہی ہے۔ یہ اپنی خوراک کو کھینچتا اور جذب کرتا ہے۔ اور اسی سے بڑھتا اور پھیلتا پھلتا ہے۔ لیکن یہ خوراک خود اس کے اجزا میں تقسیم نہیں ہوتی بلکہ ہضم ہو کر ان کا جزو بن جاتی ہے +

ترقی کا تیسرا زینہ یہ ہے کہ یہ مکمل بیج مختلف تبدیلیوں کے بعد مضغہ (Gastrula) بن جاتا ہے یہ تبدیلیاں بالکل عام فہم نہیں ہیں۔ اور کتب تشریح میں عام طور پر مذکور ہیں۔ اس لئے ان کی پیچیدگیوں میں پڑنے کی ضرورت

Marfat.com

نہیں۔ یہ کہنا کافی ہے کہ اس مضغے کی پیدائش کے بعد آیندہ ہونے والے جسم کے مختلف اعضا مثلاً بیرونی جلد۔ گوشت پوست اور رگیں وغیرہ بننی شروع ہو جاتی ہیں۔ خورش یا تو ماں کے جسم سے۔ یا آس پاس کے مناسب مادّوں سے اخذ کی جاتی ہے۔ جسامت بڑھتی جاتی ہے۔ اور آخر مختلف مدارج کے بعد جنین آئندہ بننے والے جانور کی مکمل صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بیرونی دنیا میں آنے کے لائق ہو جاتا ہے۔ اس کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ بعض جانور انڈے دیتے ہیں۔ جن کو مناسب جگہ رکھ کر حرارت پہنچائی جاتی ہے۔ یہ حرارت عموماً ماں باپ کے جسم سے لی جاتی ہے یا قدرتی اسباب اسے بہم پہنچاتے ہیں۔ اس کی تکمیل کے بعد اوپر کا چھلکا پھٹ جاتا ہے۔ اور نیا جانور نئی دنیا میں آجاتا ہے۔ بچہ جننے والے جانوروں میں یہ تمام ترقی ماں کے رحم ہی میں مکمل ہوتی ہے۔ اور اس کی تکمیل کے بعد بچہ اپنی ہستی کے ابتدائی زینے پر پہنچ کر ماں کے پیٹ سے الگ اور آزاد ہو جاتا ہے۔ فرد کی زندگی کے متعلق یہ تمام باتیں اتنی عام اور معمولی ہیں کہ اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اور ان کی تحقیق بھی کچھ ایسی بالکل نئی نہیں ہے۔ لیکن یہ نئی تحقیق ہے کہ تمام مختلف جانوروں میں جنینی کیفیت کے تغیر و تبدل واقع میں یکساں ہیں۔ تمام ذیحیات اشیا کے اجرام کی ابتدائی نشوونما ایک ہی طرز کی ہے۔ اور اسفنج سے لیکر اشرف الحیوانات انسان تک ابتدائی جرم اور انتہائی جسم کے تمام مدارج انقلاب ایک ہی قسم کے ہیں۔ مسئلہ ارتقا کو افراد سے انواع پر منتقل کرنے اور پھر رفتہ رفتہ تمام اشیا سے کائنات پر حاوی کردینے میں یہ تحقیقات پہلا زینہ ہے۔ دوسرا زینہ بھی اسی سے [illegible] اور وہ اس تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ مختلف قسم اور مختلف طرح کے حیوانات کی جرمی اور جنینی زندگی کے انقلابات ہی یکساں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی جسمانی ساخت بھی اصل میں ایک ہی وضع کی ہے۔ اور جو کچھ فرق ہے۔ وہ صرف مختلف عادتوں کے اختیار کر لینے یا جدا جدا حالتوں میں رہنے سہنے سے پیدا ہوگیا ہے۔ ظاہرا مختلف قسم کے جانوروں کی بناوٹ میں بڑا بھاری

Marfat.com

فرق نظر آتا ہے۔ اور مذکورہ مسئلہ لچر اور لغو معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ ان کے باہمی اختلاف یا اتفاق کا معیار محض بینائی یا لمس کو قرار دیا ہے۔ جب تک نئے ایجاد کردہ آلات کی مدد سے سائنس کے اصول کے مطابق اس کا امتحان نہ کیا جائے۔ تب تک ان قدرتی قوانین کے اصل اصول کا پتہ لگنا آسان نہیں ہے۔ دیکھنے میں تو فی الواقع مچھلی کو کبوتر سے اور کبوتر کو اونٹ سے کچھ لگاؤ نہیں ہے۔ مگر سائنس کے اصول تحقیقات کے مطابق دیکھیں تو ان مختلف طبقوں کی بناوٹ میں مشابہت بڑھنے لگتی ہے اور مخالفت گھٹنے لگتی ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے فرق محض سطحی اور ظاہری بلکہ گمراہ کن ہیں۔ اور مشابہتیں اصلی اور حقیقی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ناواقف آدمی اس مسئلے پر ضرور تعجب کرینگے کہ کس قسم کی تحقیقات سے یہ بات معلوم ہوئی۔ مگر ہم علم تشریح کی طرف اشارہ کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ زیادہ تفصیل موجب تطویل ہے۔ تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانوروں کے ڈھانچے ہمصورت ہیں۔ اور پھر یہ صورت اور قسم کے جانوروں کے ڈھانچے کے مشابہ ہے۔ اسی طرح جہانتک تحقیقات کو پھیلاتے جائیں۔ یکسانیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہانتک کہ تمام جاندار چیزیں ایک ہی طرح کی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ اور محقق کو حیران کر دیتی ہیں۔ گویا قدرت کے کارخانۂ امکان میں ایک نمونے کے سوا اور کوئی نمونہ ہی نہیں تھا ؎

ندارد راز وحدت اختلافے درمیاں اینجا ۔ بود یکحرف ہمچون بوئے گل بر صد زباں اینجا
مبیں بکثرت صورت کہ گم کنی معنے ۔ ببیں کہ قالب چندین ہزار خشت یکیست
گواہی مید ہد عالم بوحدت ذات بیچوں را ۔ کہ خاصیت یکے باشد بچندیں جزو معجوں را

علم تشریح کے ان مسائل کا جو اثر دل پر ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم کو افراد کے ابتدائی جرم سے انتہائی جسم تک کے تمام حالات و انقلابات ایک اشارہ کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ تمام مختلف قسم کے جانوروں میں یہ کیفیات یکساں ہیں۔ اور زندگی کی ادنےٰ سے ادنےٰ مثال سے لیکر اعلےٰ سے اعلےٰ نمونے تک ان میں کچھ فرق نہیں ہے۔ اس سے آگے علم تشریح کی تحقیقات نے مختلف سے

Marfat.com

مختلف صورت اور مخالف سے مخالف عادت کے جانوروں کی جسمانی ساخت کو ہم صورت قرار دیا۔ ان باتوں سے یقینی طور پر ابتداءً تمام قسم کے حیوانات کی موافقت اور مشابہت کا پتہ ملتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اور نئی تحقیقات نے اس یکسانیت کے مسئلے کو اور بھی حاوی اور محیط کرنا چاہا ہے۔ سپیکٹروسکوپ یا مقیاس الاشعہ کے ذریعے سے نظام شمسی کے سیاروں کے علاوہ اور ثوابت کے اجزا بھی دریافت کئے گئے ہیں اور یہاں بھی انسان کی توقع کے خلاف جوابلا ہے۔ انسانی طبیعت کائنات میں گوناگونی۔ رنگارنگی اور نوعیت ڈھونڈھتی تھی (اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے) مگر دیکھا تو مخالفت کی جگہ موافقت نظر آئی۔ رنگارنگی کی بجائے یکرنگی دکھائی دی۔ نوعیت کے عوض یکسانیت معلوم ہوئی۔ اور کثرت کے بدلے وحدت ملی سیاروں میں اور ستاروں میں۔ نزدیک اور دور۔ یہاں اور وہاں۔ جہاں جہاں دیکھا وہی ہائڈروجن اور آکسیجن۔ کیلسیم اور سوڈیم سے ہی سابقہ پڑا۔ نشوونما شباب وشیب۔ حیات وممات۔ نسخ ومسخ۔ غرض کل نظم ونسق یہاں ہے۔ وہ وہاں ہے۔ جو وہاں ہے وہ یہاں ہے +

اسی طرح علم کیمیا کی ترقی بھی اسی طرف مائل ہے۔ نئی نے پرانی کو داخل دفتر کر دیا ہے۔ اور اس کا سب سے نمایاں فرق یہ ہے کہ پہلے کے بہت سے عنصر مرکب معلوم ہوئے اور ساٹھ ستر عنصروں کی بجائے صرف ۴۔ ۵ قسم کے خاص حرکات یا احساسات قرار دئے گئے۔ اور قیاس غالب ہے کہ چند دنوں میں اس میں بھی وحدت تک نوبت پہنچیگی۔ یہ مسئلہ کہ تمام دنیا کا "احساس کا دائمی امکان" یعنی مادہ حقیقت میں ایک ہی یا زیادہ سے زیادہ چند اجزا سے بنا ہوا ہے۔ توحید یا یکسانیت کے خیال پر بڑا زور دیتا ہے۔ اور اس کا یہ اثر ماوی دنیا تک ہی محدود نہیں ہے۔ بلکہ ذی حیات اشیا پر بھی کارگر ہے +

یہ کیفیت تھی سائنس کی تحقیقات کی جب ارتقا کا مسئلہ شائع کیا گیا۔ مگر خود اس کا مدار تجربے اور مشاہدے پر تھا۔ ڈارون سیاح اور واقعات فطرتی پر غور کرنے والا تھا۔ اس نے یہ بات اپنے دادا سے ورثے میں پائی تھی لیکن ۱۸۶۱ء

Marfat.com

میں اس نے اپنی کتاب "نسب انسان" شائع کی۔ جس میں یہ مسئلہ پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ اور معلومہ واقعات اور مشاہدے سے اس کو ثابت کیا تھا۔ ڈارون نے حیوانات اور نباتات کی مختلف کیفیتوں کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا۔ اور اس کے نتائج ادنےٰ درجے کے حیوانات سے بلند ہوتے ہوئے اعلےٰ طبقہ اور آخر انسان تک پہنچکر تمام جاندار اشیا کو ایک قانون کے رشتے میں منسلک اور منتظم کرتے تھے +

باب دوازدہم

مسئلۂ ارتقا

اب یہ دیکھنا ہے کہ یہ مسئلہ ہے کیا؟ اس کا پہلا خیال یہ ہے کہ حیوانات کے تمام اعلےٰ طبقے جن میں انسان بھی شامل ہے۔ اس پرانے ادنےٰ اور نایاب درجے کے جانوروں کے ترقی یافتہ اور بہترین نمونے ہیں جو کشاکش ہستی میں ان کا مقابلہ نہ کرسکے اور معدوم ہوگئے۔ ڈارون نے اس کا نام انتخاب قدرتی رکھا ہے۔ جب وہ پالتو جانوروں کی خوبو پر غور کررہا تھا۔ تو اس نے دیکھا کہ ان کے رکھوالے توالد وتناسل کے لئے سب سے اچھے جانوروں کو چھانٹ لیتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آئندہ نسل میں اس چنی ہوئی نسل کے بچوں کی تعداد باقیوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور ان میں وہ خوبیاں جو اس انتخاب کا باعث تھیں۔ اور بھی زیادہ نمایاں اور مستحکم ہوجاتی ہیں۔ اور روز بروز ترقی کرتی جاتی ہیں۔ پالتو جانوروں کی اکثر قسمیں اسی عاقلانہ انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ اس مشاہدے سے ڈارون نے انتخاب کا خیال اور لفظ حاصل کیا۔ مگر سوال یہ تھا کہ آیا وحشی جانور بھی جو انسان کے اس عاقلانہ انتخاب کے زیر اثر نہیں ہیں اس پر کاربند ہوتے ہیں یا نہیں۔ اس کی تحقیق کے لئے ڈارون نے قدرت

Marfat.com

کے وسیع جنگلوں میں اپنے مشاہدے شروع کئے اور آخر دیکھتے دیکھتے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہاں بھی انتخاب کا قانون اسی طرح کارگر ہے۔ اور تمام جانوروں کی موجودہ قسموں کی صورت و سیرت زیادہ تر اسی سے متاثر ہوتی ہے۔ یوں اس نے دیکھا کہ دنیا میں ایک قدرتی انتخاب پایا جاتا ہے۔ جس سے ہر قسم کے زندہ جانوروں میں سے بہترین نمونے لے کر باقی چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ اور ان کی خوبی کا معیار ان کی آس پاس کی کیفیات ہیں۔ یعنے ہر زندہ جسم کو اس کی طاقتیں کم و بیش قدرۃً دنیا میں رہنے کے لائق بناتی ہیں۔ ہر جانور کو اس کے قوے اور اعضا ایک خاص حد تک اس کو سامان خورش بہم پہنچانے کی قابلیت دیتے ہیں اور ہر جاندار میں قدرۃً دنیا میں رہنے کی طاقتیں۔ سامان خورش مہیا کرنے کی لیاقتیں اور آرام اور رفاہ کے اور دیگر طبعی خواہشات اور فطری جذبات کی خاطر خواہ تکمیل کے پھسلوان میدان میں جمنے کی قابلیتیں کم و بیش اور در مختلف درجے کی ہوتی ہیں۔ پس جن میں کسی وجہ سے یہ باتیں زیادہ ہوتی ہیں وہ کشاکش زندگی کے معرکے میں جیت جاتے ہیں۔ اور انہی کے کمزور بھائی بند پیچھے رہتے رہتے آخر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر نہیں اٹھتے ۔

یہ مسئلہ ارتقا کا ایک رکن رکین ہے۔ اسی کا نام قدرتی انتخاب یا انتقاے بہترین ہے۔ ڈارون کہتا ہے "یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ جانداروں کے ایک دوسرے سے اور قدرتی کیفیات حیات سے باہمی تعلقات نہایت ہی پیچیدہ اور وابستہ ہیں۔ لہذا ذرا سا اختلاف جسمانی بھی ان پر نہایت موثر ہو سکتا ہے۔ جب خود انسان کے لئے ذرا ذرا سے فرق مفید یا مضر ثابت ہو چکے ہیں۔ تو اس میں کیا تعجب ہے کہ اسی طرح کے تھوڑے تھوڑے سے فرق ہر قسم کے جانوروں میں بھی واقع ہو کر کشاکش ہستی کا فیصلہ ادھر یا اُدھر کر دیتے ہوں۔ کیونکہ جب فرق کو مان لیا تو پھر جو جانور ذرا سی بھی فضیلت رکھتا ہو گا۔ قیاس غالب ہے۔ کہ انتقاے نسل میں بڑا حصہ وہی لیگا۔ اور جس میں ذرا سا بھی نقص ہو گا۔ اس کی نسل منقطع اور ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جائیگی۔ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ دنیا میں اس قدر افراد پیدا ہوتے ہیں کہ ان سب کا رہنا امکان سے باہر ہے۔ اس

Marfat.com

محاسن کے ابقا اور قبائح کے ازالہ کا نام میں نے "قدرتی انتخاب" یا "ابقائے بہترین" رکھا ہے"۔

اس مسئلے کے ضمن میں قانون اختلاف خود بخود آجاتا ہے۔ کیونکہ جب تک اختلاف نہ ہو تب تک انتخاب ہو ہی نہیں سکتا۔ نہ قدرتی نہ مصنوعی۔ مگر اختلاف تو عام اور قدرتی بات ہے۔ اور اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا۔ جانوروں میں مشابہت کی بجائے مفارقت ہے۔ یکسانی کی بجائے گوناگونی ہے۔ مگر یہ یاد رہے اور یہ فرق گوناگونی اصلی ساخت میں نہیں ہے۔ بلکہ صرف بیرونی اعضا اور خط و خال میں ہے۔ ہر ایک قسم کے مختلف افراد ظاہری فرق کی وجہ سے باہم ممیز و ممتاز ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں مشابہت تام صرف نام ہی نام ہے۔ ایسے دو توام بھائیوں کا وجود بھی محال ہے۔ جن کی ساخت۔ سیرت اور صورت میں مطلق کچھ فرق نہ ملے۔ والدین کی یگانگت یا قدرتی حالات پیدائش کی موافقت کیسی ہی قوی کیوں نہ ہو۔ پوری مماثلت پیدا نہیں کر سکتی۔ قدرت اپنی لامحدود پیدا کردہ چیزوں میں سے کسی ایک کا بھی پورا اعادہ کرنا نہیں چاہتی۔ یعنی اس عظیم الشان کارخانے میں وراثت کے ذرے بھی بعینہٖ یکساں نہیں ہیں جس احتیاط سے وحدت کو مدنظر رکھا ہے۔ اسی توجہ سے کثرت کو پیش نظر کیا ہے۔ اس واسطے جب ذیحیات اشیا پردۂ عدم سے میدان وجود میں آتی ہیں تو الگ الگ طاقتیں اور جدا جدا کیفیتیں لاتی ہیں۔ بظاہر یہ فرق خواہ کتنا ہی خفیف کیوں نہ ہو۔ لیکن معیار اتنا لطیف ہے۔ کہ ایک ایک کو پرکھ لیتا ہے۔ اور ذرّے ذرّے کو دیکھ لیتا ہے +

ارتقا کے مسئلے میں یہ باتیں بنیادی پتھر ہیں۔ خلقی طاقتوں کی نابرابری سے آئندہ کے نمایاں اختلافوں کا پتہ چلتا ہے۔ ہر قسم کے افراد میدان حیات بہم پہنچا کر اپنے آپ کو اس سخت امتحان کے لائق بنانا شروع کرتے ہیں۔ مگر زیادہ طاقتور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اور ان کی کامیابی ہی ان قوتے کو جن سے کامیابی حاصل ہوا کرتی ہے۔ ان کی نسل میں دائمی اور روز افزوں بنا دیتی ہے۔ کیونکہ طاقت اور کامیابی کی وجہ سے وہ توالد و تناسل میں زیادہ

حصہ لیکر اپنی ازدیاد نسل کا باعث ہوتے ہیں۔ اور ان کی اولاد میں وہی طاقتیں موروثی ہوکر دن دونی رات چوگنی بڑھتی جاتی ہیں۔ یوں قوانین فطرت کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ اور جانوروں کو تکمیل کی خاص خاص صورتوں کی طرف لئے جاتا ہے۔ مگر وہ جو کمزور تھے ان کا کیا حشر ہؤا؟ ظاہر ہے کہ یا تو وہ بالکل مٹ گئے۔ یا ان کے کامیاب بھائی بندوں کی اولاد نے ان کو اس موروثی رہائش گاہ سے نکال دیا۔ اور ان کو نقل مکان کرکے اور جگہ جانا پڑا۔ جہاں ممکن ہے کہ کیفیات زندگی ان کے وطن سے بہت کچھ مختلف ہوں ٭

اس مسئلے کی توضیح کے لئے شاید چند واقعی مثالیں بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہو۔ مثلاً پھولدار درختوں کے اس وسیع حصے کو لیجئے جن کی نسل افزائی زرگل کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اس لئے جو چیز زرگل کو زیادہ پراگندہ کرتی ہے وہ اس خاص قسم کے پودوں کی بہبودی اور ترقی میں ساعی ہے۔ یہ کام اکثر چھوٹی چھوٹی تیتریاں اور بھونرے کرتے ہیں۔ جو پھول پھول پر اڑتے پھرتے ہیں اور نادانستہ تخم ریزی بھی کرتے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کو اس بات سے کچھ سروکار نہیں ہوتا وہ خود اپنی دھن میں لگے ہوتے ہیں۔ یعنی تلاش معاش اور گردآوری خوراک۔ پھولوں میں شہد ہوتا ہے جس کی لالچ ان ننھے ننھے پرندوں کو کھینچ لاتی ہے۔ اور قدرت حقیقی ان کو شہد دے کر ان سے تخم ریزی کا کام لیتی ہے (سبحان اللہ کیا شان ایزدی ہے خواہ کوئی شخص کتنا ہی کور باطن اور کوڑھ مغز کیوں نہ ہو۔ ممکن نہیں کہ اس نہایت ہی عجیب و غریب اور بے مثل انتظام اور کارپردازی کو دیکھ کر عش عش نہ کرے اور شان الٰہی پر قربان نہ ہو) یہ بات صاف ہے کہ جس قسم کے پھولوں میں یہ شیریں مادہ زیادہ ہوگا اسی پر زیادہ بھونرے آئینگے۔ اسی کا زرگل زیادہ پھیلیگا۔ اور وہی زیادہ پھولے پھلے گا۔ اور جس قسم کے پھولوں میں یہ دل کش شہد کسی وجہ سے کم ہوگا۔ اسی کی طرف تیتریوں کی توجہ کم ہوگی۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری نسل میں وہ دل کش قسم تمام میں پھیل جائیگی۔ اب اس عمل کا تسلسل یقینی بات ہے۔ اور اس قسم کا روز بروز زیادہ پھیلنا ظاہر

Marfat.com

ہے۔ ممکن ہے کہ ترقی کی رفتار دھیمی ہو۔ مگر رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ اس کا پھیلنا، اچھی جگہیں گھیر لینا ۔ حریفوں سے بڑھ جانا اور آخران کو بالکل نکال کر ابقائے بہترین کی مثال بن جانا ضروری اور قطعی ہے۔

عالم حیوانات میں اس کا اثر اور بھی زیادہ ہے۔ اور کشاکش ہستی کے گھمسان کا میدان یہی ہے۔ کیونکہ اگر قدرت کثرت حیوانات کو اس کے ذریعے سے کم نہ کرے تو سطح زمین پر نباتات وغیرہ کا ٹھکانا نہ رہے۔ اور اس کے ساتھ پھر جانوروں کا کھانا نہ رہے۔ اس لئے حیوانات میں یہ کشاکش ہستی ہمیشہ چلی جاتی ہے۔ اور اس کی تین صورتیں ہیں :-

(۱) ایک ہی قسم کے افراد کی باہمی لڑائی بھڑائی +

(۲) ایک قسم کے افراد کا دوسری قسم کے افراد سے مقابلہ +

(۳) افراد یا انواع کی آس پاس کی کیفیات جسمانی سے کشمکش +

سب جانتے ہیں کہ قدرت ہر قسم کے جانداروں کے اجرام اور توالد و تناسل کے اسباب مہیا کرنے میں نہایت فیاضی اور فضول خرچی سے کام لیتی ہے۔ جانور اتنے پیدا ہوتے ہیں کہ سب کا رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ بعض قسم کے درختوں کے بیج اتنے بے حد زیادہ ہوتے ہیں۔ کہ اگر نہایت کثرت سے ضائع نہ ہو جایا کریں۔ تو چند دن ہی میں دنیا کے پردے پر ان درختوں کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہ دے۔ اس طرح گویا کشاکش ہستی اجرام ہی میں شروع ہو جاتی ہے۔ اور مرکر ہی ختم ہوتی ہے۔ یہی حال بری اور بحری جانوروں کا ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ایک ایک کوڈ (Cod) مچھلی ہر موسم میں تیس تیس لاکھ انڈے دیتی ہے۔ اگر نہایت زود اثر اور کارگر طریقوں سے ان کی بہتات کو نہ روکا جاتا تو چند دنوں میں بحر ظلمات ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پٹ کر امریکہ و یورپ میں ان مچھلیوں کا زندہ پل بن جاتا۔ خرگوشوں اور بٹیروں وغیرہ کا بھی بعض ملکوں میں یہی حال ہے۔ اب قدرتی انتخاب کے ان طریقوں کو دیکھنا چاہئے۔ جن سے یہ کثرت حیوانات روکی جاتی ہے۔ کشاکش ہستی جانوروں کی ہستی کے ساتھ شروع ہوتی

Marfat.com

ہے۔ اکثر انڈے برباد ہو جاتے ہیں۔ اول تو اور بہت سے جانور ہی ان کی جان کے دشمن ہیں۔ ان سے بچے تو آندھی اور طوفان سے پالا پڑا۔ موسموں کی سختی اجرام سے لیکر مکمل اجسام تک کو نہیں چھوڑتی۔ ۱۹۰۵ء کی سی ایک ہی سردی دور دور کے درختوں اور قسم قسم کے جانوروں کو برباد کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ایسے کڑے امتحانوں سے وہی بچتے ہیں جو سب سے اچھے اور طاقتور ہوں۔ اور یہی آیندہ نسلوں کے ابوالآباء ہوتے ہیں۔ مگر ابھی ہم کو پہلے ہم جنس افراد کی خانہ جنگی کو دیکھنا ہے۔ سچ یہ ہے کہ قدرت کا مطالعہ کرنے والے کو اس سے زیادہ بے رحمی اور بے دردی کی مثال اور کوئی نہیں ملتی۔ اس پر غور کرنا بہت ہی جانکاہ اور دل شکن ہے۔ یہ ظالم اور مظلوم کی لڑائی کی داستان ہے۔ جس میں ظالم ہمیشہ در رہتا ہے طاقتور کمزور کے منہ کا لقمہ چھین لیتا ہے۔ اور وہ غریب منہ دیکھتا اور ترستا کا ترستا رہ جاتا ہے۔ اس میں نہ رحم ہے نہ ہمدردی اور آخر میں پشیمانی اور ندامت بھی نہیں۔ ماں باپ کچھ دن تک اپنے بچوں کو پالتے ہیں۔ مگر یہ تعلق چند روزہ ہے۔ بڑے ہوئے پیچھے ہمدردی اور غمخواری کیسی شناسائی تک نہیں۔ ہماری اپنی نوع میں ہی کشاکش ہستی کے ظلم و ستم۔ بے رحمی اور سنگدلی کی مثالیں تاریخ کے ہر صفحے پر ملتی ہیں۔ گویا کوئی شخص با آواز بلند تمام عالم حیوانات میں اس حاوی قانون کا اعلان کر رہا ہے کہ طاقتور آباد اور کمزور خانہ برباد ہے۔ مختلف الجنس افراد کی لڑائی کی مثالوں سے عالم پُر ہے۔ عالم نباتات میں مثال کے طور پر ہم دیکھ ہی چکے کہ کیونکر ایک قسم دوسری قسم کو مٹائے دیتی ہے۔ یہی حال سب کہیں ہے۔ کائی سے لیکر پیپل اور بڑھ تک ہر ایک قسم باقی قسموں کو نکال کر ساری جگہ خود ہی گھیرنے کے درپے ہو رہی ہے اور دنیا کی نباتات کی تاریخ میں جنگلوں کے جنگل یوں ہی ادل بدل ہو جاتے ہیں۔ عالم حیوانات میں ایک نوع دوسری نوع کو کھائے جاتی ہے۔ چیونٹی سے لیکر ہاتھی تک اور مچھر سے لے کر آدمی تک سب ایک دوسرے کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔

Marfat.com

درندے چرندوں کو شکار کرتے ہیں۔ پرندے پرندوں سے پیٹ بھرتے ہیں۔ مچھلیاں آپس میں ایک دوسرے کو کھا کر گزارا کرتی ہیں۔ اور حشرات الارض بڑے بڑے جانوروں کو ہڈیوں کی مالا اور محض ڈھانچہ ہی ڈھانچہ بنا دیتے ہیں۔ غرض جہاں جائیں وہی نفسی نفسی کی دھوم مچ رہی ہے۔ انقلاب اور ارتعاش کی لہریں تمام عالم ہستی میں پھیل رہی ہیں۔ جانوروں پر ہی نہیں بلکہ نباتات پر بھی ان کا اثر یکساں ہے۔ اور ان کی وجہ سے تمام جاندار چیزیں باہم وابستہ اور پیوستہ ہو رہی ہیں۔ آدمی سیر دیکھنا چاہے تو دنیا کا میدان کارزار سامنے ہے۔ جہاں جائیگا یہی تماشا پائیگا۔ اور یہی کشاکش کا نظارہ نظر آئیگا فاعتبروا یا اولی الابصار ان سب پر طرہ یہ ہے کہ قدرتی اسباب بھی ان کی بہتری اور بہبودی میں سدّ باب ہیں سہ

ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز — شکستہ لنگر کشتی و ناخدا خفت است

دنیا کے بعض حصّوں میں اور بالخصوص شمال کی طرف شدت سرما نباتات کو بڑھنے ہی نہیں دیتی۔ اس لئے جانور بھی کمیاب ہیں۔ بعض حصوں میں قدرتی اسباب سے آثار حیات پہلے کمزور ہونے لگتے ہیں۔ اور رہ ہوتے ہوتے آخر بالکل مٹ جاتے ہیں۔ اور ان اسباب کی مخالفت تو ہر جگہ ظاہر ہے۔ قدرت آثار حیات کو پیدا تو کرتی ہے مگر ان کے قیام اور بقا کو روکتی اور دشوار کرتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو بالکل جلّادہی بن جاتی ہے۔ اور سب جاندار ہر دم جان جوکھوں میں رہتے ہیں۔ سہ

بر و از خانۂ گردوں بدر و ناں مطلب — کیں سیہ کاسہ در آخر بکشد مہماں را

انقلابات زمینی میں افراد نہیں بلکہ نسلیں کی نسلیں نابود ہو جاتی ہیں طرح طرح کی بیماریاں۔ وضع و صنع کی دبائیں خاندان کے خاندان ویران اور شہر کے شہر سنسان کر دیتی ہیں۔ اور یہ کچھ نوع انسان ہی کے لئے مخصوص نہیں ہیں۔ بلکہ ہر ذی حیات کے حق میں یکساں مضر ہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ ادنے درجے کے جانور یا کسی قسم کے درخت ان کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ تمام نباتات اور حیوانات سب کی جان پر بھی آفت ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ بلائیں

قدرت کی تلوار ہیں۔ جس کے وار سے بچنا دشوار ہے۔ ؎

زندگی در گردنم افتاد بیدل چارہ چیست ٭ شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن

موسموں کا انقلاب ایک اور عذاب ہے۔ تمام جاندار اشیا فطرتاً اپنے وطن کی آب وہوا برداشت کرنے کے قابل بنائی گئی ہیں۔ اگر اس میں اوسط سے زیادہ کمی بیشی ہو تو ان کی خیر نہیں۔ یہ طبعاً ذکی الحس ہوتی ہیں۔ اور بعض قسم کے پودے اور جانور تو نہایت ہی نازک ہوتے ہیں۔ جب کبھی گردش روزگار اور انقلاب لیل ونہار سے موسموں کی سختی معمول سے زیادہ ہو جاتی ہے۔ تو ان پر گویا آسمان پھٹ پڑتا ہے۔ بیسیوں قسم کے جانور اور درخت ہمیشہ کے لئے تباہ ہو جاتے ہیں۔ سینکڑوں قسمیں کمزور اور ضعیف ہو جاتی ہیں۔ بعض سنبھل بھی جاتی ہیں۔ ان کے لئے یہ مرگ انبوہ جشن ہو جاتا ہے (اِنَّ اللّٰہَ یَفْعَلُ مَا یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیْدُ) آثار حیات کی وہ داستان جو قدرت کے زبردست قلم نے طبقات الارض کے سنگین ورقوں پر لکھ کر کالنقش فی الحجر کر دی ہے۔ اس سے قطعی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک ایسے انقلاب زمینی کے بعد جانوروں کی صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ گویا قدرتی کیفیات میں خلل پڑ جانے سے جانور از سر نو زندگی بسر کرنا شروع کرتے ہیں اور ان کی صورت وسیرت میں فرق آنے لگتا ہے ٭

یہ انقلابات زمینی کچھ نادر نہیں ہیں۔ بر و بحر ہمیشہ باہم برسر پرخاش ہیں۔ پانی کا زور چلتا ہے تو ملکوں کو چھپا لیتا ہے۔ زمین کو جوش آتا ہے۔ تو سمندروں کو سکھا دیتی ہے۔ اگرچہ عموماً یہ انقلاب ناگہانی نہیں ہوتے۔ رفتہ رفتہ ہوتے ہیں۔ مگر ہوتے ضرور ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ ہی مختلف اقالیم کے حیوانات میں بھی تغیر وتبدل ہوتا رہتا ہے۔ اور ایک حد تک قدرتی انتخاب کا مدار اس پر بھی ہے ٭

ان سب کو چھوڑ کر اس کشاکش ہستی میں ایک اور طاقت بھی اپنا کام کر رہی ہے۔ اس کو **انتخاب ازواج** کہتے ہیں۔ اختلاف اقسام میں یہ طاقت بھی بہت موثر اور کارگر ہے۔ اور پالتو جانوروں کی مختلف قسمیں اور خاص خاص خوبیاں

Marfat.com

محض انتخاب ازدواج کے ذریعے سے حاصل کی گئی ہیں۔ جانوروں کے پالنے والے اور رکھوالے خاص طرح کے پسندیدہ بچے حاصل کرنے کے لئے نسلاً بعد نسلٍ صرف ایسے نر و مادہ کا جوڑا ملاتے رہے۔ جن میں وہ محبوبہ باتیں زیادہ نمایاں تھیں۔ اور آج پالتو جانوروں کی بیشمار قسموں میں اس طاقت کی تاثیر اور ان لوگوں کے نتائج کی تکمیل دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ عجیب عجیب قسموں میں سے ایک قسم کے مویشی ہیں جن کے اب مطلق سینگ نہیں ہوتے اور سر کا وہ حصہ بالکل گول اور صاف ہوتا ہے۔

اسی طرح خوبصورت اور پست قد پنتے کُتّے سے لیکر ہیبتناک بلند قامت بلڈاگ اور سینٹ برنارڈ کے تمیز دار ماسٹیف تک کتوں کی الگ الگ بیشمار قسمیں ہیں۔ گھریلو مرغیوں اور کبوتروں وغیرہ کا بھی یہی حال ہے۔ اور یہ سب محض اس بات کا کرشمہ ہے کہ پالنے والے نے چند سب سے زیادہ پسندیدہ جانوروں کو چھانٹ کر ان سے بچّے لئے جن کو وہ خوبیاں اپنے ماں باپ سے ورثے میں ملی تھیں۔ پھر ان بچوں میں اسی قسم کا انتخاب ازدواج استعمال کیا۔ اور اسی طرح کے تسلسل سے ایسے حیرت انگیز اور تسلی بخش نتیجے پیدا ہو گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی اصول کو مخالف صورت میں استعمال کرنے سے چند نسلوں میں بالکل برعکس نتیجے پیدا ہوں۔ اور صدیوں کے تفرقے مٹ کر از سرِ نو یکسانیت اور مشابہت پیدا ہو جائے۔ یہ مشہور بات ہے کہ دوغلہ جانور قد و قامت۔ صورت و سیرت۔ رنگ ڈھنگ اور عقل و تمیز میں اپنے اصل ماں باپ کے بین بین ہوتا ہے۔ تعجب ہوتا ہے کہ قدما نے اتنے حاوی اور زبردست اصول کو کیونکر نظر انداز کر دیا جس کے نتائج ایسے نمایاں اور جس کا استعمال اتنا وسیع اور عام ہے۔ یہ بھی حیرت ہے کہ متاخرین نے بھی اس قانون کو صرف پالتو جانوروں ہی تک محدود سمجھا اور قدرتی دنیا پر اس کو حاوی کرنیکا خیال تک نہ کیا۔ انیسویں صدی کے وسط تک فلاسفہ تک کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ گزری تھی کہ جو کام پالتو جانوروں میں انسانی عقل کرتی ہے قدرت اپنے کارخانے میں وہی کام حیوانی عقل سے لیتی ہے۔ اور اگرچہ

اس کا فرق اتنی جلدی نظر نہیں آتا مگر اس کا ہونا دونوں جگہ یکساں یقینی اور لازمی ہے۔ مشاہدے اور تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ انتخاب ازواج قدرتی طور پر بھی ضرور ہوتا ہے۔ اور اپنے اپنے کام میں حیوان بھی انسان سے کچھ کم سمجھدار اور عقلمند نہیں ہیں۔ وحشی جانوروں کی چال ڈھال کا مطالعہ اتنی غائر اور محتاط نظر سے کیا گیا ہے۔ اور ان کے نتائج اتنے غور و خوض سے جانچے گئے ہیں۔ کہ اب اس بات میں ذرا بھی شک نہیں رہا۔ کہ جانوروں کی اکثر قسموں کا فرق صرف انتخاب ازواج کا نتیجہ ہے۔ اس کی وضاحت کے لئے مثال لیجئے تقریباً تمام قسم کے جانوروں میں طاقتور نر کمزوروں کو مار کر بھگا دیتے ہیں۔ اور آپ ہی آیندہ نسل کے بانی بن جاتے ہیں (مرغوں کی لڑائی اسی پر ہوتی ہے) گویا یہاں کشاکش ہستی میں سب سے اچھا حربہ جسمانی قوت ہے۔ اس میں قدرت بھی اس کی صاف مدد کرتی نظر آتی ہے۔ جن جانوروں کے سینگ ہر سال جھڑ کر نئے آتے ہیں۔ وہ گویا ہنگام نر دادگی کے لئے مسلح ہوتے ہیں۔ کیونکہ سینگ لڑنے کے لئے ہیں۔ اور لڑنا ماداؤں کے لئے جب لڑائی بھڑائی اور توالد و تناسل کے دن گزر گئے تو سینگ بھی اتر گئے۔ اور نر گویا ہتھیار رہ گئے مگر دوسرا موسم آیا۔ اور انہوں نے بھی اپنے سینگوں کے بھالے سنبھالے۔ اس کے علاوہ مادائیں خود بھی انتخاب کرتی ہیں۔ اور کبھی کبھی متواتر ایک ہی قسم کے نروں کو پسند کرتی ہیں۔ وجہ انتخاب کہیں قد و قامت زور و طاقت اور سبکدوی اور تیز دوی ہوتی ہے کہیں رنگ و روپ یا چہرہ مہرہ ہوتا ہے۔ اور کہیں بظاہر نامعلوم ہوتی ہے۔ پرندوں کے پروں کی چمک دمک نے اس کام میں بڑا حصہ لیا ہے۔ عموماً نر ہی زیادہ خوش لباس اور شوخ رنگ ہوتا ہے۔ کبھی مادہ بھی ہوتی ہے۔ مگر اکثر نر ہی ہوتا ہے۔ لیکن اب تک ہم کو یہ سان گمان بھی نہ تھا کہ یہ دلکش رنگ اور یہ رعنائی و زیبائی خود ان کی ماداؤں کی ہی حسن پرستی سے پیدا ہوئی ہے۔ اگرچہ شاید سینکڑوں ہزاروں نسلوں کے بعد۔ غرض دنیا کے بڑے سے بڑے جانور سے لیکر کرمک شب تاب تک پر بھی انتخاب ازواج کا اصول آہستہ

آہستہ مگر برابر اپنا اثر دکھائے جاتا ہے۔ اختلاف اقسام میں ایک اور بات بھی مدنظر رکھنی چاہیئے۔ وہ یہ کہ کبھی اولاد یکایک یا کم از کم جلدی جلدی اپنی آبائی صورت سے بدل جاتی ہے۔ یا کبھی ایسا ہوتا ہے (ہوتا ہے سے ہماری یہ مراد نہیں کہ بلا وجہ محض اتفاق سے ہو جاتا ہے۔ بلکہ یہ کہ ابھی تک اس کی صحیح وجہ اور ٹھیک سبب معلوم نہیں ہوا) کہ کوئی نو پیدا شدہ جانور صورت سیرت اور چال چلن میں اپنے ماں باپ۔ بلکہ اپنی تمام معلومہ نسل سے جدا ہوتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا یکایک ایک نئی قسم پیدا ہو گئی۔ یہ ٹھیک طرح معلوم نہیں کہ حیات حیوانی میں ان ناگہانی اختلافوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے۔ بعض مشاہدین کا خیال ہے کہ یہ محض ایک استثنا ہوتی ہے اور رفتہ رفتہ چند نسلوں کے بعد وہ خاص فرق مٹ جاتا ہے۔ بعض محققین کی رائے ہے کہ کم از کم کبھی کبھی یہ فرق قائم رہ کر ایک نئی قسم کا آغاز ہو جاتا ہے ✦

کشاکش ہستی میں مذکورۂ بالا مقابلے اور مقاتلے کے علاوہ بعض اور بھی باتیں ہیں جو ابقائے بہترین کے اصول پر اثر ڈالتی ہیں۔ یہ اصول مسئلہ ارتقا کا اصل اصول ہے۔ اب ہم اس پر اتنی گفتگو کر چکے ہیں کہ اب اس کا استعمال اور اس کی خوبی دکھائی جانی ممکن ہے ✦

پہلے تو اس علم کی چند ضروری اصطلاحیں دیکھ لینی چاہئیں تاکہ اس کی بحث میں سہولت ہو جائے۔ اشیائے کائنات میں تین حصے پائے جاتے ہیں۔ جن کو موالید ثلاثہ کہتے ہیں۔ یعنی عالم جمادات۔ عالم نباتات اور عالم حیوانات یہ عالم طبقوں میں منقسم ہیں اور طبقے درجوں میں۔ درجے جنسوں میں۔ جنسیں نوعوں میں نوعیں قسموں میں اور قسمیں فردوں میں تقسیم کر رکھے ہیں۔

(Kingdom, Order, Suborder, Genera, Species, Varieties, and Individuals)

اس باقاعدہ اور مرتب تقسیم کے علاوہ کہیں کہیں جماعت اور خاندان کے لفظ بھی آجاتے ہیں۔ مگر اصل تقسیم وہی ہے جو ہم نے بیان کی ✦

Marfat.com

گزشتہ صفحوں میں ہم نے دیکھ لیا۔ کہ ارتقا کیونکر افراد کو ظہور میں لاتی ہے۔ طرز عمل کا یہ حصہ اتنے بے انتہا عام تجربوں اور معمولی مشاہدوں سے ثابت ہو چکا ہے۔ کہ اس میں شک وشبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں رہی۔ تمام جانوروں میں یہ کیفیت مشترک ہے۔ جرم سے جنین بننے تک جنین سے جاندار بچہ بن کر نکلنے تک۔ بچپن سے جوان ہونے تک۔ جوانی سے مرنے تک تمام جانوروں کی وہی ایک داستان ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ اصول جو افراد زندگی میں دیکھے گئے ہیں۔ ان کا اثر قسموں۔ نوعوں۔ جنسوں۔ درجوں طبقوں اور آخر میں عالموں پر کہاں تک پڑتا ہے۔ یعنی یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ جس طرح تمام وضع وضع کے جانور یکساں اجرام سے بنتے ہیں۔ اسی طرح یہ مختلف قسمیں اور نوعیں اور آخر کار جنسیں اور درجے بھی ایک طرح ہم صورت جانوروں کے آہستہ آہستہ بڑھنے والے فرق سے پیدا ہوئے ہیں*

ہماری مذکورۂ بالا بحث سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون افراد سے اقسام کی طرف پھیلتا ہے۔ کیونکہ ہم پالتو اور وحشی جانوروں کی گوناگونی میں بچشم خود دیکھتے ہیں کہ انتخاب ازواج اور قدرتی انتخاب کیونکر افراد میں انقلاب پیدا کرکے اختلاف اقسام کا باعث ہوتے ہیں۔ اور مشاہدے اور تحقیق نے اس قانون کی صدہا مثالیں معلوم کی ہیں۔ جن سے یہ بات یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ جانوروں کی مختلف قسمیں کشاکش ہستی کے جدا جدا سامانوں سے پیدا ہو جاتی ہیں۔ اب یہ بات قابل غور ہے کہ آیا اختلاف انواع و اختلاف اجناس میں بھی اس کا کچھ اثر ہے یا نہیں *

گزشتہ صدی میں اس سوال پر بہت کچھ غور کیا گیا۔ سب سے پہلے یہ بات مشاہدہ کی گئی کہ حیوانات ونباتات کی بعض انواع دیگر انواع کی نسبت باہم زیادہ مشابہ ہیں۔ زیادہ غور سے ان کی مشابہت اتنی بڑھی ہوئی نظر آئی کہ ان کی نوعیت میں شک ہونے لگا۔ اور خیال ہوا کہ شاید یہ خود الگ نوع نہیں ہیں۔ بلکہ کسی ایک ہی نوع کی چند قسمیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھا گیا کہ بعض قسمیں باہم اتنی مختلف ہو گئی تھیں کہ ان کا فرق نوعوں کے باہمی فرق کے

برابر ہوگیا تھا۔ ان باتوں کی برابر تحقیق و تفتیش ہوتی رہی یہاں تک کہ آخر تمام عالم حیوانات کا ایک ہی قسم کے افراد کی مختلف اقسام ہونا ممکن معلوم ہونے لگا۔ عقل کے آفتاب کی اس ایک جھلک سے تمام عالم دماغ جگمگا اٹھا۔ اس کی چمک میں نوعیں معدوم ہوگئیں۔ جنسیں مٹ گئیں۔ درجے لوٹ گئے۔ طبقے اُلٹ گئے۔ اور تمام عالم کائنات ایک عظیم الشان اور یکساں وحدت کا سماں دکھانے لگا صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ چند جرموں سے یہ ساری عجیب و غریب گوناگونی اور رنگا رنگی نظر آنے لگی جیسے ایک چھوٹا سا بیج بڑھ کر سر بفلک درخت کے ڈال ڈال۔ شاخ شاخ۔ ٹہنی ٹہنی اور پتی پتی میں پھیل جاتا ہے ٭

اسی طرح مسئلہ ارتقا کا سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ ہر فرد کی زندگی کے انقلاب اس کی قسم کی عمر کے انقلابوں کا چھوٹا نمونہ ہیں۔ یعنی جرم بڑھتے بڑھتے جس طرح نیا جسم بن جاتا ہے۔ اسی طرح جسم بدلتے بدلتے نئی قسم ہو جاتا ہے۔ یہاں ضمناً یہ بات آجاتی ہے کہ ایک نوع کی مختلف اقسام ایک ہی جرم سے بنتی ہیں۔ اس کے آگے یہ بات ابھی محقق نہیں ہوئی کہ آیا مختلف نوعیں الگ الگ ہوتی ہیں۔ یا خود بھی کسی ایک ہی اصل کی جدا جدا قسمیں ہوتی ہیں۔ اس کا جواب دینا موجودہ معلومات میں دشوار ہے مگر ہاں اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ آثار حیات کے خطوط متوازی نہیں ہیں۔ بلکہ سب کے سب ایک ہی نقطۂ ماسک کی طرف سے پھیلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کا تغیر و تبدل محض اختلاف حالات اور انقلاب کیفیات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے ٭

عالم حیوانات کے ان قانونوں سے انسان مستثنیٰ نہیں ہے۔ اور ہم کو اپنا اصلی سوال چھوڑ کر اس مسئلہ کی تشریح کے لئے اتنی دور محض اس لئے جانا پڑا۔ کیونکہ یہ ہماری نوع کی ابتدائی کیفیت کی ایک حد تک توضیح کرتا ہے۔ اور اب ہم کو یہی دیکھنا ہے کہ وہ توضیح کیا ہے۔ یہ تو مسلم ہے کہ حیات انسانی اور حیات حیوانی میں نہایت گہرا لگاؤ ہے۔ اشرف المخلوقات بھی اسی عظیم الشان درخت کا ایک پھول ہے۔ جس میں ارذل الحیوانات کے کانٹے

Marfat.com

ہیں۔ اس وسیع خاندان کے باہمی تعلقات اور رشتوں پر غور کرنا بڑا دلچسپ اور عجیب معلوم ہوتا ہے۔ یہ تو پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ مسئلہ ارتقا کے نزدیک انسان اپنے سے کم درجے اور سادہ ساخت کے جانداروں کا خلف الرشید ہے۔ مگر وہ جاندار بھی تھے انسان ہی۔ بندر یا لنگور نہ تھے۔ البتہ ان کی طرز زندگی اور قوائے جسمانی و دماغی اتنے مکمل اور قوی نہ تھے۔ اس زمانے کے بندر اور لنگور بھی آج کل کے سے نہ تھے۔ بلکہ ان سے کم درجے کے تھے۔ گویا جو فاصلہ ان جانوروں اور انسانوں میں اب ہے۔ اس سے کچھ ہی کم تب بھی موجود تھا۔ کیونکہ انہوں نے بھی اپنی وضع میں ترقی کی ہے۔ ہاں اگر پیچھے ہٹتے چلے جائیں تو ایک وقت اور ایک جگہ ایسی آجاتی ہے جہاں تمام قسم کے بندر اور آدمی ایک ماں باپ کے گرد چھوٹے بڑے بھائی بہنوں کی طرح حلقہ باندھے اپنی اپنی سمتوں میں بڑھ کر ہمیشہ کے لئے الوداع کہنے کو ہاتھ ملا رہے جدا جدا ہونے کو تیار کھڑے ہیں۔ کیونکہ اس دار الفراق دنیا میں ایک دفعہ اس طرح جدا ہو کر پھر ملنا کیسا پاس آنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ اگر نظر کو زیادہ وسیع کریں اور تھوڑی دور اور بڑھیں تو ایک طرف سے درندے اور دوسری طرف سے چرندے بھی قطار در قطار چلے آتے ہیں۔ غرض معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی دادا کی اولاد ہیں جن کو زوجی انتخاب اور قدرتی انقلاب نے قسموں اور نوعوں میں تقسیم کر کے آخر مختلف الاجناس بنا دیا۔ ان قیاسات کا میدان وسیع ہے۔ اور ان کو جہاں تک پھیلانا چاہیں۔ پھیلتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ محض قیاس ہی قیاس نہیں ہیں۔ بلکہ علوم طبعیات کی تحقیقات ان کی تاکید اور تائید کرتی ہے۔ اور صاف بتلاتی ہے کہ تمام ریڑھ کی ہڈی والے جانور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ یعنی ایک زمانے میں اس قسم کے جانور موجود تھے۔ جن میں اس طرح کے موجودہ تمام بری اور بحری جانوروں کی طاقتیں اور قوتیں مضمر تھیں آخر ہزارہا نسلوں کے بعد ان کی عادتیں بدل بدل کر مذکورۂ بالا قانونوں نے اپنا اثر نمایاں کر دیا۔ اور ان جانوروں کی مختلف قسمیں ہو گئیں۔ صدہا دیگر نسلوں میں ان قسموں میں بھی اختلاف اتنا نمایاں ہو گیا کہ ان کی مختلف نوعیں

بن گئیں۔ یہی عمل برابر جاری رہا یہانتک کہ آج ان کی کثرت سے زمین بھری ہوئی ہے اور سمندر پٹا پڑا ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ ریڑھ کی ہڈی والے اور دوسرے جانوروں کا ڈھانچہ بھی بہت ملتا جلتا ہے اور آگے چل کر گھونگے کی قسم کے جانور بھی انہی میں آملتے ہیں۔ مگر یہ اتفاق اجناس اور اس سے بھی زیادہ وسیع بحث یعنی اتحاد درجات وطبقات کا مسئلہ ابھی تک قیاسی ہی ہے عملی واقعات اس کے ثبوت کے لئے پیش نہیں کئے جا سکتے۔ اور اس بات کا دعوے نہیں ہو سکتا کہ اصل میں تمام حیوانات متحد الاصل اور ایک ہی ابوالاباء کے اولاد واحفاد ہیں۔ یہی حال اس سے بھی زیادہ وسیع بحث یعنی اتحاد عالم حیوانات ونباتات کا ہے۔ ممکن ہے کہ مختلف جنسیں الگ الگ ماخذوں سے پھیلی پھلی ہوں۔ یا سب کی سب ایک ہی ماخذ سے نکلی ہوں۔ قیاس تو ان کا بھی اتحاد ہی چاہتا ہے۔ لیکن اس بحث کا عملی فیصلہ دنیا آیندہ نسلوں کی ذہانت و ذکاوت پر موقوف ہے۔ اس کی بابت یہ مسئلہ بالکل علم الالسنہ کی مانند ہے۔ وہاں بھی ہم جانتے ہیں کہ یورپ کی مروجہ زبانیں فارسی اور سنسکرت ایک ہی زبان سے نکلی ہیں۔ اسی طرح عربی۔ عبرانی۔ سریانی اور کلدانی ایک ہی کان سے نکلی ہیں۔ مگر ان دونوں خاندانوں کا باہمی رشتہ ابھی تک صرف قیاسی ہی ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ حبشیوں کی بولیاں اور مغلوں کی زبانیں بھی ملالیں۔ تو مسئلہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ایک جنس کی انواع واقسام کے یگانگی تو یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ طبقات الارض کے آثار محفورہ متحجرہ میں ان کے ابتدائی بزرگوں کے نمونے ہاتھ آگئے ہیں۔ لیکن اس سے آگے صرف قیاس ہی ہے۔ عملی ثبوت اور قطعی دلیل نہیں ملی۔ گو ممکن ہے کہ آیندہ کبھی مل جائے۔

غرض اس طرح اس مسئلے کے مطابق اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بزرگ ادنےٰ درجے کے ہونگے۔ مگر یہ نہیں معلوم کہ ہونگے کیسے۔ ہمارے علم کی موجودہ حالت میں ان کا صحیح تصور کرنا ذرا مشکل ہے۔ عملی تحقیقات سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری نوع کے ابتدائی نمونوں دجو غالباً اپنے بزرگوں سے کچھ ہی

Marfat.com

مختلف ہونگے) اور بن مانسوں میں اگر کچھ فرق تھا۔ تو صرف یہ تھا کہ ہم آگ جلا سکتے اور کچھ اوزار بنا سکتے تھے۔ بہرحال یہ بات اطمینان بخش ہے کہ یہ تحقیقات ہمارے مسئلہ ارتقا کے مطابق اور اس کی مصدّق ہے +

ہم نے موجودہ مسئلے پر خالی الذہن ہوکر ہر قسم کے تعصّب اور سخن پروری کو چھوڑ کر بحث کی ہے۔ اور آفرینش عالم کی بابت دونوں مختلف اور مخالف خیالوں کو پوری وضاحت سے پیش کر دیا ہے۔ ان دونوں عقیدوں میں فرق صرف طرز عمل کی بابت ہے۔ اصل مسئلے کے متعلق کسی کو کلام نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے کرۂ زمین پر کوئی جاندار شئے نہ تھی۔ اب ہے۔ ضرور ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس شئے کا وجود ہؤا ہو۔ بحث یہ ہے کہ یہ وجود کب ہؤا۔ اور کیونکر ہؤا یہ نہیں ہے کہ ہؤا یا نہیں ہؤا۔ اس لئے جو کچھ بیان کیا گیا اس کو کسی قسم کے عقائد مذہبی سے علاقہ نہیں ہے۔ امید ہے کہ ناظرین اس کو ملحوظ خاطر رکھینگے اور ہماری اس رام کہانی پر انصاف سے غور کرینگے +

باب سیزدہم

مسئلۂ ارتقا کی چند مثالیں

مسئلۂ ارتقا کے ضمن میں زمین کی پیدائش کا بھی مختصر حال لکھ دینا چاہئے۔ زمین انسان کا مسکن ہے۔ ہر کون ایسا مردہ دل اور افسردہ طبع شخص ہوگا جو اس خاکی کرے کی ابتدائی کہانی دلچسپی سے نہ سنیگا۔ جس کے دامن شفقت میں وہ بڑا ہوکر پھلا پھولا ہے۔ جس کی گود میں اس کے باپ دادا اور بہن بھائی موت کی میٹھی نیند سو رہے ہیں۔ اور جس کی آغوش محبت میں اسے خود بھی ایک نہ ایک دن ضرور آرام کرنا ہے +

زمین بھی بڑھتی ہے۔ یہ بھی اچانک پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ صدہا مدارج ترقی

Marfat.com

اور ہزارہا معارج کمال طے کر کے اس موجودہ حالت پر پہنچی ہے۔ ایک وقت تھا جب ہمارے اس نظام شمسی کی جگہ سورج کے چاروں طرف مختلف گیسیں پھیلی ہوئی تھیں۔ شدت حرارت سے ان عظیم الشان سیاروں کا مادہ رقیق ہو رہا تھا۔ آخر رفتہ رفتہ برودت اور انجماد کا عمل شروع ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرکز سے کم و بیش فاصلوں پر مادہ حلقوں کی صورت میں جمع ہونے لگا۔ یہی حلقے کچھ دن بعد سیارے بن گئے۔ ہماری اس سنگین زمین کی جگہ اس وقت ایک نیم مائع سے مادہ کا ایک حلقہ تھا۔ رفتہ رفتہ لاانتہا مدت کے بعد یہ حلقہ ایک طرف سے سخت اور دوسری طرف سے اور بھی رقیق ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ بیچ میں سے شق ہو گیا اور پھر اس قانون کے موافق جس سے فضائے محیط میں مائع مادہ متشکل ہوتا ہے کروی صورت اختیار کرنے لگا۔ یہ عمل برابر جاری رہا۔ آخر مادے میں لزوج پیدا ہوا اور ذروں میں چسپیدگی بڑھی۔ کرے نے ایک معین مدار یا طریق الارض حاصل کیا۔ اور اس راستے میں جو مادہ ابھی تک آس پاس پھیلا ہوا تھا اس کو کھینچ کر اپنا جزو بدن بنانے لگا۔ یہ حال اب بھی باقی ہے۔ کروڑہا کروڑ گردشیں اور الٹے پلٹے کھانے کے بعد ان مختلف طاقتوں اور محلوں نے اس کو وہ صورت دیدی جو موجودہ علم طبقات الارض کے مطابق کرۂ زمین کی سب سے پہلی جامد صورت خیال کی جاتی ہے۔ اور اسی سے اس علم کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے بعد مختلف انقلابات اور آہستہ آہستہ زمین کے اوپر کے پرتوں کی ساخت، آثار حیات کا ابتدائی ظہور۔ اس کی باقاعدہ ترقی۔ اور اس بچپن کے زمانے سے اس جوانی کی حالت تک پہنچنے کی مفصل کیفیت سنانا علم طبقات الارض کا حق ہے۔

یہ تمام مختلف انقلاب مسئلۂ ارتقا کی ایک مثال تھے کرۂ زمین کے یکبارگی پیدا ہو جانے کے بجائے اس کی نہایت دھیمی اور باقاعدہ نشوونما کا خیال زیادہ دل نشین ہوتا جاتا ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ جو شان ایزدی اور قدرت خالقی اس باترتیب صنعتگری سے نمایاں ہے۔ وہ دم بھر میں پیدا کر دینے کے خیال سے ظاہر نہیں ہوتی۔ غور کریں تو صرف اس ایک کرے کی پیدائش کی امتداد مدت ہی اس صانع کے ازلی اور ابدی ہونے کی گواہ ہے۔ اور پھر جب ان دوسرے

Marfat.com

کروڑوں کروں کی طرف خیال کریں۔ جن میں سے ایک سورج زمین سے ڈھائی لاکھ گنا بڑا ہے۔ اور ایک سہیل سورج سے دس ہزار گنا بڑا ہے جن کا پھیلاؤ اتنا ہے کہ ان میں سے بعض ستاروں کی روشنی ایک لاکھ چوراسی ہزار ۶ سو میل فی سیکنڈ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی گھنٹوں اور دنوں میں کیا مہینوں اور برسوں میں بھی زمین تک نہیں پہنچتی۔ بلکہ صدہا اور ہزارہا سال چاہتی ہے۔ اگر ان کی پیدائش اور آفرینش کا تصور کریں تو کثرت وسعت کی وجہ سے انسانی دل و دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ اور خیال کا برق رفتار قاصد ایک قدم بھی نہیں چل سکتا سُبْحَانَ اللّٰہ۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ عالم حیوانات و نباتات ہی قوانین قدرت کے زیر اثر نہیں ہیں۔ بلکہ خود کرۂ زمین بھی انہی کا آوردہ ہے۔

اس طرح اگر مادی دنیا سے عالم خیال کی طرف چلیں تو یہاں بھی یہی نظر آتا ہے کہ ترقیات دماغی بھی جانوروں کی طرح ابتدائی حالت سے انتہائی صورت یا جرم سے جسم کی طرف ترقی کر رہی ہیں۔ چنانچہ انسانی زبان کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔ اس کی تاریخ بھی وہی ارتقا کی داستان ہے۔ تعجب ہے۔ کہ ڈارون نے جو نقشہ آثار حیات کی وجہ اختلاف واضح کرنے کے لئے بنایا تھا۔ علم الالسنہ کی تشریح کے لئے ایسا موزون ہے گویا ڈارون کی تمام کشش و کوشش اور سارا مطالعہ اور مشاہدہ اسی کے لئے وقف تھا۔ اور وہ نقشہ اسی کے واسطے بنایا گیا تھا۔ وجہ یہ ہے کہ دونوں کے مسائل انقلاب بعینہٖ مشابہ ہیں۔ ناموں کا فرق ہے۔ اور سب کچھ وہی ہے۔ وہاں ایک طرح کے حیوانات بڑھتے بڑھتے الگ الگ اقسام بن جاتے تھے۔ یہاں ایک اصل کے الفاظ بدلتے بدلتے جدا جدا بولیاں بن جاتی ہیں۔ جس طرح وہاں صرف طاقتور اور زبردست قسمیں باقی رہ کر نوعیں بن جاتی تھیں اور باقی معدوم ہو جاتی تھیں۔ ویسے ہی یہاں بھی زیادہ پسندیدہ اور مناسب بولیاں قائم رہ کر زبانیں بن جاتی ہیں اور باقی مٹ جاتی ہیں۔ اور یہی حال اب تک باقی ہے۔ دنیا کی مروّجہ زبانوں کو دیکھیں تو وہی کشاکش ہستی۔ وہی انتخاب قدرتی۔ اور وہی ابقاے بہترین کے قانون جاری ہیں۔

Marfat.com

زبان ہی پر کیا منحصر ہے۔ نوع انسان کے تمام آئین جو حکمت اور مصلحت پر مبنی ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ انہیں کی ایک نہایت عمدہ مثال طرز حکومت ہی ہے۔ جس کسی نے حکومت کی تاریخ پر غور کیا ہے۔ اسے اس کی۔ پیدائش۔ بچپن۔ طفلی۔ جوانی وغیرہ سب مدارج نظر آتے ہیں۔ یقیناً ایک زمانہ تھا۔ جب دنیا میں کوئی حکومت نہ تھی۔ ایک زمانہ ہے کہ حکومت اپنا جوبن دکھا رہی ہے۔ اس لئے ایک وقت درمیان میں ہونا ضروری ہے۔ جب حکومت پیدا ہوئی۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ دفعتاً کسی جادوگر کی انگلی کے اشارے سے پیدا نہیں ہوئی اس کا بھی ایک بیج یا جرم تھا۔ پھر اس کا جنین بنا۔ اور آخر ولادت کا وقت آیا۔ پھر شیر خواری۔ بچپن اور طفلی کا زمانہ رہا۔ آخر لڑکپن گزرا اور جوانی آئی۔ غرض جس پہلو سے دیکھیں حکومت کی نشوونما بھی انسانی کاروبار کی تاریخ میں ایک نمایاں اور اہم مضمون ہے۔ لیکن اس کی ٹھیک چھان بین کرنے کے لئے معلومات کا ذخیرہ وسیع اور باریک بینی اور معاملہ فہمی کا پایہ بلند ہونا چاہئے۔ سب سے پہلے ان حالات و خیالات کو معلوم کرنا چاہیئے۔ جن میں حکومت کی ابتدا ہوئی۔ ضرور کوئی قوم ہوگی۔ جس نے انتظام و ترتیب کی خوبیاں اپنے بھائی بندوں سے کسی قدر پہلے دریافت کر لی ہونگی۔ شروع شروع میں امتحان کے طور پہ طرح طرح کے تجربے کئے گئے ہونگے۔ ان ابتدائی تجربوں میں طاقت عقل اور بزرگی کا لحاظ ہوگا۔ مثلاً کہیں محض ایک گھرانے کا بزرگ تمام خاندان یا قبیلے کا بزرگ، بن گیا ہوگا۔ کہیں محض جسمانی طاقت وجہ فضیلت ہوئی ہوگی۔ ایک قوی بازو شخص نے اپنے کمزور ہمسائے سے اپنا کام جبراً لیا ہوگا۔ اور خود اپنے سے زیادہ طاقتور شخص کا کام کیا ہوگا۔ اسی طرح سب سے زیادہ طاقتور شخص تمام گاؤں یا قبیلے کا سردار بن گیا ہوگا۔ کمزوروں نے اس جسمانی طاقت کے مقابلے میں دماغی قوت سے کام لیا ہوگا۔ اور آپس میں عقلیں لڑا کر عقل کو زور سے لڑایا ہوگا۔ اور اس طرح ظلم

وستم سے بچاؤ کے لئے جبری حکومت کو عقلی کارروائیوں سے محدود اور مقیّد کیا ہوگا۔ یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کا کوئی تحریری ثبوت یا عملی دلیل ملنی مشکل ہے۔ لیکن آیندہ کے تاریخی واقعات جو ہماری نظر کے سامنے ہیں ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ ہمارا قیاس صحّت کے بہت قریب ہے۔ بہرحال جب ایک دفعہ حکومت کی بنیاد پڑ گئی تو پھر حالات کے انقلاب اور حاکم و محکوم کے تغیّر و تبدل سے جانداروں کی طرح اس میں بھی ادل بدل ہوتا رہا ہوگا۔ بہتیرے امتحانی طریقے ناکام رہے ہونگے۔ جو کیفیات ملک و قوم کے مناسب ہونگے۔ انہوں نے پھیلنا اور بڑھنا شروع کیا ہوگا۔ اور پھر ان منتخب اور مستحب طرزوں کے اختلاف وافتراق سے نئی نئی صورتیں بنی ہونگی۔ یہاں تک کہ آفتاب تاریخ کے طلوع ہوتے ہی ایک طرف مصر کی مذہبی حکومت نظر آتی ہے۔ ایک طرف بابل اور نینوا کی شخصی سلطنت ملتی ہے۔ یونان میں بزرگان قوم برسراقتدار ہیں۔ روما میں عوام النّاس صاحب اختیار ہیں۔ یہاں کبھی کشاکش ہستی اور بقائے بہترین کا اصول جاری ہے۔ کہیں یہ بہترین صورت موروثی حکومت ہے۔ کہیں فوجی طاقت۔ آخر یہ بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور ایک دفعہ تفرقے کا عالم اور نفسی نفسی کا نقشہ ہو جاتا ہے۔ جو خود کچھ بھی نہیں مگر ان سب کچھ سکتا ہے۔ اس میں سے نکل کر ایک طرف بابل اور نینوا کی حکومت اور پاپاؤں اور سقفوں کی سلطنت ہوتی ہے۔ ایک طرف شہسواران جنگی کا زور ہوتا ہے۔ کہیں مطلق العنانی کا راج ہوتا ہے۔ کہیں حکومت کے سر پر آئین و قوانین کا تاج ہوتا ہے۔ مدتوں تک یہی رنگ رہتا ہے۔ آخر ایک کا عروج اور ایک کا زوال ہوتا ہے۔ ایک میں ہبوط۔ اور ایک کو کمال ہوتا ہے۔ ارتقا کے اثر سے اہل ملک خود ایک بڑا طاقتور جزو بن جاتے ہیں۔ اور عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ اور ان میں اور شخصی سلطنت میں ہستی کے لئے کشاکش ہوتی ہے۔ پھر خود عوام کی طاقت کے بہت سے فرقے ہوتے ہیں۔ کوئی نوع انسان کی ہم قومیت اور اتفاق بین الاقوام پر زور دیتا ہے۔ کوئی اشتراک عامہ کا مدعی ہوکر تمام ذاتیات کو ظلم اور ساری چیزوں کو مکمل نوع انسان کا حق ٹھہراتا ہے۔

Marfat.com

غرض یہ کشاکش یونہی رہیگی۔ بعض اسباب موجودہ طرز حکومت کے موافق ہونگے۔ بعض مخالف۔ حکومت کچھ نئے انداز لیگی کچھ پرانے طریقے چھوڑیگی۔ مطلب یہ کہ طرز حکومت بھی افراد حیوانی کی طرح جب سے ہے انقلاب حالات وخیالات سے متغیر ومتبدل ہوتی رہی ہے۔ اور جب تک رہیگی ہوتی رہیگی۔ گویا یہ بھی زبان کی طرح ارتقا کے وسیع قانون سے متاثر ہوتی ہے +

قانون کو ہی لیجئے۔ قانون سے ہماری مراد وہ تمام اصول ہیں جو عقل صحیح نے معاشرت کی بہبودی کے لئے دریافت کئے ہیں۔ یہ بھی ارتقا کی ایک نمایاں مثال ہے۔ قانون وضع نہیں کیا گیا یعنی اسے انسانی عقل وخرد نے نہیں بنایا۔ بلکہ یہ خود ایک طاقت ہے جو انسانی دل ودماغ میں ایسے خیالات پیدا کرتی ہے۔ جن سے اس کے چال چلن میں خوبی اور اس کے کاروبار میں خوش اسلوبی زیادہ ہو۔ مثلاً آئین روما کو لیں۔ ان کی ابتدا کون بتا سکتا ہے ان کا آغاز کس کو معلوم ہے۔ روما روما نہ بنا تھا۔ مگر وہ موجود تھے۔ وہاں کے دس قانون بنانے والے ان کے بنانے والے نہ تھے۔ صرف لکھنے والے تھے۔ وہ مقنّن نہ تھے محرر تھے۔ اُنہوں نے آیندہ نسلوں کے لئے قانون کو دس حصوں میں محدود کرنا چاہا تھا۔ مگر یہ بھی نہ ہوسکا۔ قاعدے دس کی جگہ بارہ ہوگئے۔ جمہوری سلطنت کے ابتدائی قانون عروج کے زمانے میں کام نہ دے سکے۔ اور عروج کے زمانے کے قاعدے شخصی سلطنت کے لئے کافی نہ ہوسکے۔ جو لوگ مقنن کہلاتے ہیں وہ قانونوں کو لفظی صورت میں ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا اصل مضمون پیدا کرنے والے نہیں ہوتے۔ آیندہ نسلوں کے لئے قانون ایجاد نہیں کئے جاتے۔ تحریر کئے جاتے ہیں۔ کام صرف یہ ہے کہ مردہ اور بیمار قاعدوں کو جوان اور تندرست قاعدوں سے الگ کریں۔ اور کشاکش ہستی میں غالب اور مغلوب قسموں کو جدا جدا کریں۔ غرض قانون بھی حکومت اور زبان کی طرح قدرتی انتخاب اور ابقاے بہترین کے زیر اثر ہے۔ کیونکہ وہی قاعدے قانون کہلاے جا سکتے ہیں۔ جو طرح طرح کے انقلابوں سے بچ نکلے ہیں اور اب تک معاشرت انسانی کے لئے مفید اور

Marfat.com

موزون ہیں۔ معاشرت، انسانی خود بھی انھی طاقتوں کا نتیجہ ہے۔ تمدن کس نے پیدا کیا۔ خود آدمی نے تو ہرگز نہیں بنایا۔ تمدن انسان کے ساتھ پیدا ہوا۔ ساتھ ہی بڑھا اور ساتھ ہی پھلا پھولا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمدن اور معاشرت انسانی کاروبار کی بنیاد ہے۔ چونکہ ایک زمانہ تھا کہ تمدن نہ تھا۔ اور اب ہے۔ اس لئے اس کی پیدائش اور نشو ونما بھی ضرور ہوئی ہوگی۔ اور قیاس غالب بلکہ یقین ہے کہ اس کی ترقی بھی بالکل افراد حیوانی کی طرح ہوئی ہوگی۔ ابتدائی طرز معاشرت کی مختلف صورتیں ہونگی ان میں سے کمزور اور نامناسب مٹتی گئی ہونگی اور قوی اور موزون بڑھتی ہونگی اور آیندہ زمانے کے ساتھ ترقی کرتی گئی ہونگی۔ غرض یہاں بھی وہی قدرتی انتخاب اور ابقاے بہترین کارفرما ہیں۔ غالباً معاشرت اور تمدن کا اصل اصول تعلق زناشوئی ہے۔ علم تاریخ اور علم الاقوام میں مناکحت کی رسمیں سب سے پہلے ملتی ہیں۔ مگر یہ بھی ارتقا پر کاربند رہی ہیں۔ اگرچہ اس کے ابتدائی مسائل اچھی طرح صاف اور واضح نہیں ہیں مگر قیاس یہ ہے کہ ابتداً انسان میں بھی توالد و تناسل کا عمل دیگر حیوانات کی طرح کسی رسم اور قاعدے کا پابند نہ ہوگا۔ اس کے بعد پہلے تعدد بعول اور پھر تعدد ازواج کا رواج ہوا۔ اب عموماً ایک شادی کا قاعدہ جاری ہے۔ آج کل شاید تعدد بعول پر تعجب کیا جاے۔ لیکن تقریباً تمام قوموں میں شروع شروع میں یہ رسم رائج رہی ہے۔ اس میں گویا عورت کو نسل افزائی کا ذریعہ قرار دے کر اسے قبیلے کا مرکز بنا دیا تھا۔ اور باپ کی خصوصیت نہ ہونے سے بچہ گویا تمام خاندان کا بچہ ہوتا تھا۔ عبرانی پیغمبروں کے زمانے تک اس کے قواعد جاری تھے۔ مثلاً کسی کے مرنے کے بعد اس کی بیوہ سے توالد و تناسل کا جاری رکھنا اس کے بھائیوں کا حق ہی نہ تھا بلکہ فرض تھا۔ آخر رفتہ رفتہ یہ طریقہ منسوخ ہوگیا۔ اور اس کی جگہ تعدد ازدواج کا رواج ہوا۔ جو اب بھی کم کم جاری ہے۔ اس میں اولاد کا تعلق محض باپ ہی سے ہوتا ہے۔ گویا وہ مرکز ہے اور عورتیں اس کے اردگرد حلقہ باندھے کھڑی ہیں۔ شادی کے بعد عورتوں کی ذاتیت اور قومیت مٹ جاتی ہے۔ اور

بچے صرف اپنے باپ کے خاندان کا جزو ہوتے ہیں۔ اب ارتقا نے ایک ہی شادی کو زیادہ مروّج کر رکھا ہے۔ مگر مرد کو اس میں بھی ابھی تک فضیلت اور فوقیت حاصل ہے۔ مال و اسباب کا انتظام اور بال بچّوں کی تربیت کا کام اسی کے سپرد ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ اولاد پکاری بھی اسی کے نام سے جاتی ہے۔ گویا آیندہ اور گزشتہ کا رابطہ اور اخلاف و اسلاف کا واسطہ مرد ہی ہوتا ہے۔ اور عورت کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ ممکن ہے کہ ارتقا سے اس رسم میں بھی انقلاب پیدا ہو جائے اور جس طرح زن و مرد دونوں بچوں کی پیدائش میں شریک ہیں۔ اسی طرح اولاد کے نام میں بھی دونوں کا اشتراک ہو جائے +

صنائع انسانی پر بھی یہی قانون ارتقا حاوی ہے۔ تمام ہنر ایک ہی اصل سے نکل کر اسی قانون کے مطابق بڑھے ہیں۔ دو تین برس کے بچے کو دیکھو کہ کیونکر جانوروں اور پرندوں کی تصویریں بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ نقاشی بھی ایک قدرتی خواہش ہے اور بچّوں کی بنائی ہوئی کتّے بلّی کی مورتیں اس فن کا بچپن دکھاتی ہیں۔ تاریخ کے ابتدائی دفینوں پر نظر ڈالیں تو وہاں بھی ایسی ہی مٹّی کی بھدی بھدی مورتیں اور ٹیڑھی بیڑھی صورتیں ملتی ہیں جن کے بنانے والے وہ ابتدائی لوگ تھے جن کا اب نام تک مٹ چکا ہے۔ یہ صورتیں وہی ہیں جن کی آج ہر ایک بچہ اپنے بچپن میں نقل اتارتا ہے۔ مگر بچے جلدی ہی بڑے ہو جاتے ہیں اور عموماً اس مصوری کو چھوڑ دیتے ہیں اور جو آدمی فطرتاً اس فن کے دلدادہ ہوتے ہیں وہ زیادہ خوبصورتی اور تراکت کے ساتھ اس کو از سر نو سیکھتے اور بار دیگر اس کی مشق کرتے ہیں۔ افراد کی زندگی کے لحاظ سے یہ زمانہ فن کا لڑکپن ہوتا ہے۔ آخر جوانی آتی ہے۔ اور اس کا نمونہ کسی عظیم الشان نمائش تصاویر میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نوع کی زندگی کے لحاظ سے بھی فن کی نشوونما اسی طرح ہوتی ہے۔ آیندہ کے نمونے ان بھدی بھدی مورتوں اور ٹیڑھی ٹیڑھی صورتوں سے جن کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ترقی کرتے کرتے زیادہ صفائی اور خوبصورتی حاصل کرتے جاتے ہیں

Marfat.com

بعض محاسن کچھ دن محاسن سمجھے جاتے ہیں۔ اور پھر قبائح بن جاتے ہیں۔ اور چھوڑ دئے جاتے ہیں۔ مصوّر مشہور ہوتے ہیں۔ اور پھر بھلا دئے جاتے ہیں۔ صرف چند برگزیدہ نام اور چند پسندیدہ کام ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ اور فن صورت نگاری بھی ایقائے بہترین کے اصول کی تصدیق کرتی ہے۔ بعینہٖ یہی حال اور علوم و فنون کا بھی ہے۔ ان میں سے کوئی علم یا کوئی فن دفعتاً پیدا نہیں ہوا۔ ابتدائی انسان نے کسی ہنر کو بھی مکمل نہیں پایا۔ کوئی کمال بھی بنا بنایا ہاتھ نہیں آیا۔ سب کے سب آہستہ آہستہ بڑی دقتوں اور محنتوں کے بعد مختلف انقلابوں اور انتخابوں کے پیچھے موجودہ رتبۂ کمال تک پہنچے ہیں۔ اور ابھی آیندہ کا لاانتہا زمانہ سامنے پڑا ہے۔ علوم ادبیہ کا بھی یہی نقشہ ہے یہ بھی بنی آدم کے ساتھ ہی پیدا ہوئے اور بڑھے ہیں۔ ابتدائی آدمیوں کے ٹوٹے پھوٹے بے جوڑ فقرے اور بھدے بھدے بے تلے لفظ ان تمام نظم و نثر کے طومار کی اصل تھے۔ جن پر آج ایک ایک قوم الگ الگ ناز کرتی ہے۔ اس میں بھی وہ ہی قانون قدرت اپنی کاٹ چھانٹ اور کتر بیونت کرتے رہے ہیں۔ اگر اس وقت ان تمام کتابوں اور تصنیفوں کو یکجا کر دیا جائے جو قدرتی انتخاب کے ظالمانہ ہاتھوں سے برباد ہو چکی ہیں۔ تو جنگل اور میدان ان کے لئے تنگ ہوں۔ اور آدمی ان بے انتہا انسانی کوششوں کو یوں رائگاں جاتے ہوئے دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ مگر اتنا یاد رکھنا چاہیے۔ کہ جو کچھ بچا ہے وہ اس مجموعے سے زیادہ قیمتی اور گویا اس کا عطر ہے۔ کوئی عمدہ کتاب یا قابل قدر نظم ایک شخص کا کام نہیں ہوتی۔ بلکہ ملک کے اس تمام زمانے کے خیالات کا نچوڑ اور ترقیوں کا سست ہوتا ہے۔ خود علم تاریخ کا بھی یہی حال ہے۔ اور علم تاریخ کی کیا خصوصیت ہے ہر شے کا یہی حال ہے اگر اس قانون کی مثالیں لکھنا چاہیں تو دفتروں میں ختم نہ ہوں۔ خود انسانی خیال اور تصوّر ہی اس کی مثال ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ خیال دی اسباب سے پیدا ہوا ہے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ انسانی قوت متخیلہ بھی ارتقا سے ہی اس درجے تک پہنچی ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہمارے وحشی بزرگ تقریباً کچھ بھی

تصور نہ کر سکتے تھے۔ ایک زمانہ یہ ہے کہ انسانیت گویا اسی ایک قوت پر مبنی ہے۔ اس قوت کے نزدیک نزدیک و دور یکساں قریب ہیں اور پست و بلند بالکل ہموار ہیں۔ اس کی بلند پروازی کے سامنے آسمان کی اونچائی بے معنی اور سمندر کی گہرائی پانی پانی ہے۔ اس کی تیز روی کے مقابلے بجلی گرد اور روشنی کا دم سرد ہے۔ کون سی مسافت ہے جو اس نے نہیں ماپی۔ کونسا راز ہے جو اس نے نہیں بھانپا۔ فضائے محیط کا میدان اس کی جولانی کے لئے تنگ ہے قدرت کی نیرنگی اس کی معاملہ فہمی سے بیرنگ ہے۔ اس کی ایک دوڑ میں زمین سے آسمان تک کے مسائل حل ہو جاتے ہیں اور اس کی ایک اڑان میں ثرائے سے ثریا تک کے حال کھل جاتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اگر انسان کو خدا تک پہنچانے والی کوئی چیز ہے تو یہی ہے۔ مگر تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ یہ بھی ہمیشہ یونہی نہیں تھا۔ ابتدائی آدمی فہم و قیاس سے معرّا۔ اور تخیّل و متصوّرہ سے مبرا تھے۔ مگر انہی میں مصری۔ یونانی۔ ہندی۔ پارسی۔ رومی اور عربی مسلمان۔ یہودی اور مسیحی۔ انگریز۔ روسی اور جاپانی غرض تمام دنیا کی قوموں کی طاقتیں مضمر تھیں۔ کچھ نہ تھے۔ مگر سب کچھ تھے۔ آخر ایک وقت آیا کہ انسان میں فکر کی طاقت شروع ہوئی۔ فہم و قیاس پیدا ہوئے تخیل اور تصور کا ظہور ہوا۔ اور تمام قوائے دماغی نے کھلنا شروع کیا۔ مگر یہ سب کچھ یکایک نہیں ہوا۔ انسان دم بھر میں نبی۔ شاعر اور فلسفی نہیں بنا۔ ایک ہی پشت میں علم الاشیا حاصل نہیں ہوا۔ خیال نے بھی دنیا کی اور تمام چیزوں کی طرح آہستہ آہستہ بتدریج ترقی کرنی شروع کی۔ اور موجودہ قوت خیال ان تمام بے انتہا عمروں کا عطر ہے۔ اسے بھی قدرتی انتخاب نے ابقائے بہترین کی آگ میں صاف کیا ہے۔ اور ابھی یہ صرف وہ حصّہ ہے جو ہم کو معلوم ہو چکا ہے۔ جو قوتیں دماغ میں چھپی ہوئی ہیں۔ یا ابھی تک ظاہر نہیں ہوئیں ان کا علم عالم الغیب کو ہے۔ ان پر بحث کرنا نہ ہمارا کام ہے نہ ہمارے لئے ممکن ہے +

جس طرح مادی اجسام کے لئے ظاہری حالات سے مناسبت ضروری ہے اسی طرح قوائے دماغی کے واسطے بھی بیرونی کیفیات سے مطابقت لازمی ہے

Marfat.com

اختلاف حالات سے قوائے دماغی بھی ادل بدل ہوتے رہتے ہیں۔ عقل وخرد کی بھی نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جن میں سے اچھی صورتیں قائم رہتی ہیں اور کم درجے کی صورتیں مٹ جاتی ہیں۔ مثلاً ابتدائے تاریخ میں ایک زمانہ تھا کہ تمام انسان افسانوں کے دلدادہ تھے۔ اور سب نے اپنے عقائد کو کہانیوں کی صورت دے رکھی تھی۔ اس کے بعد تکمیل فن کا زمانہ آیا۔ جس کی مثال اہل یونان ہیں۔ چند دن میں لوگوں کو ترتیب۔ باقاعدگی اور حکومت کا خیال آیا اور اس نے علوم وفنون کا بازار ٹھنڈا کر دیا۔ کسی زمانے میں ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا زور رہا ہے۔ کسی زمانے میں وحشیانہ رسوم کا رواج ہوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ علوم عقلی اور مسائل منطقی کا شہرہ تھا۔ آج کل عملی ترقی اور علوم طبیعی کے سر سہرا ہے۔ غرض عالم حیوانات کی طرح انسانی ترقی دماغی کی بھی قسمیں اور نوعیں ہیں۔ اس کو بھی کشاکش ہستی میں سینکڑوں مخالف طاقتوں سے جان بچانی ہوتی ہے۔ جانوروں کے لئے آب وہوا کی ناموافقت اور اپنے بیگانے سے دائمی مجادلت باعث خطر تھی۔ ترقی دماغی کے لئے شکوک وشبہات کی پھسلن اور پرانے مسائل ومعتقدات سے ان بن کافی سدراہ ہے۔ امید ایک طرف کھینچتی ہے۔ خوف دوسری طرف لے جاتا ہے۔ غم اور خوشی۔ رنج اور راحت موجودہ سے بیزاری اور معدوم کی امیدواری۔ رازجوئی اور عالی خیالی۔ غرض موت اور زندگی کی تمام حالتوں نے ترقی دماغ پر اپنا مفید یا مضر اثر دکھایا ہے۔ اور طرح طرح کے تغیر وتبدل کے بعد اس کی یہ موجودہ صورت پیدا کر دی ہے۔

اخلاقی حالت کی سرحد بھی دماغی قوت سے لگی ہوئی ہے۔ نہ اس کے وجود سے انکار ہو سکتا ہے۔ نہ اس کے مختلف مدارج ترقی کی تردید کی جا سکتی ہے۔ وسط افریقہ اور وادی امیزان میں ابھی تک ایسی قومیں آباد ہیں جن میں اخلاقی حالت النادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے۔ مہذب ملکوں میں ایسے لوگ بھی ہیں۔ جن کی اخلاقی طاقت تمام قوائے اور جذبات پر مسلط اور محیط ہے ضمیر کی آواز وحشیانہ اقوام میں عموماً نہایت پست اور کمزور۔ اور اعلیٰ درجے

کی قوموں میں انتہا درجے کی بلند اور سوبلی ہوتی ہے۔ نیکی اور بدی کا معیار یہی ہے۔ ظلم اور انصاف۔ دناءت اور شرافت۔ خست اور سخاوت۔ پست فطرتی اور عالی ہمتی۔ گنہگاری اور نکوکاری کے تمام درمیانی مدارج اسی سے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اسی سے قائم ہیں۔ مگر اس کی موجودہ دفعت کے ساتھ ہی اس ہولناک کشاکش کا بھی خیال کرنا چاہیئے جو ضمیر کو ترقی کے راستے میں پیش آئی ہے۔ کونسی محنت اور مصیبت تھی جو اس نے نہیں جھیلی۔ کون سا امتحان یا ابتلا تھا جس میں یہ مبتلا نہ ہوئی۔ دنیا کے بے انتہا مذہب اور ہر ایک مذہب کے لا محدود فرقے اور ہر ایک فرقے کے بے شمار اختلافات اس بات کے شاہد ہیں۔ ضمیر بھی بیرونی کیفیات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہی ہے۔ جوں جوں کوئی قوم وحشیانہ حالت سے شائستگی اور تہذیب کی طرف بڑھتی گئی۔ اسی نسبت سے اخلاقی حالت بھی ترقی کرتی گئی اور اس کا معیار زیادہ سخت اور زیادہ عمدہ ہوتا گیا۔ جب توحش کم ہؤا تو دیانت داری اور انصاف کی ضرورت ہوئی۔ تمدن و معاشرت کی ابتدا ہوئی تو عفت و عصمت کی حاجت پڑی۔ جسمانی اور دماغی حالت کی بہتری کے ساتھ راست بازی۔ غیرت۔ خودداری وغیرہ خوبیاں بڑھیں۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ اخلاقی حالت میں بھی وہی کشاکش ہستی وہی اختلاف انواع و اقسام اور وہی ابقاے بہترین کے اصول موثر اور کارگر ہیں ✦

سب سے آخر میں ہر فرد بشر خود ہی ایک بقیہ نتیجہ اور ارتقا کی ایک مثال ہے پُرانے زمانے میں ہر ایک آدمی خود ایک مسبب الاسباب اور ایک زندہ طاقت کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ کیونکہ بظاہر تمام واقعات۔ تمام حالات اس کی ارادے اور اس کے عزم پر مبنی تھے۔ زندگی کے سارے ساز و سامان انسان کی محنت اور کوشش کا نتیجہ تھے۔ اسی لحاظ سے آدمی تمام اشیا پر مقدم اور مفتخر تھا۔ شہروں کا بنانے والا۔ جنگلوں کا بسانے والا۔ نہروں کا نکالنے والا۔ ملکوں کو فتح کرنے والا وہی تھا۔ علم و ہنر کا بانی۔ بحر و بر پر لاثانی۔ زمین پیرا۔ آسمان پیما۔ وہی تھا۔ مگر حال میں قوانین قدرت کے راز کھلتے جاتے ہیں اور انسان کا رتبہ بدلتا جاتا ہے۔ اب مسبب الاسباب ہونے کی بجاے وہ خود اسباب

Marfat.com

کا آوردہ۔ اور خود طاقت ہونے کی جگہ اور طاقتوں کا پیدا کردہ سمجھا جاتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کی قوت فاعلہ میں کچھ کمی ہو گئی ہے۔ یا وہ فاعل مختار نہیں رہا ہے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ وہ خود گزشتہ اور موجودہ حالات کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ خود ان حالات اور کیفیات کا نتیجہ ہے۔ جو اس کی ہستی سے صدیوں پہلے سے کارفرما تھے۔ ان تمام طاقتوں نے متفق اور متحد ہو کر ہر فرد بشر کو وہ بنا دیا جو کچھ کہ وہ ہے۔ اگرچہ ایک خاص حد تک اس کی ذہنی اور دماغی طاقتیں اسی کے قبضے میں ہیں اور وہ خود فاعل مختار ہے۔ اگرچہ ایک درجے تک کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کے قوائے پر اُس کے ارادے کے سوا اور کسی بالائی قوت کا اثر نہیں ہے۔ اور اس کو اپنے حالات و خیالات پر اختیار ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ ہر ایک آدمی ایک زمانے کا نتیجہ اور ایک عمر کا خلاصہ ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک ماں باپ کا بچہ نہیں ہے۔ بلکہ ان تمام آدمیوں کا بیٹا ہے۔ جو اس کے خاندان میں ابتدائے آدم سے اس وقت تک گزر چکے ہیں۔ یہ بات ہر فرد بشر کے حق میں درست ہے کہ وہ وہی بن سکتا ہے۔ جو اس کے ماں باپ۔ حسب نسب اعزا و اقربا۔ تعلیم و تربیت اور موافقت وقت نے اسے بنا دیا ہے۔ کوئی شخص اپنی قومیت نہیں بدل سکتا۔ کوئی آدمی اپنی خوشی سے کسی خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔ کسی انسان نے اپنے قبیلے کا نام اور کام خود مقرر نہیں کیا۔ جو بے بسی اصل و نسل بدلنے میں ہے۔ وہی بیچارگی ان حالات کے تغیر میں بھی ہے۔ جو اس شخص کا رتبہ اور درجہ مقرر کرنے والے ہیں۔ ایک بچہ وسط افریقہ کے حبشی کی جھونپڑی میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک بچہ شاہ جرمنی کے پرشوکت محل میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک آدمی اسکیمو کے برفانی گھر میں دنیا میں آتا ہے۔ ایک آدمی اصفہان کے ایرانی قالینوں پر ہوتا ہے۔ کوئی ناپیدا کنار صحرا میں اونٹ کے ڈگمگاتے ہوئے کجاوے میں ہوتا ہے۔ کوئی سلطنت برطانیہ کے رات دن گونجتے اور گرجتے ہوئے دار الخلافے میں جنم لیتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہاں انسان بالکل ہی ناچار اور بے اختیار ہے۔ ریت کا ایک ذرہ ہے کہ ہوائیں اسے جدھر چاہتی ہیں اڑائے لئے جاتی ہیں۔ گھاس کا ایک پتہ ہے کہ بحر مواج کی لہریں ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بہائے

Marfat.com

لئے پھرتی ہیں۔ اسی طرح حالات مابعد بھی مقرر ہوتے ہیں۔ خود اختیاری نہیں ہوتے۔ کہتے ہیں کہ شاعر مادرزاد شاعر ہوتے ہیں۔ بجا۔ لیکن اگر زمانہ موافق نہ ہو تو پھر؟ اگر پہلے حالات مدد نہ کریں تو پھر؟ اگر اس کی زبان کی وسعت اجازت نہ دے تو پھر؟ اگر جسمانی صحت یا مخالف واقعات روکدیں تو پھر؟ کہتے ہیں کہ تیمور اور نپولین ماں کے پیٹ ہی سے ایسے اولوالعزم اور عالی ہمت پیدا ہوئے تھے۔ ٹھیک۔ لیکن زمانہ امن میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔ غیر قوم میں کوئی پیدا نہیں ہوا۔ مدبر اور مقنن۔ ادیب اور فلسفی۔ سب اپنی پیدائش سے پہلے کے واقعات کے ممنون ہیں۔ اپنے زمانے کے رسم ورواج اور حالات وخیالات کے احسان مند ہیں۔ نہیں بلکہ خود اپنی طاقتوں کی ترقی اور تکمیل کے لئے کسی اہم واقعے یا زبردست حادثے کے بھی محتاج ہیں۔ جب تک یہ سامان نہ ہوں تب تک ان کی تمام مادرزاد قوتیں بھی مل کر کچھ نہیں کرسکتیں۔

ہم اس بحث پر بیجا زور اور مبالغہ آمیز طول دینا نہیں چاہتے۔ مگر یہ بات کہ ہر فرد بشر مختلف واقعات کا آوردہ اور اپنے سے زیادہ زبردست اور قدیمی طاقتوں کا پیدا کردہ ہے۔ اتنی بدیہی اور ظاہری ہے کہ اس کے لئے دلیل اور ثبوت کی ضرورت نہیں۔ جو حال افراد کا ہے۔ وہی ان کی قوموں اور نسلوں کا ہے۔ قومیں اور نسلیں بھی بیرونی طاقتوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ یقینی صرف مقامی کیفیات تو قوموں کو نہیں بنا سکتیں۔ انسان کی اپنی طبیعت اور ارادے کا بھی کچھ اثر ہوتا ہے۔ چیزیں ڈھالنے کے لئے سانچے تو بیشک ضروری ہیں۔ مگر ان سانچوں میں ڈالنے کے لئے کوئی مادہ بھی تو ہونا چاہیئے۔ یہ کہنا بجا نہیں کہ اسکیمو منطقۂ باردہ کا اور بدوی نخلستان عرب کا اور ہندوستانی وادی گنگا کا اور حبشی صحرائے افریقہ کا بنایا ہوا ہے۔ ہاں یہ سچ ہے کہ ان مقامی حالتوں کا اثر بھی انسانی خو پر بہت زبردست ہوتا ہے۔

مختلف نسلوں نے اپنے طبعی میلان اور فطری رغبت کی وجہ سے خاص خاص پہلوؤں پر ترقی کی ہے۔ اور ان کا ما بہ الامتیاز اثر نمایاں ہوتا ہے۔

قومیں قدرت کی محقق۔ اسباب کی متلاشی۔ دنیا کی فاتح اور علم و فن کی موجد تھیں۔ سمیا طیقی قومیں قدیم مذہبوں کی بانی۔ اور رسم و رواج کی مُبدع تھیں۔ اُنہوں نے قدرت کی گھٹا اور کائنات کے بادل کے پرے شان آلہی اور جلال ایزدی کا مشاہدہ کیا اور اسی کے سامنے سر تسلیم جھکایا۔ آگے چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ انہی کے ایک گروہ نے تمام اقوام پیشین کے محاسن اس طرح جمع کر لئے جیسے پارہ سونے کے ذرّے تمام حشو و زوائد کو چھوڑ کر نکال لیتا ہے۔ حمیا طیقی لوگ ابتدائی زمانے کے معمار تھے۔ کہ مصر اور کلدان کے معابد، مقابر۔ محل اور اہرام آج تک زبان حال سے ان کے شاہد کمال ہیں +

باب چہار دہم

مسئلۂ ارتقا پر چند اعتراض اور اُنکے جواب

گزشتہ باب میں ہم نے مسئلۂ ارتقا کی چند نمایاں اور واضح مثالیں پیش کر دی ہیں۔ اگرچہ مسئلے کی اہمیت اور عمومیت کے لحاظ سے بہت کم ہیں مگر پھر بھی انسان اور انسان کی متعلقہ اشیا کی طرز آفرینش اور اس مسئلے کا باہمی لگاؤ دکھانے کے لئے کافی ہیں۔ اور اب غالباً اس مسئلے کی زیادہ توضیح و تشریح کی حاجت نہ ہوگی۔ لیکن مضمون کو ختم کرنے سے پہلے چند عام اعتراضوں پر بھی غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو بعض اصحاب کے نزدیک اس مسئلے کی قبولیت کے اختیار کرنے میں مانع ہیں۔ اور اس پر اعتبار کرنے میں حائل ہیں +

پہلا اعتراض تو یہ ہے کہ یہ مسئلہ انسان کو ذلیل الاصل اور رذیل النسل قرار دے کر اس کے مطیع اور محکوم جانوروں کو اس کا ہم قوم اور ہمسر ٹھہراتا ہے۔ انسان باقی تمام حیوانات سے ممیز اور ممتاز ہے۔ اسی کو اپنی دماغی قوتوں

Marfat.com

اور روحانی طاقتوں پر ناز اور بجا ناز ہے۔ کیونکہ ان باتوں میں اعلےٰ سے اعلےٰ طبقے کے جانور اس کے ادنےٰ سے ادنےٰ نمونے سے بھی آنکھ نہیں ملا سکتے۔ اور کسی حیوان میں ان خوبیوں کا پرتو تک نہیں پڑا۔ انسان کی بزرگی اور شرافت طبعاً اس کو ان حیوانات لایعقل سے دور کھینچتی ہے۔ اور کسی ایسے خیال کو دل نشین نہیں ہونے دیتی جو اس درمیانی بُعد کو کم کرے۔ جب سے نوع انسان نے ہوش سنبھالا۔ اس نے یا تو جانوروں کو اپنا محکوم اور فرمانبردار پایا۔ یا اپنے سامنے مغلوب اور خوار دیکھا۔ اور اب انہی سے کوئی رشتہ جوڑنا یا ان کو اپنا ہم نسب خیال کرنا اس کی انانیت اور خودداری کے خلاف ہے چونکہ ارتقا کا اصول اس مشارکت اور مقارنت پر زور دیتا ہے۔ اس لئے فطرتاً مردود اور ناقابل قبول ہے۔

اس اعتراض سے اعراض نہیں کیا جا سکتا۔ غور سے دیکھنا چاہئے کہ مسئلہ ارتقا کے مطابق یہ طبعی خیال خود بھی ایک ابتدائی جرم سے بن کر مختلف تغیّر و تبدل کے بعد اس درجے تک پہنچا ہوگا۔ اگر اس کا جواب عقل صحیح کے مطابق مدلل ثبوت کے ساتھ دیا جائے۔ تب تو اس کا ذہن سے نکلنا ممکن ہوگا۔ ورنہ محال ہے۔ اس اعتراض کو پوری فراخ حوصلگی اور بے تعصبی سے دیکھنا چاہئے۔ تاریخ کو ان ذرا ذرا سے اعتراضوں اور چھوٹے چھوٹے عقیدوں سے کیا بحث ہے۔ یہ وہ تماشا ہے جسے صانع مطلق چاند اور سورج کی روشنی میں ساری دنیا کے آدمیوں سے کروا رہا ہے۔ جس کا ایک ایک لفظ قدرت اپنے ہاتھ سے طبقات الارض کے ورقوں پر کندہ کرتی ہے۔ تاریخ کو سخن پروری اور طرف داری سے کیا سروکار۔ میزان عدل کسی طرف خواہ نخواہ نہیں جھکتی۔ اصلی تاریخ کذب و دروغ کے نام سے ناآشنا اور تعصب اور رو و رعایت کے مضمون سے ناواقف ہے (اور جو ایسی نہ ہو وہ تاریخ نہیں) بہرحال اس میں شک نہیں کہ یہ اعتراض طبعی ہے۔ اور اس کا جواب ضروری۔ اس کے لئے دیکھنا یہ ہے کہ اس اعتراض میں حقیقت اور حقیّت کہاں تک ہے۔ اس کے لئے سب سے زیادہ

Marfat.com

مناسب یہ ہے کہ ہم افراد انسانی کی زندگی پر نظر ڈالیں۔ اس کی ابتدا تو نہایت پست اور بے وقعت ہے۔ ہر فرد بشر کی ہستی کا آغاز مادے اور طاقت کے باہمی تاثیر اور تاثّر کے تاریک پردوں میں چھپا ہوا ہے۔ کس اعتبار سے کہیں کہ انسان کی زندگی شروع ہو گئی۔ حالت تو یہ ہے کہ اس کا ابتدائی جرم نظر آنے کے لئے طاقتور خرد بین کا محتاج ہے۔ اور مچھر اور چیونٹی سے بھی ہزاروں لاکھوں گنا چھوٹا ہے۔ یہ کچھ منطقیانہ بحث یا من گھڑت افسانہ نہیں ہے۔ بلکہ روزمرہ کا ایک معمولی مشاہدہ ہے۔ جو سائنس کے نہایت معتبر آلات سے تحقیق کیا گیا ہے۔

اس سے آگے چلیں تو آگے بھی وہی کیفیّت ہے۔ وجود انسانی کے ابتدائی مدارج بھی کسی طرح اور جانوروں کی اسی حالت سے ممتاز نہیں ہوتے۔ قدرت انسان کے بچے کو بھی اسی سانچے میں ڈھالتی ہے۔ جس میں سے وہ اعلےٰ طبقے کے جانوروں کو نکالتی ہے۔ معزور سے معزور بادشاہ عقلمند سے عقلمند فلسفی بڑے سے بڑا حکیم آئے۔ اور اپنے بچّے کو کتّے کے پلّے اور مرغی کے چوزے سے تمیز کر لے۔ قدرت نے ابھی تک اسے اوروں سے ممتاز نہیں کیا۔ ابھی تک اس کی خصوصیت آئندہ انقلابات کی محتاج ہے۔ ابھی تک سائنس کی باریک سے باریک تحقیقات اس میں اور اور جانوروں میں کوئی مابہ الامتیاز نہیں پاتی۔ پھر جب امتیاز پیدا ہونے بھی لگتا ہے تو یکایک نہیں ہو جاتا۔ بلکہ نہایت آہستہ آہستہ رفتہ رفتہ۔ اور بہت دقّت اور بہت دشواری سے۔ گویا قدرت کے نزدیک اس کی کچھ وقعت ہی نہیں۔ آخرکار انسانی جنین اور جانوروں سے الگ ہونے لگتا ہے۔ اور اور جانور اس سے جدا ہونے لگتے ہیں۔ ایک انسانیت کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک فرسیت کی طرف ایک کلبیت کی طرف۔ غرض جب دنیا میں آنے کے دن بالکل سر پہ آجاتے ہیں۔ تو جنین بھی اپنے ماں باپ کی پوری صورت حاصل کر چکا ہوتا ہے۔ مگر پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد بھی عرصے تک آدمی کے بچے کی حالت نہایت ناقص اور نامکمل رہتی ہے۔ اس کی تمام قوتیں نشوونما کی محتاج ہوتی

Marfat.com

ہیں۔ عقل و تمیز کا تو نام بھی نہیں ہوتا۔ پیدائش کے وقت ادنےٰ درجے کے جانوروں کی سمجھ بوجھ اور عقل و تمیز تو پیدا شدہ انسانی بچے سے بدرجہا زیادہ ہوتی ہے۔ یہی حال جسمانی طاقت کا بھی ہے۔ بچہ کھڑا ہونا اور چلنا کیا اٹھ بیٹھ بھی نہیں سکتا۔ غالباً دنیا کی تمام ذیحیات چیزوں میں انسان کا بچہ سب سے زیادہ بے کس اور بے بس ہوتا ہے۔ ؎

مرغک از بیضہ بروں آید و روزی طلبد ✤ آدمی زادہ ندارد خرد و ہوش و تمیز

اس سے بھی آگے چلیں تو بچپن کی شروع کی حرکات بھی کسی آئندہ ترقی کی صاف شہادت نہیں دیتیں۔ اگر بچے کو چھوڑ دیا جائے تو وہ فضول ہاتھ پاؤں مارنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عقل و تمیز کی ترقی تو نہایت ہی دھیمی اور آہستہ ہوتی ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ بچے کی ابتدائی دماغی حالت کتنی ادنےٰ اور پست ہے۔ مہینوں تک رونے کے سوا اور کوئی بات نہیں ہوتی۔ اور یہ رونا بھی اور جانوروں اور پرندوں کی آواز سے کچھ علیحدہ نہیں ہوتا۔ گویائی کی ابتدا پر غور کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے فطرتاً دو حرفی لفظ منہ سے نکلتے ہیں۔ مگر ان محض مہمل اور بے معنی آوازوں کو لفظ کہنا صحیح نہیں۔ آخر خدا خدا کر کے بڑی مشکلوں سے ان آوازوں میں بعض الفاظ کی جھلک پڑتی ہے۔ کئی دن یہی حالت رہتی ہے۔ اور پھر ایک لفظ زبان پر چڑھتا ہے۔ مہینوں بعد ایک لفظ آدر۔ اور پھر ہفتوں بعد ایک اور سبحان اللہ متنبی اور خاقانی کی قادر البیانی شیکسپیر اور ملٹن کی سخن رانی۔ اور سعدی اور حافظ کی شیریں زبانی کی کیا اچھی ابتدا اور کیا عمدہ آغاز ہے۔ اس حالت میں جسمانی حرکات و سکنات عقل حیوانی کی زیر اثر ہوتی ہیں۔ آخر برسوں میں بچہ کو سیدھا کھڑا ہونا آتا ہے۔ ہنسنا۔ بولنا۔ اور تعجب یہ کہ محبت کرنا بھی آجاتا ہے۔ اب تمیز بھی آتی جاتی ہے۔ گویا اب تک حیوان تھا۔ اب انسان بنتا جاتا ہے۔ یہاں سے عقل کا کمال شروع ہوتا ہے۔ بچپن کی ضد اور لڑکپن کا کھیل کود گزر جاتا ہے۔ جوانی آتی ہے۔ ساتھ ہی جسمانی اور دماغی طاقتیں بھی جوان ہوتی ہیں۔ مگر افسوس کتنے آدمی ہیں جو اس درجہ کمال تک صحیح سالم پہنچتے ہیں۔

Marfat.com

اور کتنے آدمی ہیں جو غلطیوں کی پھسلنوں اور بداعمالیوں کی دلدلوں میں پھنسکر اپنی ناشدنی زندگی کے دن جانوروں کی طرح بسر کرتے ہیں *

یہاں اس بیان سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ابتدائی حالت اور شروع کی کیفیت معلوم ہو جائے۔ کوئی فرد بشر اپنی ابتدائے ہستی کی انتہائے پستی سے انکار نہیں کر سکتا۔ اسے ماننا پڑتا ہے کہ اس کی پیدائش اور جانوروں کی پیدائش سے مشابہ کیا معنی بعینہ یکساں ہوئی تھی۔ ہر عقلمند آدمی یہ بات تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ ایک وقت تھا۔ کہ اس کی زمین و آسمان کو گھیرنے والی طاقتیں اُسی کے ایک نہایت ہی چھوٹے ذرے میں بند تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ اپنی ماں کے رحم میں محض گوشت کا لوتھڑا تھا۔ جس میں عقل و تمیز کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ پھر جب وہ پیدا ہوا تو اس کی کمزوری اور نادانی کی کیا حالت تھی۔ اور بڑے ہونے پر بھی سال دو سال تک اس کی زندگی کس قدر جانورانہ تھی۔ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ اس میں اس سے بھی کم عقل تھی۔ جتنی ادنے سے ادنے اور حقیر سے حقیر کیڑے کے بچے میں ہوتی ہے۔ اگر اور لوگ اس پر جان قربان نہ کرتے اور دم نہ چھڑکتے تو یہ بچہ پروان نہ چڑھتا۔ اور یہ حیوان انسان نہ بنتا۔ مگر کیا یہ حقیر ابتدا اور مبتذل آغاز خفت اور خجالت کا باعث ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ عقلمند آدمی کے لئے یہ انتہائے ترقی اور معراج کمال ہی سرمایۂ ناز اور موجب فخر ہے۔ کیا کوئی معقول پسند شخص اپنے کسی زمانے میں جنین اور شیر خوار ہونے پر شرمسار ہو سکتا ہے۔ یہ تو نہایت خوشی کی بات ہے کہ وہ جرم جس کو قدرت نے اور جانوروں سے مشابہ بنایا تھا نشوونما کی ترقی سے کس حسن و جمال اور کس فضل و کمال تک پہنچا ہے۔ کہ تمام عالم اس کے زیر قدم ہے۔ زمین اور آسمان کے اسرار اس کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ بر و بحر کے نقشے اس کی نظر میں جمے ہوئے ہیں۔ تاروں بھرا آسمان اس کے سر پہ چتر شاہی ہے۔ اور اس بیرونی مادی دنیا کے علاوہ خود اس کا دماغی اور روحانی عالم اس کے پاس ہے۔ خیال اور تصور۔ ارادہ اور عزم۔ ان نیچیوں سے بحر و بر اپنے جواہر اس کے قدموں پر ڈال دیتے ہیں۔ ان قسموں

Marfat.com

سے فضائے محیط اپنے بھید اس کے سامنے کھول دیتی ہے سان چلے
جادوؤں سے بے انتہا گزرے ہوئے وقت اور لا محدود آنے والے زمانے
اپنے رموز اسے بتا دیتے ہیں ۔

پس جب ہر فرد بشر کی یہ کیفیت ہے تو نوع کی آفرینش پر اعتراض کیوں ہو۔ اگر نوع کی محض بخیال خود کم نسبی باعث ننگ ہے تو ہر فرد کی اپنی ابتدائے ہستی کی پستی سے بوجہ اولے عار ہونا چاہیئے۔ اور جب خود اپنی دناءت سے شرم نہیں تو اس نہایت بعید آغاز نوع کی حیوانیت سے کیا خفت۔ کیا کوئی دانا آدمی ہزار ہا برس پہلے جانوروں کو اپنا ہم قوم خیال کرنے سے شرما سکتا ہے۔ جبکہ آج بھی اس کے نوزائیدہ بیٹے میں اپنے ہم سن گھوڑے کے بچھیرے اور گائے کے بچھڑے کے برابر عقل نہیں۔ ہمارے خیال میں تو عقلمند شخص کو ان نامعلوم جانداروں کی اولاد ہونے سے انکار کرنا نہ چاہیئے جن میں تمام موجودہ اور گزشتہ جانوروں اور آدمیوں کی جسمانی اور روحانی طاقتیں مضمر تھیں۔ ان ہزاروں برس پہلے کے آبا و اجداد کی پستی پر شرمندہ ہونے سے پہلے آدمی کو خود اپنے اعمال و افعال کو بے لوث بنانا بدرجہا بہتر اور ضروری ہے۔ جو بزرگ دو تین پشت دور ہو جاتے ہیں۔ ان کے کاروبار سے بھی ان کی اولاد کو سروکار یا ننگ و عار نہیں رہتا۔ چہ جائیکہ ان پرانے آدمیوں کی سادہ اور بے تکلف زندگی پر ندامت اٹھائی جائے۔ جن کو قدرت نے اس وقت تک ان قوا سے سرفراز نہیں کیا تھا۔ جو آج ہمارے لئے مایۂ ناز ہیں۔ زمانہ بہت بڑا بھلانے والا ہے۔ بڑے سے بڑا غم اور سخت سے سخت رنج بھی چند دن یا چند مہینوں سے زیادہ نہیں رہتا۔ عالی شان جہاز اور سر بفلک پہاڑ جب دور ہوتے جاتے ہیں تو چھوٹے بھی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور آخر افق میں ایک دھبا سا رہ جا ہیں۔ قابل غور وہی امور ہیں جو خود ہماری ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ آدمی کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ خود اس کے اپنے حالات اور واقعات ہیں۔ اس کے بعد اس کی قوم اور اس کے خاندان کی وہ باتیں جن

Marfat.com

کے دیکھنے اور سننے والے اس کے سامنے موجود ہیں۔ اس سے بھی کم وہ واقعات عالم جو مورخ کی کوشش اور آثار قدیمہ کے متلاشی کی محنت سے قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان سب سے کم تعلق اس مضمون سے ہے جو ان ابتدائی لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے۔ جن کو گزرے ہوئے ہزاروں نسلیں اور سینکڑوں صدیں گزر گئیں۔ جن کے حالات اتنے مختلف ہلوم وفنون کی طاقتور دوربینوں کی مدد سے بھی ایسے دُھندلے اور مٹے مٹے نظر آتے ہیں جیسے کہ ہم اوپر کے بادلوں میں دیکھ چکے ہیں۔ ان دور دراز کے رشتہ داروں کا بن مانس سے مشابہ ہونا کسی شخص کے خود بدمعاش یا اس کے دادا کے چور ہونے کی نسبت ہزاروں لاکھوں حصّے کم شرمناک اور باعث ننگ ہے +

مذکورہ بحث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دون حسبی کا اعتراض ازروے عادت ہے۔ عقلاً صحیح نہیں ہے۔ سنتے سنتے اور کہتے کہتے ہر شخص کے دل میں یہ بات جم گئی ہے۔ مگر اس کی کچھ اصل نہیں۔ اگرچہ یہ خود داری کا خیال چنداں بُرا نہیں کہا جا سکتا۔ مگر اس میں شک نہیں کہ کسی امر واقعی کی تردید نہیں کر سکتا۔ اور عقل صحیح اور واقعات حقیقی کے سامنے کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ انسان کی ابتدائی کیفیت کے متعلق ست جگ کا خیال بھی لوگوں کے دل میں بہت جما ہوا ہے۔ اکثر قومیں تاریخی زمانے سے پہلے کی حالت کو بہت عمدہ اور پسندیدہ سمجھا کرتی تھیں۔ یونان اور روما کے شاعروں کو یہ مضمون بہت پسند تھا۔ وہ اس زمانے کی یاد میں گیت گایا کرتے تھے جس میں ان کے نزدیک آدمی بھی دیوتاؤں سے کچھ کم نہ تھے۔ ان کے قد وقامت زور وطاقت۔ پاکبازی وصداقت اور امن وراحت غرض سب باتیں ان لوگوں کے نزدیک قابل رشک تھیں۔ ان کی زندگی گویا جنت میں گزرتی تھی۔ دن کو سرسبز جنگلوں اور سدا بہار گلزاروں میں قدرت کے دل ربا منظر دیکھتے تھے۔ رات کو ایک جگہ بیٹھ کر حکمت اور عقلمندی کی باتوں سے ایک دوسرے کو آگاہ کرتے تھے۔ یہ دل کش سماں اکثر یونانیوں اور رومیوں کے دل کو گدگدایا

Marfat.com

کرتا تھا۔ اور ان کو اس ابتدائی خوشحالی کا وقت یاد دلایا کرتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خیال بہت پرانا تھا۔ اور اسی زمانے میں دل نشین ہو چکا تھا جب تمام آریا نسلیں یکجا رہتی تھیں۔ اور یونانی یونانی اور رومی رومی نہ بنے تھے۔ قومی مہاجرت میں اور چیزوں کے ساتھ ست جگ کا اعتقاد بھی یورپ میں ایشیا کی طرف سے آیا۔ اور رومۃ الکبرے کی عالیشان فتوحات کے سبب سے تمام عالم میں شائع ہو گیا۔ جب مسیحیت کا زور ہوا تو باغ عدن اور ابتدائے آدم کا قصہ مذہبی پیرائے میں اکثر اور بھی زیادہ ذہن نشین ہو گیا۔ اور نئے مذہب کی روز افزوں پراگندگی سے آغاز آفرینش کے آرام و آسائش کا خیال بھی پھیلتا گیا۔ قرون مظلمہ کی قابل افسوس ظلمت اور ظلم سے اس خیال کی اور بھی تائید اور تاکید ہوئی۔ اندنوں ہر چیز رو بزوال معلوم ہوتی تھی روما کی سلطنت کمزور ہو کر ٹوٹ چکی تھی۔ وحشیوں کا زور زورہ تھا۔ ظلم و ستم کا دور دورہ تھا۔ تمدن اور معاشرت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ تمام یورپ پر تاریکی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ تنزل انسانی کا خیال پھیل گیا جس سے رہی سہی امید ٹوٹ گئی اور بچے کھچے حوصلے پست ہو گئے۔ قیامت کی تصویر سب کی آنکھوں میں پھر گئی۔ اور سب لوگ راضی برضا اور آمادۂ قضا ہو گئے *

یہ مایوسی کا چھلاوہ مسیحیت کی کئی ابتدائی صدیوں تک لوگوں کو ڈراتا رہا آدمی اس ابتدائی حالت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اور موجودہ گردش ایام اور مصائب و آلام کے مقابلے میں ابتدائی وطن باغ عدن کی تصویر اور بھی دل کش اور خوشنما معلوم ہوتی تھی ؎

من ملک بودم و فردوس بریں جا یم بود * آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

ان تمام مختلف حالات و خیالات سے لوگوں کے دلوں میں ابتدائی ست جگ کا عقیدہ اور مابعد کی ترقی معکوس کا اعتقاد اچھی طرح راسخ اور مستحکم ہو گیا۔ آخر صدیوں بعد جب قرون وسطیٰ کے خواب گراں سے آنکھ کھلی اور دیکھا کہ ابھی تک نسل انسان فنا نہیں ہوئی۔ اور قیامت نہیں آئی۔ اور ساتھ ہی ترقی کے

Marfat.com

آثار نمایاں ہوئے تو پرانے اعتقادات اور نئے خیالات میں کشاکش ہستی کی ابتدا ہوئی۔ یورپ میں جہاں نئی تحقیقات نے جنم لیا تھا وہاں علمائے ملت نے ہر بات کو مذہبی تقدس اور دینی بزرگی کا لباس پہنا رکھا تھا۔ ابتدائے آفرینش کے لئے کتاب پیدائش کا بیان منجانب اللہ سمجھا جاتا تھا۔ اور جو اس کے لغوی معنوں کی مخالفت کرتا تھا۔ وہ گویا خدا کا دشمن اور قابل گردن زدن تھا۔ علوم طبعیات کے تمام شعبے اسی بلا میں مبتلا تھے۔ لوگوں کا ایمان تھا کہ کرۂ ارض کائنات کا مرکز اور سورج اور تمام سیارے اس کے گرد گردش کر رہے ہیں۔ اس کے خلاف کہنا زمین و آسمان کو زیر و زبر کرنا تھا۔ اس طرح علم ہیئت کی بنیاد ہی توڑ دی گئی۔ کتاب پیدائش میں دنیا و مافیہا کی پیدائش کے لئے چھ دن ٹھہرائے تھے۔ علم طبقات الارض کی تحقیقات جس سے زمین کی باترتیب آفرینش کے لئے کروڑہا کروڑ برس کی ضرورت تھی۔ کتاب انجیل کے جواب میں کتاب دجال سمجھی گئی۔ اور تمام دنیا کو بددین اور بے ایمان بنانے کی ایک ترکیب خیال کی گئی۔ اور جب دلائل عقلی سے کام چلتا نظر نہ آیا تو آتش و تیغ سے کام لیا گیا۔ اور ہزاروں محقق ناکردہ گناہ عقل انسانی کو ترقی دینے کے جرم میں جیتے جی جلا دئے گئے یا سولی پر چڑھا دئے گئے۔ ؎

بجرم عشق توام میکشند و غوغائیست ✤ تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

یہ ظلم و ستم علوم ہیئت اور طبقات الارض سے ہی مخصوص نہ تھا۔ بلکہ ہر ایک نئے علم و فن سے یہی سلوک کیا گیا۔ یہاں تک کہ فن تشریح اور علم طب بھی بایہ کفر اور باعث قتل بن گئے۔ اور یہ سب کچھ محض اسلئے کہ یہ علوم ان ہزارہا برس پہلے کے بزرگوں کے پرانے قصوں اور افسانوں کے لفظی ترجمے سے کہیں مختلف تھے ✤

مسئلہ ارتقا کی قدر و قیمت کا اندازہ کرتے ہوئے ان تمام باتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ مسئلہ بہت سے قدیمی عقیدوں کے نزدیک قابل نفرت اور لائق نفریں ہے۔ مگر چونکہ یہ عقیدے صرف وضعی اور نقلی ہیں عقلی و اصلی اور حقیقی و واقعی نہیں۔ اس لئے آثار

Marfat.com

حیات کے اس زیادہ صحیح مسئلے کے مقابلے میں قابل وقعت نہیں ہوسکتے جس طرح کوپرنکس کی ریاضی اور گلیلیو کی دوربین کے سامنے گردش زمین کا عقیدہ نہیں جم سکتا۔ جس طرح علم طبقات الارض کی باقاعدہ اور عالمانہ تحقیق کے سامنے کائنات کی خلقت شش روزہ کا خیال صحیح نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ست جگ کا موہوم گمان تاریخ کی اس تمام با اصول اور دقیق تحقیق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا جس سے ابتدائی انسانوں کی جانورانہ حالت اور وحشیانہ معاشرت کا صاف اور یقینی سراغ ملتا ہے۔ بہرحال یہ ضرور ہے کہ دونوں فریقوں میں وجہ مخالفت اصل واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ محض طرز عمل ہے۔ آثار حیات کی ابتدا کبھی نہ کبھی۔ کہیں نہ کہیں۔ اور کسی نہ کسی طرح ہوئی اور ضرور ہوئی دنیا ہمیشہ سے آباد نہ تھی۔ زندگی کی ابتدا کی گئی اور اب اس کی نمایاں ترقی محتاج بیان نہیں ہے۔ اس لئے کلام صرف اس بات میں ہوسکتا ہے کہ یہ زندگی کی ابتدا کب ہوئی۔ کہاں ہوئی اور کیونکر ہوئی؟ آیا یکایک ہوگئی یا رفتہ رفتہ ہوئی اس امر میں بحث نہیں ہے کہ ہوئی بھی یا نہیں ہوئی۔ واقعہ کی واقعیت مایہ خلاف نہیں ہے۔ کیفیت وجہ نفاق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ دونوں فرقوں کا فرق خواہ نخواہ اتنا بڑھا دیا گیا ہے۔ انسان کی طبیعت میں قدرت نے تلاش اسباب کی زبردست خواہش رکھی ہے۔ جو منجملہ اور باتوں کے طرز آفرینش کو بھی معلوم کرنا چاہتی ہے۔ دل حتے الامکان اس کے متعلق مفصل واقفیت چاہتا ہے۔ اور جب تک تذبذب ہے۔ تب تک تردد بھی ہے۔ تفکر بھی ہے۔ تشویش بھی۔ بالخصوص زیادہ زور آفرینش انواع پر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ طبعاً پہلے آفرینش افراد کی چھان بین کرنی چاہئے تھی۔ مگر مباحثین نے اس موٹی بات کو نظرانداز کر دیا۔ نہایت عجیب بات ہے کہ ہزاروں برس پہلے کی ابتدائے انواع پر تو غور کیا جائے۔ اور روزمرہ کی پیش افتادہ ابتدائے افراد کو چھوڑ دیا جائے۔

ابتدائے افراد کے بارے میں ارتقا کا مسئلہ اتنا واضح اور ظاہر ہے کہ اس میں اعتراض کی ذرا بھی گنجائش نہیں۔ کرہ زمین کی آفرینش کے متعلق

اثبات واجب الوجود

یہ کتاب بھی مفتی محمد انوار الحق صاحب کی ہی ترتیب دی ہوئی ہے اس میں بہت سے مضامین انگریزی کتابوں سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ہستی باری تعالےٰ کے مسئلے پر محض عقلی پہلو سے بحث کی گئی ہے۔ اور صرف عام فہم عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے۔ کہ نظام کائنات میں ایک ذیعقل حاکم علے الاطلاق کا وجود ضروری ہے۔ اور انسان جب تک اپنے آپ کو حیوان لایعقل نہ فرض کرے۔ تب تک اُسے خدا کے ماننے سے مفر نہیں۔ ظاہر ہے کہ ہستی واجب الوجود کا مسئلہ تمام مذاہب عالم کا اصل اصول اور تمام نیکیوں کی بنا ہے اور آج کل جبکہ سائنس کی ترقی لوگوں کو الحاد اور مادہ پرستی کی جانب لئے جارہی ہے۔ اس قسم کی کتابوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے جادۂ عقل و قیاس سے ایک قدم بھی تجاوز نہیں کیا۔ اور عقلی مسائل کے سوا اور کسی دلیل کو قابل تسلیم نہیں مانا۔ لیکن پھر بھی اس نے دکھایا ہے کہ عقل سلیم خواہ نخواہ انسان کو توحید کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کتاب عام دلچسپی کے سوا اہلِ اسلام کے لئے خاص طور پر قابلِ قدر ہے۔ چھپائی کی بابت صرف اس قدر کہ دینا کافی ہے کہ ہندوستان کے عمدہ ترین پریس مفید عام آگرہ میں چھپی ہے۔ اور ۲۲×۱۸ نہایت عمدہ ولایتی کاغذ ہے۔ یہ کتاب جناب مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے۔ انڈر چیف سکرٹری تاج محل بھوپال یا المشتہر سے بقیمت عمدہ مل سکتی ہے۔ تاجران کتب اور بہت سی کتابوں کے خریدنے والوں سے خاص رعایت کی جاویگی جو خط و کتابت سے فیصلہ ہو سکتی ہے

المشتہر

مفتی محمد ابرار الحق۔ تاج محل۔ بھوپال۔

Marfat.com

حیات کے اس ... ان دونوں انتہائی باتوں کے وسط
میں آغاز انواع اور پیدائش انسان کا سوال ہے۔ علماے سائنس کے نزدیک
ارتقا کا مسئلہ اس کے حل کرنے کے لئے بھی کافی وشافی ہے۔ لیکن اگر
موجودہ علم انسانی کی رو سے ہم اس مسئلے کو آثار حیات کے تمام اختلاف و انقلاب
کا مفسّر اور مشرّح تسلیم نہ بھی کریں تو ساتھ ہی اس مسئلے کو غلط ٹھہرانا۔ یا
ابتدائے افراد و انواع کو اس کے سوا کسی اور اصول کے مطابق قرار دینا بھی
ممکن نہیں ہے۔ انسانی طبیعت خود ہی آہستہ آہستہ صداقت کو تسلیم
کرتی جاتی ہے۔ اور راستی کی مخالفت خود ہی رفتہ رفتہ مٹتی جاتی ہے۔ ہم نے
مذکورۂ بالا مضمون میں دونوں فریقوں کی رائیں اور ان کے فرق واضح کر دئے
ہیں۔ ہم نہ تقلید اور قدامت پرستی کے ملزم ہو سکتے ہیں۔ نہ الحاد اور مادہ پرستی
کے مجرم ٹھہر سکتے ہیں۔ جو کچھ لکھا ہے صدق نیّت اور جوش صداقت سے لکھا ہے
واجب الوجود کی خلّاقی طاقت اور صناعی قدرت سے کون انکار کر سکتا ہے۔
ذرّہ سے آفتاب تک اور ماہ سے ماہی تک اس کے نور کا ظہور ہے۔ لیکن
ساتھ ہی ارتقا کے مسئلے کی بھی تردید نہیں ہو سکتی۔ جو اسی خالق حقیقی اور
صانع واقعی کی شان ہر انسان اور حیوان میں دکھاتا ہے۔ اور اس مالک الملک
کے نہایت باترتیب آئین اور نہایت باضابطہ قوانین انسان ضعیف البنیان
کو سمجھا بتلاتا ہے۔ سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّھَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ
وَمِنْ اَنْفُسِھِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ +

تمام شد

Marfat.com